ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد نمبر ۳۱ — شمارہ نمبر ۱

جولائی سنہ ۱۹۵۳ء مطابق ذیقعدہ سنہ ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ایک ننگِ اسلام رواج

اسلامی شریعت کی رو سے نکاح میں تھوڑا بہت مہر عورت کے لئے اس قدر ضروری ہے کہ اگر ایجاب وقبول کے وقت اس کا ذکر نہ کیا جائے تب بھی مہر مثل کو معیار بنا کر مرد کو مہر ادا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بالمقابل مرد کو عورت کی طرف سے کوئی رقم کسی نام سے بھی ادا کرنی نہیں پڑتی۔ اسلام کا یہ دستور ایسا عام اور ہمہ گیر ہے کہ اسلامی دنیا میں ہر جگہ اور ہر ملک میں اس پر عمل ہوتا ہے اور کہیں اس کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔

مسلمانوں میں ہندوؤں کی دیکھا دیکھی بہت سی ناپسندیدہ اور اسلام شکن خصوصاً شادی بیاہ سے متعلق جو رسومات پیدا ہو گئی تھیں علمائے کرام کی کوششوں سے ان کی بہت کافی اصلاح ہو چکی ہے لیکن نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ پورے ہندوستان اور پاکستان میں غالباً صوبۂ بہار اور کچھ کچھ بنگال اب بھی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کے مسلمانوں میں عام طور پر یہ رواج ہے کہ جب کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو لڑکا خود یا اس کے سرپرست لڑکی والوں سے ٹھوک بجا کر معاملہ طے کرتے ہیں کہ وہ لڑکے کو کیا دیں گے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ازدواجی رشتہ کے بازار میں باقاعدہ طور پر لڑکے کا نیلام ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں اس کی عمر، صحت وجوانی، تعلیم اور اس کی آمدنی کے حساب سے اس کی قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ آخرکار جس کی مقرر کی ہوئی قیمت سب سے زیادہ ہوتی ہے لڑکے کا اس کی لڑکی سے نکاح کر دیا جاتا ہے پھر ستم یہ ہے کہ لڑکی کا مہر تو معجل بھی ہو سکتا ہے اور موجل بھی اور معجل کی صورت میں بھی بہت کم مثالیں ہوں گی جب کہ لڑکی نے کسی ناچاقی

یا نا اتفاقی نہ ہونے کی صورت میں شوہر سے مہر کا مطالبہ کیا ہو۔ لیکن یہاں آج نقد کل ادھار والا معاملہ ہے۔ ایجاب و قبول ہی اس وقت تک نہیں ہو گا جب تک کہ لڑکا مقررکی ہوئی رقم لے نہیں لے گا اور اسے اپنے قبضہ میں نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہاں کلکتہ میں ایک مرتبہ نہیں متعدد بار یہ دیکھنے کا موقعہ ملا ہے کہ قاضی نکاح پڑھنا چاہتا ہے۔ لیکن اسے روک دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پندرہ بیس ہزار کی موعودہ رقم کا چک جب لڑکے یا اس کے والد یا چچا کی جیب میں پہنچ جاتا ہے تو اب قاضی کو نکاح خوانی کی اجازت دی جاتی ہے۔ راقم الحروف نے جب سب سے پہلے ایسا واقعہ دیکھا جو ایک متمول اور اونچے درجہ کے تعلیم یافتہ گھرانے میں پیش آیا تھا تو شرم اور ندامت سے گردن جھک گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہی بے حد منغض ہو کر گھر چلا آیا بعد میں دوستوں سے اس کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی انفرادی واقعہ نہیں ہے بلکہ بہار میں عام رواج اسی کا ہے۔

اب ذرا غور کیجئے! یہ رواج کس قدر اسلام کے لئے ننگ و عار کا باعث ہے اسلام نے عورت کو اس کے دیرینہ قعر مذلت و بے کسی سے نکال کر معاشرتی اعتبار سے اس کا جو مرتبہ بلند کیا تھا اور اس کے لئے جو حقوق مقرر کئے ہوئے تھے جن کے باعث وہ مردوں کی جیرہ دستی کی شکار نہ ہو انھیں میں سے ایک حق مہر بھی تھا۔ لیکن نہایت حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ صوبہ بہار جیسے علاقہ میں جہاں بڑے بڑے مشائخ و صوفیا پیدا ہوئے۔ جہاں نامور خانقاہیں اور مدارس اسلامیہ۔ امارت شرعیہ۔ اور جمعیۃ علماء اب بھی قایم ہیں وہاں کے مسلمان ایک ایسی جاہلانہ اور قطعاً غیر اسلامی رسم کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور انھیں اس کا ذرا احساس نہیں کہ اس ایک مشرکانہ رسم کی وجہ سے اسلامی سماج میں کس قدر عظیم اور ہولناک مفسدہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس رواج کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جہاں کوئی لڑکا تعلیم یافتہ ہوا اور اس نے آمدنی کا معقول

ذریعہ بھی کوئی پیدا کر لیا بس وہ سمجھتا ہے کہ اب مارکیٹ میں اس کی قیمت دس پندرہ ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ اور چونکہ مقصد صرف روپیہ ہوتا ہے اس لئے اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے یا نہیں۔ خاندانی اعتبار سے اس کے ہم مرتبہ ہے یا نہیں۔ اور مذاق طبعی اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے اس میں وہ تمام باتیں ہیں یا نہیں جو اس کے زناشوئی تعلق کی خوشگواری کا باعث ہوسکیں وہ ان باتوں میں سے کسی کا خیال نہیں کرتا بس اس کو من مانی رقم ملی اور اس نے ہاں کر لی۔ اس کے بعد جب روپیہ اس کے قبضہ میں آجاتا ہے تو چونکہ رشتہ اکل بے جوڑ تھا اس بناء پر بیوی غریب "فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ" ہو کر رہتی ہے اور شوہر اسی بیوی کے باپ کے روپیہ سے یا عیاشی شروع کر دیتا ہے اور یا حسب منشا کوئی اور شادی کر لیتا ہے۔ یہ تو تصویر کا ایک رخ ہوا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک شخص شریف ہے۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس کی بیٹی سلیقہ مند بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ حسین وجمیل بھی ہے اور نیک فطرت بھی لیکن چونکہ بدقسمتی سے اس کے پاس داماد کو دینے کے لئے معقول رقم نہیں ہے اس بنا پر وہ اپنی جوان لڑکی کے لئے کہیں باہر تو کیا خود اپنے خاندان میں بھی کوئی تعلیم یافتہ اور کماؤ بر نہیں پاتا۔ اس طرح کی مثالیں ایک دو نہیں ہزاروں ملیں گی اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ کسی متوسط درجہ کے گھرانہ میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کا باپ "ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ" کا مصداق بن جاتا اور ابھی سے تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے، نہ جانے کتنے ہزاروں لاکھوں مسلمان گھرانے ہوں گے جو اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ لیکن چونکہ وہ پبلک میں احتجاج نہیں کرتے اخبارات میں اپنی بپتا نہیں چھاپتے، شرم اور غیرت کے مارے کسی کے سامنے اپنے دکھ اور درد دل کا اظہار نہیں کرتے اس لئے کسی کو بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں ہے اور جس شیطانی رواج نے ہزاروں خاندانوں کو تباہ وبرباد کر ڈالا ہے اس کے انسداد واستیصال کی کسی جماعت یا کسی مصلح قوم کو کوئی فکر نہیں ہے۔ یہ رواج نہ صرف صوبہ بہار کے مسلمانوں پر بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی پیشانی پر ایک انتہائی شرمناک داغ اور حد درجہ بدنما کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے باقاعدہ اور نہایت منظم جدوجہد کی جائے اور جو ہزاروں مسلمان خاندان اس کا شکار بنے ہوئے ہیں ان کی رستگاری کا بندوبست فوری طور پر کیا جائے۔

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی)

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالق عالم جو اپنے حیرت انگیز تخلیقی آثار کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہوا ہے، اس کے متعلق یہی دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، کہ وہ ہمارے سامنے نہیں ہے، میں تو کہتا ہوں کہ آثار سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو دنیا کی شاید ہی کسی چیز کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہے حتیٰ کہ باہم انسانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم جو ملتے جلتے ہیں کہتے ہیں کہ آج میری ملاقات اپنے فلاں دوست سے ہوئی، اگر سوچا جائے تو دوست کی ذات جس سے ملاقات کی مسرت آپ کو حاصل ہوئی وہ کبھی آپ کے سامنے نہیں آتی، بلکہ اس کا جسمانی قالب اور بدن آپ کے سامنے ہوتا ہے، اور قالب و بدن بھی صحیح معنوں میں آپ کی دید کے دائرہ میں داخل نہیں ہو سکتا کون نہیں جانتا کہ بینائی کی قوت صرف روشنی، اور رنگوں ہی کی حد تک ایک ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہوا اسی لئے تو نظر نہیں آتی کہ کسی رنگ سے رنگین نہیں ہے، بس آپ کا دوست، دوست کا بدن اور جسمانی ڈھانچا کبھی آپ کے سامنے نہیں آتا، بلکہ جو رنگ آپ کے دوست کے چہرے پر چڑھا ہوا ہے واقع میں آپ صرف اس کو دیکھتے ہیں، بایں ہمہ آپ یقین کرتے ہیں کہ آپ کا دوست ہی آپ کے سامنے آیا۔

پھر کائنات کا یہ سارا نظام خالق کائنات کی تخلیقی کارفرمائیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جب وہ آپ کے سامنے ہے تو یہ کہنا کہ کائنات کا خالق ہمارے سامنے چونکہ نہیں ہے،

اس لئے کسی دیکھی ہوئی کسی چیز کو اپنے سامنے رکھ لیا جاتا ہے، بتایا جائے کہ آخر اس کا مطلب ہی کیا ہوا؟

اور مان بھی لیا جائے کہ آثار کو ناکافی قرار دے کر خالق کائنات کی ذات ہی کے دھیان وگیان کا ذریعہ ان مورتیوں اور بتوں کو ٹھہرایا جائے، تو پتھروں یا لکڑیوں سے تراشی ہوئی مورتیوں اور بتوں کو خدا کی ذات تک منتقل ہونے کا ذریعہ آخر کس بنیاد پر ان مورتیوں اور بتوں کو سمجھا جاتا ہے۔ کیا ان کی شکل وصورت سے خالق کی ذات کی طرف ذہن کے منتقل کرنے کا کام لیا جاتا ہے، تو سوال یہی ہے کہ خدا کیا کوئی صورت رکھتا ہے پھر اس کی صورت کسی مرد یا عورت یا جانور کی صورت ہوتی ہے کیونکہ ان مورتیوں اور بتوں میں کھودنے والے اسی قسم کی شباہتیں تو کھود کھود کر قایم کیا کرتے ہیں اور اپنی صورتوں کے لحاظ سے یہ مورتیاں خدا کی نمائندگی اگر نہیں کرتیں، بلکہ ان کو رکھنے والے اپنے سامنے یہ سوچ کر رکھ لیتے ہیں کہ خدا کی یہ مخلوق ہیں، تو اس نقطۂ نظر سے کسی خاص مورتی یا مخصوص بت کو سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مخلوق ہونے کے لحاظ سے سوچئے تو سارا عالم ہی خدا کی مخلوق ہے عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنے تخلیقی آثار کے ساتھ تو خدا ایک لمحہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا، امام الموحدین حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی لئے تو فرمایا تھا کہ

انی لا احب الآفلین — میں اوجھل ہونے والے معبود کو نہیں چاہتا

آخر ہمارے سامنے کچھ نہ ہو اپنی ذات اور ذات کا شعور تو بہر حال ہمارے ساتھ تو باقی ہی رہتا ہے۔ ایک ایک عضو کٹ کٹ کر آدمی سے الگ ہو جائے، لیکن ذات اور ذات کا شعور اس حال میں بھی ہم سے الگ نہیں ہوتا یہ الگ بات ہے کہ کسی وجہ سے شعور ہی کا چراغ بجھ جائے لیکن جب تک یہ چراغ جل رہا ہے اس وقت تک خدا کے اس تخلیقی اثر یعنی اپنی ذات کے شعور کو بہر حال اپنے اندر ہم پاتے رہیں گے، بس خالق کے تخلیقی آثار ہی سے خالق کو اپنے سامنے اگر لانا ہے، تو اس کے لئے پتھروں، اور لکڑیوں میں کھودی ہوئی مورتیوں

ہی کی سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے سچ تو یہ ہے کہ ان مورتیوں کو دیکھ کر بجائے خالق کائنات کے آدمی کا ذہن اگران سنگ تراشوں ہی میں الجھ کر رہ جائے، جوان مورتیوں اور بتوں کو گھڑتے ہیں تو اسی کی توقع بھی طبعاً کرنی چاہئے، بلکہ بنانے والے اگران پر اپنے صنعتی عمل کو نمایاں نہ کرتے اور بن گھڑی سپاٹ شکلوں ہی میں پتھروں اور لکڑیوں کو رہنے دیتے، تو خالق کی طرف ذہن کے منتقل ہونے میں شاید زیادہ آسانی ہوتی، مگر اس ذہنی انتقال کے لئے کسی خاص پتھر یا لکڑی کے کسی خاص ٹکڑے کی کیا خصوصیت ہے۔ جیسے بعض قدرتی مظاہر مثلاً سورج، چاند یا خاص خاص نباتی یا حیوانی مخلوقات کو پوجنے والے آخر کیا عذر پیش کر سکتے ہیں خالق ہی کے شعور کو اس کے ان تخلیقی آثار کی راہ سے بیدار کرنا اگر منظور ہے تو ایک سانڈ اور ایک چیونٹی میں کیا فرق ہے حق تو یہ ہے کہ کاریگری کی جن نزاکتوں کا تماشا چیونٹی میں کیا جاتا ہے اور اس کے وجود کی مختصر تقطیع میں جن کمالات اور محاسن کی نمائش قدرت کی طرف سے کی گئی ہے احساس پر جو اثر ان کے دیکھنے سے مرتب ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے ہاتھی اور سانڈ، اونٹ اور گھوڑے شاید اس اثر کو نہیں پیدا کر سکتے،

الغرض جس طرح بھی دیکھا جائے بت پرستی کی طرف سے یہ پرانی اپالوجی (معذرت) کسی حیثیت سے تسکین وتشفی کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ جو واقعہ ہے اس پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام ونامراد کوشش ہے۔ بنانے والے باتیں بنا کر دوسروں کو صرف چپ کر دینا چاہتے ہیں ورنہ حقیقت کی جو واقعی صورت ہے، وہ یہی ہے ان بت پرستوں کی عام ذہنیت تو وہی ہوتی ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے المسعودی ہی نے لکھا ہے کہ

الجاهل منهم ومن لا علم له يشرك الاصنام بالالهية الخالق ص۱۹۱	ان بت پرستوں میں جو جاہل اور ناواقف ہیں، وہ توان مورتیوں ہی کو معبود بیت اور الٰہیت میں خالق کائنات کا ساجھی اور شریک سمجھتے ہیں۔

یعنی پتھر اور لکڑی میں کھودی ہوئی صورتوں جنہیں مورتیاں اور بت کہتے ہیں، براہ راست ان ہی کو خدائی کاروبار میں شریک سمجھ کر ان سے نفع اٹھانے یا ان کے ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں، قرآن میں بھی جہاں کہیں ان ہی اصنام اور بتوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں، نہ چل سکتے ہیں، نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر تو اس سے اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ بڑا طبقہ عوام کا بت پرستوں میں یہی سمجھتا ہے کہ ان ہی گھڑے ہوئے پتھروں یا لکڑیوں میں یہ سارے کمالات پوشیدہ ہیں، جن میں بینائی نہیں ہوتی، ان میں بینائی، جن میں شنوائی نہیں ہوتی۔ ان میں فرض کر لیتے ہیں کہ بینائی بھی ہے اور شنوائی بھی، اور کیسی بینائی و شنوائی جس کے سامنے پوجنے والے کی بینائی اور شنوائی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جو کچھ کر نہیں سکتا، مان لیا جاتا ہے کہ پتھر کا وہی ٹکڑا سب کچھ کر سکتا ہے، یہ اعتقادی نفسیات تو عوام کی ہوتی ہے باقی بت پرستوں میں خواص طبقہ جو ہوتا ہے یعنی فکر و نظر سے کام لیتا ہے، ظاہر ہے کہ جس پتھر میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں ہے، اسی میں کیسے مان لیں کہ سب ہی کچھ ہے، اسی لئے وہ ذرا زیادہ طبع پردازی سے کام لیتے ہیں یعنی عوام بے چارے تو پتھر اور لکڑی کے ان ہی گڑھے ہوئے ٹکڑوں ہی میں دید و شنید دانش و ہوش کی قوتیں فرض کر لیا کرتے ہیں مگر خواص بجائے ان کے یہ مانتے ہیں کہ ان تراشیدہ پتھروں کے پیچھے اَن دیکھی روحیں دبکی ہوئی ہیں ان ہی نادیدہ ان دیکھی روحانی ہستیوں کی نمائندگی کا کام ان اصنام اور مورتیوں سے لیا جاتا ہے اور خواہ اقرار کیا جاتا ہے یا نہ کیا جائے، مگر واقعہ یہی ہے کہ ان مفروضہ ان دیکھی روحوں کو ان کے پوجنے والے یہ نہیں مانتے کہ یہی عالم کے خالق و آفریدگار ہیں۔

بلکہ یہی مانا جاتا ہے کہ یہ سارے اصنام اور مورتیاں کسی مخلوق ہی کی روح کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً اگلے زمانہ کے کسی سربرآوردہ آدمی کی روح سے سمجھا جاتا ہے کہ فلاں تشکل و صورت کی مورتی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اسی طرح مظاہر قدرت میں سے جن چیزوں کا انتخاب مختلف زمانوں اور ملکوں یا قوموں میں معبود بنانے کے لئے ہوتا رہا ہے، خود ان کو تو مخلوق سمجھا ہی

جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ بت پرستوں کے خواص کا طبقہ ان کے پیچھے کسی قسم کے ملکوتی یا روحانی وجود کو بھی پوشیدہ سمجھتا ہے اور ان کی پوجا پاٹ کے وقت بجائے بتوں کے دیدہ اجسام کے ذہن کو اسی پوشیدہ، ملکوتی یا روحانی وجود کی طرف منتقل کرتا ہے ان ہی کا دھیان جماتا ہے، مثلاً سورج کے آتشیں کرے کے سامنے سمجھا جاتا ہے کہ سورج دیوتا کی روح بھی وابستہ ہے، یا جو دریا پوجے جاتے ہیں، مانا جاتا ہے کہ ان کا تعلق کسی مذکر یا مونث ان دیکھے روحانی وجود سے ہے مگر یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے بے دیکھے بے جانے صرف فرض کرنے کی قوت ہی کا کرشمہ ہوتا ہے، کیونکہ ان روحانی اور ملکوتی ہستیوں کا تسلیم کرنا، بغیر مشاہدہ کے ایک فرضی سی بات ہوتی ہے، پھر یہ باور کر لینا کہ پتھر کے کسی خاص ٹکڑے میں خاص قسم کی نوک پلک شکل وصورت کو گھڑ دینے کے ساتھ ہی ان مفروضہ روحانی و ملکوتی ہستیوں میں سے فلاں ہستی کا ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ مورتی کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روحانی وجود کے سامنے کھڑا ہونا ہے جس کی نمائندگی مان لیا گیا ہے کہ یہ مورتی کرتی ہے

بہر حال کہنے کی حد تک تو یہ طبقہ خواص کا طبقہ کہلاتا ہے لیکن ان کے وہمی اور فرضی تخلیقات سچ پوچھئے، تو بت پرستوں کے عوام سے بھی کہیں زیادہ بڑھے ہوتے ہیں، عامی غریب کا قصہ تو صرف ایک فرض پر ختم ہو جاتا ہے، یعنی فرض کر لیتا ہے کہ نہ دیکھنے والی مورتی اسے دیکھ رہی ہے اور نہ سننے والا بت اس کی باتیں سن رہا ہے، اس سے زیادہ اپنے مفروضات کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن خواص کے طبقہ کو تو ایک فرض کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرے فرض کے ذہنی عمل پر مجبور ہونا پڑتا ہے یعنی جن روحانی اور ملکوتی ہستیوں کا مشاہدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے پہلے ان ہی کے وجود کو فرض کر لیا جاتا ہے۔ پھر فرض کیا جاتا ہے کہ ان میں ہر ایک خاص خاص قسم کی فعلی و انفعالی قوتیں اپنے اندر رکھتے ہیں، ان دو مفروضات صرف مفروضات کے بعد تیسرا مفروضہ یہ ہوتا ہے کہ پتھر یا لکڑی میں فلاں نوعیت کی شکل و صورت جب منقوش ہو جاتی ہے تو ان روحانی و ملکوتی ہستیوں میں سے فلاں دیوتا کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، الغرض عوام کا کام تو ایک ہی مفروضہ سے چل جاتا ہے لیکن خواص کو عوام کی جماعت میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے

فرض کر لینے کے اس عمل کی مختلف منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

جو واقعی بت پرستی کرتے ہیں ان ہی سے پوچھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ عرض کیا گیا، کیا اصل حقیقت اور واقعہ کی صحیح تعبیر یہی نہیں ہے؟ یہ دعوی کہ خالق کی نمائندہ قرار دے کر بتوں کی پرستش لوگ کرتے ہیں، ایک ایسا دعوی ہے جس کا واقعہ سے قطعاً کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے قوموں کے علم الاصنام کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہی جانتے ہیں کہ خالق کائنات کی نمائندگی کا کام کسی زمانہ میں کسی مورتی یا صنم یعنی بت سے کبھی نہیں لیا گیا ہے، بجائے خود یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے آخر دنیا سے بت پرستی کا کبھی انقراض نہیں ہوا ہے، پوچھا جا سکتا ہے کہ پوجے جانے والوں میں کیا کوئی ایسا بت، یا ایسی مورتی بھی ہے جو بجائے مخلوقات کے براہ راست خالق کی نمائندگی کے لئے بنائی گئی ہو۔؟ جہاں تک فقیر کی تلاش و جستجو کا تعلق ہے اس وقت تک کسی ایسے بت یا مورتی کی نشان دہی نہ ان ہی لوگوں کی جو بت پرستی کرتے ہیں اور نہ کتابوں ہی میں اب تک کسی ایسے بت کا مجھے پتہ چلا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ کائنات کے خالق و مالک پروردگار کی عبادت میں بھی بعضوں کو (العیاذ باللہ) اسی قسم کا فرض کا رنگ نظر آتا ہے حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ اپنے تخلیقی آثار کے لحاظ سے نہ کبھی وہ کسی سے اوجھل ہوا ہے، اور جب تک اس کی تخلیقی کارفرمائیوں کا یہ سلسلہ جاری ہے وہ اوجھل ہوگا، ذات اس کی ضرور نادیدہ ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا کا وجود بھی غیبی ہے لیکن عرض کر چکا ہوں، کہ ذات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مشاہدات و محسوسات کا بڑا ذخیرہ غیب ہی کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ مشاہدہ کا تعلق تو عموماً شئی کے آثار ہی سے ہوتا ہے، لیکن بت پرستی کے مفروضات کی نوعیت یہ نہیں ہے، کیونکہ نہ ذات ہی ان مفروضات کے سامنے ہوتی ہے نہ ان کے آثار ہی کو ہم دیکھ رہے ہیں، بتوں کے پوجنے والے بھی یہی مانتے ہیں کہ سارے کائناتی آثار ایک ہی وجود کے تخلیقی مظاہر ہیں۔ پھر بت پرستی کے مفروضات کو پانے والے آپ خود سوچئے، ان کے کن آثار کا سہارا لے کر ان کو پا سکتے ہیں؟ بجز اس کے کہ جہاں جس کا جی چاہے کچھ فرض کرلے، کچھ مان لے، اس کے سوا وہ بے چارے اور کر ہی کیا سکتے ہیں، بات طویل اور

کافی طویل ہوگئی لیکن طوالت کے خوف سے حقائق و واقعات کو کیسے دبایا جائے۔ غلط فہمیوں کی گتھیوں میں عزیب آدمی کی سمجھ الجھا دی گئی ہے، گرہوں پر گرہیں پڑی ہوئی ہیں، احتیاط سے ان کو اگر نہ کھولا جائے اور جو کچھ لوگ پہلے سے کہتے چلے آئے ہیں ان ہی کے دہرانے پر قناعت کی جائے تو اس سے بہتر میرے نزدیک یہی ہے کہ کچھ نہ کہا جائے کچھ نہ لکھا جائے۔ مجھے جو کہنا تھا، اپنی علمی ذمہ داریوں کے ساتھ اسے پیش کر دیا گیا۔ آئندہ سوچنے والوں کے لئے ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن راہ سامنے آئے

بہرحال روحانیت کے مقابلے میں بنی آدم کی عملی زندگی کا ایسا نظام جس میں خالق سے بے پروا ہو کر مخلوق شاہی لوگ جھک پڑتے ہیں، اپنی خاص اصطلاح میں جس مسلک کی تعبیر

"عملی مادیت"

سے میں نے کی ہے، بت پرستی بھی میرے نزدیک اسی عملی مادیت کی ایک مغالطہ آمیز یا ستائی اور پارینہ شکل ہے۔ مغالطہ آمیزی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بظاہر عملی زندگی کے اس نظام میں دعا و عبادت وغیرہ دینی عناصر جو پائے جاتے ہیں، ان ہی کو دیکھ کر سمجھ لیا جاتا ہے، کہ یہ بھی دینی زندگی ہی کی ایک خاص شکل ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ بھی ایک قسم کی عملی مادیت ہی کا ایک خاص قالب ہے۔ اسی لئے بت پرستی کا زور عموماً قوموں میں اسی زمانہ میں ہوتا ہے جب دنیا طلبی کے نشہ میں وہ سرشار ہوتی ہیں، ٹھیک جو آج حال یورپ و امریکہ کا ہے اسی قسم کا دورہ اگلی قوموں پر بھی جب پڑتا رہا تو خالق سے تعلق کو کمزور کرتے ہوئے مخلوقات ہی میں وہ ڈوب جاتی تھیں، فرق صرف وہی ہے کہ یورپ و امریکہ کی عملی مادیت کی موجودہ زندگی میں مخلوقات سے صرف عقلی رشتہ ہی کے قائم کرنے پر لوگ اب تک ٹھہرے ہوئے ہیں اور پچھلے زمانہ میں عقلی رشتہ کے ساتھ ساتھ مفید و مضر مخلوقات کے ساتھ دعائی و عبادتی رشتہ بھی قائم کر لیا جاتا تھا۔ اشور و بابل، مصر و سوریا (شام)، روم و ایران وغیرہ کی تاریخ کی شہادت یہی ہے تمدن و عمران کے عین طوفانی ایام میں بت پرستی بھی ہر درجہ کی آخری منزل تک پہنچی ہوئی تھی، لیکن ان کی بت

پرستی طبقۂ خواص کی بت پرستی تھی اسی لئے حد سے زیادہ پیچیدہ فلسفہ کی شکل اس نے ان قوموں میں اختیار کر لی تھی۔

اور دور کیوں جایئے، دنیا کے عام مذاہب و ادیان جو اپنے تاریخی وثائق کھو چکے، ان کے متعلق تو کہنے والے جو کچھ بھی چاہیں، کہہ سکتے ہیں لیکن انسانی دین کا آخری قدرتی قالب "الاسلام" تو تاریخ کے روشن دنوں میں سب کے سامنے آیا، اس کا ہر دور ماضی ہو یا حال، تاریخی ایام ہی سے گذرتا ہوا بنی آدم کی موجودہ نسلوں تک پہنچا ہے۔

اللہ اللہ کتنی خالص، ہر قسم کی الجھنوں سے پاک و صاف، شستہ و رفتہ، دھلی دھلائی ستھری توحید سے مسلمانوں کی دینی امت کا آغاز ہوا تھا، لیکن تمدن و عمران کی رنگینیوں میں غوطے کھاتے ہوئے کیا کیا بتایا جائے کہ جن سوراخوں سے دنیا کی گذشتہ مذہبی قومیں داخل ہو چکی تھیں ان میں مسلمان نہ گھسے سچ تو یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سنجتا ہوا توحیدی عقیدہ بھی مشرکانہ اوہام کی آلودگیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہی مشرکانہ آلودگیاں جن کو دیکھ دیکھ کر غریب مولوی پہلے بھی جھنجھلاتے رہے اور آج تک اس سلسلہ میں ان کی کڑکڑاہٹیں ختم نہیں ہوئی ہیں آخر تاریخ کی اس شہادت کو بھی آپ جھٹلا دیں گے۔ اور یہی کہتے چلے جائیں گے، کہ توحید کا عقیدہ مشرکانہ اوہام کے بعد پیدا ہوا ہے؟ اور میں تو حیران ہوں، یورپ کے ان ہی ارباب تحقیق و تنقید ریسرچ اور تلاش والوں کے حوالہ سے ہمیں یہ بھی تو سنایا جاتا ہے، کہ کائنات کے خالق کی یکتائی اور وحدت کا عقیدہ انسانی فطرت کا ایک ایسا لازوال سرمدی احساس ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کسی زمانہ میں خالی نہیں رہی ہے، مذاہب و ادیان کے مشہور مغربی مورخ پروفیسر میکس مولر کو تو اسی بنیاد پر اپنے اس مشہور تحقیقی فیصلہ کا اعلان کرنا پڑا کہ

"ہمارے باپ دادوں نے خدا کو اس وقت مانا اور جانا تھا"

"جب خدا کا صحیح نام بھی شاید وہ نہیں رکھ سکتے"۔

اور آج بھی دور دراز جنگلی علاقوں کی وحشی قوموں کے دینی احساسات کے جائزہ لینے والے

جہاں کہیں بھی پہنچے ہیں خود ان ہی کا بیان ہے، کہ کسی نہ کسی شکل میں یہ عقیدہ یعنی کائنات اور اس میں جو کچھ ہے، بالآخر اس کی انتہا ایک ہی ذات واحد پر ہوتی ہے، ہر جگہ ہر قوم میں مشترک نظر آیا ایسی صورت میں خود سوچئے کہ ہمیشہ سے جس بات کو لوگ مانتے چلے آئے ہیں، اسی کے متعلق یہ باور کرانے کا کھلا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ شرک میں مبتلا ہونے کے بعد اسی حقیقت کو لوگوں نے تسلیم کیا تھا۔

بس واقعہ یہی ہے، پہلے بھی اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ کائنات کے خالق و آفریدگار کی وحدت ویکتائی کا انکار صحیح معنوں میں پہلے بھی کبھی نہیں کیا گیا اور آج بھی اکثریت دہریت سے یہی اطلاع مل رہی ہے کہ اس حقیقت کے یقین کا چراغ ان کے سینوں میں نہیں بجھا ہے لیکن باوجود اس کے پہلے بھی یہی ہوتا رہا اور آج بھی جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، کہنے والے اسے دیکھ دیکھ کر خواہ کچھ ہی کہتے ہوں مگر واقعہ یہی ہے کہ خالق جس کا سب کچھ ہے اور سب کچھ اسی کا نہ ہو تو سب کا خالق ہی وہ کیسے مانا جا سکتا ہے بہر حال وہی خالق جس کا سب کچھ ہے، تاریخ کے مختلف دوروں میں اچانک اسی کے متعلق باور کرنے والے کچھ ایسی باتیں باور کرنے لگے جن کا مآل یہی تھا کہ گویا اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ ان ہی مخلوقات کے اختیار میں ہے جن کے پاس خالق کی بخشی ہوئی بھیک کے سوا نہ کچھ ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اسی احساس بے بنیاد، قطعاً بے بنیاد، بے سروپا احساس کا نتیجہ پہلے بھی یہی ہوا اور آج بھی یہی ہے، کہ ماننے والوں نے

لہ عیسائیوں اور قدیم ہند کی تالوثیت یعنی ایک تین ہے اور تین ایک ہے جس کی تعبیر ہندوستان میں تو برہما، وشنو، شیو وغیرہ کے الفاظ سے کی گئی تھی اور باپ بیٹا روح القدس سے عیسائی تالوثیت کی تعبیر تھی، اسی طرح ایران کی ثنویت یعنی ایک دو ہے دو ایک ہے، یزداں واہرمن یا نور وظلمت لفظی گورکھ دھندوں سے جو عقیدہ ذہن نشین کیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بھی ہو، فالتو عقل کے ایام بے شغلی کا ایک لااصل مشغلہ کے سوا ان کی نہ کوئی قدر ہے نہ قیمت اور بات بالآخر وہی ثابت ہوئی کہ ایک ہی سرچشمہ سے سب کچھ نکلا ہے اسی سیدھی سادی بات کو الجھا کر بیان کرنے والوں نے الجھا دیا ان لا یعنی موشگافیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیوں میں لوگ مبتلا ہوئے ۱۲ مثلاً خالق قیوم اور فنا کرنے والے خالق کے ان تین صفات کو جیسا کہا جاتا ہے ہندوستان میں برہما، وشنو، شیو کے الفاظ سے سمجھایا جاتا تھا لیکن سمجھنے والوں نے کیا سمجھا اب سے میں کیا بتاؤں خیال ہے یہی مذکورہ بیان یہی مخلص تالوثیت کا ہے ۱۲

اپنی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کی آماجگاہ، ان ہی مخلوقاتی مظاہر کو بنا لیا جن کے ذریعہ سے خالق لوگوں کو نفع بھی پہنچا رہا ہے، اور ان ہی کی راہ سے ان حوادث کی لہریں بھی اٹھتی رہتی ہیں جن سے آدمی اذیت اور تکلیف محسوس کرتا ہے، الغرض خالق کی کارفرمائیوں میں قدرت کے جن مظاہر کی حیثیت صرف وسائل اور ذرائع کی ہے، خالق سے بے گانہ ہو کر لوگ ان ہی پر ٹوٹ پڑے

یقین کیجئے کہ شرک کی قدیم فرسودہ و پارینہ ذہنیت، جس کا دور دورہ، اصنامی نظام کے عہد میں تھا، اس میں تو خیر جیسا کہ کہہ چکا ہوں۔ یہی ہوتا تھا، لیکن مادیت کا جو طوفان آج یورپ و امریکہ سے سینہ تانے ہوئے انسانی بستیوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے سمجھنے والے خواہ اسے کچھ بھی سمجھتے ہوں، اور جن دھوکوں میں خود بھی الجھے ہوئے ہوں، یا دوسروں کو الجھانا چاہتے ہوں، مگر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے وہ اگر سوچیں گے، تو پائیں گے، کہ عملاً اس جدید مادی ذہنیت کے زیر اثر بھی وہی کچھ کیا جا رہا ہے جو کچھ پہلے کیا جا چکا ہے، قالب بدلے ہوئے ضرور ہیں لیکن روح قدیم مخلوق پرستی اور جدید مادہ پرستی کی ایک اور صرف ایک ہی ہے ہمارے ملک کے مشہور بوڑھے مفکر اور مدبر راجہ گوپال اچاریہ کی زبان سے کچھ دن ہوئے بے ساختہ یہ فقرہ جو نکل پڑا تھا کہ

"اس زمانہ کا خدا تو آٹم بم ہے"

سچ پوچھئے، تو اسی "مشترک روح" کی طرف یہ اسی قسم کا ایک تاریخی اشارہ ہے، جیسے ان سے کچھ دن پہلے، ہمارے قومی شاعر لسان العصر اکبر مرحوم نے بھی اپنے مخصوص مزاحی انداز میں یہ پیش کی تھی۔ ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو ۔ بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

"آٹم بم خدا ہے" یا برق اور بھاپ کو یورپ والوں نے خدا سمجھ رکھا ہے، ظاہر ہے کہ اس خدائی کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ کائنات کا خالق اور سرچشمہ قدرتی قوانین کے ان مظاہر کو مان لیا گیا ہے۔

بلکہ مطلب وہی ہے کہ دنیا کی قدیم فرسودہ مشرک قوموں میں جیسے یہ فرض کرلیا جاتا تھا، کہ پیدا ہونے یعنی نیست سے ہست ہونے کے بعد نظم کائنات کا تعمیری ہو یا تخریبی اقتدار ان ہی مخلوقات کی طرف منتقل ہوگیا ہے جن کی اہمیت کا احساس زندگی کی ضرورتوں میں وقتاً فوقتاً خاص اسباب و وجوہ کے تحت ان میں شدت پذیر ہوتا رہتا تھا دیکھا جاتا تھا کہ گانے والے ان میں کبھی سورج دیوتا کا بھجن گا رہے ہیں۔ اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناچ رہے ہیں، تھرک رہے ہیں۔ کبھی کتھا سجا رنے والے چندرما کی کتھا سنا کر دلوں میں اسی کی عظمت و جلال کا سکہ جما رہے ہیں۔ کبھی اگنی کی استستت کے نشہ میں لوگ سرشار ہیں۔ سمجھا جا رہا ہے کہ سب کچھ وہی ہے[1]، یوں ہی مرکزیت کا یہ مقام مختلف مخلوقات کو حاصل ہوتا رہتا تھا، ان قوموں کو مشرک کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ اس طریقہ سے مخلوقات کو بھی عالم کے کاروبار میں خالق کا ساجھی اور شریک فرض کر کرکے وہی رشتہ ان مخلوقات کے ساتھ قائم کر لیتے تھے جس کا قدرتی استحقاق کائنات کے خالق اور پیدا کرنے والے کے سوا نہیں وہی جس کا سب کچھ ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کو ہے اور نہ کسی کو کبھی ہو سکتا ہے اور جو حال ان پرانی قوموں کی اس پارینہ و کہنہ مشرکانہ ذہنیت کا تھا۔ قریب قریب یہی رنگ، عصرِ حاضر کی جدید مادی تہذیب کے زیرِ اثر زندگی گذارنے والوں کی ذہنیت بھی نظر آتی ہے یعنی قدرتی قوانین کے ایسے مظاہر جن کے بعض پوشیدہ اسرار اور مخفی نوامیس سے اس زمانہ میں وقتاً فوقتاً پردہ ہٹتا چلا جا رہا ہے، اور تعمیری مقاصد ہوں یا تخریبی ہوسناکیاں، دونوں ہی کی تکمیل میں ان سے امداد مل رہی ہے ان ہی سے افادہ و استفادہ کی راہوں میں ماننے والے یہ ماننے لگے ہیں کہ خالق کائنات کو درمیان میں آنے یا لانے کی ضرورت نہیں سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن باور یہی کر لیا گیا ہے کہ جن مخلوقات میں اپنا کچھ نہیں ہوتا براہ راست ان ہی سے رشتہ قایم کر کے سب کچھ

---

[1] قدیم علم الاصنام کے مطالعہ سے عجیب دلچسپ آگاہیاں حاصل ہوتی ہیں۔ سورج دیوتا سے عموماً ان مشرک قوموں میں غیر معمولی برتری حاصل رہی ہے لیکن بابل کے بت پرستوں میں باور کرانے والوں نے یہ باور کرا رکھا تھا جیسا کہ کلیمکی صاحب نے لکھا ہے کہ چاند کے مقابلہ میں سورج کا درجہ گرا ہوا ہے چاند کو بابل والے مذکر دیوتا سمجھتے تھے اور سورج دیبی یعنی مادہ ٹھہرایا جاتا تھا کبھی سورج کو چاند کا بیٹا بھی کہتے تھے ص ۵۲ مینول ہسٹری آف بیبل ترجمہ

حاصل کیا جا سکتا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے خود آفریدہ احساس کہیے یا وہم، اسی کا نتیجہ ہے
کہ خالق کی طرف سے موجودہ مادی تہذیب میں بے اعتنائیاں حد سے گذری چلی جا رہی ہیں، اس راہ میں
ان کی لاپروائیاں ناقابلِ برداشت بن چکی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ خالق کی طرف سے یورپ کی جدید مادی تہذیب
میں اعتقاداً نہ سہی مگر عملاً اس حد کو پہنچ گئی ہیں کہ خالق کے انکار کا شبہ اس پر بے جا نہیں قرار دیا جا سکتا
اور ٹھیک جیسے قدیم مشرک قوموں کے التفات و توجہ کے مرکز ان ہی مخلوقات کے سلسلہ میں بدلتے رہتے
تھے، جن سے وقتاً فوقتاً وہ وابستہ ہوتی رہتی تھیں کچھ اسی رنگ میں مادیت کی تہذیب جدید میں بھی
دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے محور بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بدلتے سدلتے رہتے ہیں قدرتی قوانین کا ہر نیا
راز جس کی روشنی میں تعمیر یا تخریب کی نئی قوت سامنے آتی ہے وہی لوگوں کو اپنے اوپر سمیٹ
لیتی ہے اور اکٹھے ہونے والے اسی کے ارد گرد دھونی رما کر بیٹھ جاتے ہیں پھر جن انکشافات کا
ڈھنڈورا اس سے پہلے پیٹا جاتا تھا، آسمان اور زمین کو ان کے چرچوں سے بھر دیا گیا تھا، کثرت
استعمال و مشاہدہ ان کو عام برتی جانے والی پیش پا افتادہ چیزوں کے انبار میں شریک کرتا چلا جاتا ہے
اکبر مرحوم کے زمانہ میں برق اور بھاپ کو ہر دل عزیزی کا یہ مقام حاصل تھا، اور یہی اہمیت آج
"ایٹم بم" اور ایٹم کی ان توانائیوں کو دی جا رہی ہے، جن کے ساتھ امید و بیم رغبت و رہبت
کا وہی رشتہ قائم کر لیا گیا ہے، جس کا حق دار ایٹمی توانائیوں، اور ان کے سوا جو کچھ ہے، سب
ہی کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے اور یہی مطلب ان چیزوں کے خدا بنا لینے کا ہے اس میں شک
نہیں کہ یورپ و امریکہ کی جدید مادی تہذیب کے ان ہی رجحانات کو دیکھ کر بعضوں نے کہہ دیا
کہ یہ ایک خدا بیزار تہذیب ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کے عام باشندے
کلیتہً خدا کے منکر ہو چکے ہیں، بلکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا
ہے کہ وہ بھی اس قسم کی مشرکانہ ذہنیت کے شکار ہیں، جس کا شکار ہونے والا بے سر و پا ایسے پریشان
خواب دیکھنے لگتا ہے کہ سب کچھ جس کا پیدا کیا ہوا ہے عملاً وہی کچھ نہیں ہے اور جن مخلوقات میں خود
اپنا کچھ نہیں ہوتا، وہی سب کچھ بنا ہوا ہے۔

بہر حال بجز چند استثنائی گنی چنی ہستیوں کے جن کی تھوڑی بہت تعداد تقریباً ہر ملک اور ہر زمانہ میں کسی نہ کسی رنگ میں پائی گئی ہے، یورپ و امریکہ کے عام باشندوں کی موجودہ مادی ذہنیت میرے نزدیک قدیم مشرکانہ ذہنیت ہی کا ایک نیا بھیس ہے گویا شرک کا وہی پرانا آسیب ہے جو طریقہ بدل کر پھر آدم کی اولاد پر سوار ہو گیا ہے۔ اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

شرک کا پرانا بھوت جس نے تاریخ کے گذرے ہوئے دنوں میں انسانی آبادیوں کے اندر اودھم مچا رکھی تھی اس کے ذکر سے تو خیر قرآن بھرا ہی ہوا ہے، لیکن بعض اشارے قرآن ہی میں ایسے بھی کئے گئے ہیں جن سے شرک کے اس جدید اطلاق کی تصحیح ہوتی ہے[1]،

---

[1] سورۃ کہف میں دو[2] باغوں والے اور اس کے صاحب کا تمثیلی قصہ جو بیان کیا گیا ہے، اس قصہ کو غور سے پڑھئے، باغ والا اسی مالی خولیا میں مبتلا تھا کہ قدرتی قوانین کو اپنے قابو میں لا کر اپنے باغوں اور کھیتوں میں جو غیر معمولی استحکام میں نے پیدا کر دیا ہے اس نظم کو کوئی طاقت اب پراگندہ نہیں کر سکتی مگر جب اس کا سارا نظم و اہتمام اور سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ گیا تو پچھتاتے ہوئے قرآن میں ہے منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی کہتا تھا کہ کاش! اپنے رب کے ساتھ کسی میں شریک اور ساجھی نہ بناتا۔ غور طلب مسئلہ یہی ہے کہ قدیم مشرکانہ ذہنیت کے زیر اثر جو کچھ کیا جاتا تھا اس کا ذکر اس قصہ میں کہیں نہیں کیا گیا ہے لیکن یورپ کی جدید مادی ذہنیت کے سارے خصوصیات اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہے ہیں اور یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قصہ میں "شرک" کے لفظ سے اشارہ اسی ذہنیت کی طرف کیا گیا ہے، سورۂ کہف کی تذکیری تفسیر میں اس مسئلہ کی تفصیل کی گئی ہے جو افسوس ہے کتابی شکل میں پریس سے اس وقت تک باہر نہیں آسکی اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کتاب کب شائع ہوگی ۱۲

حکیم سنائی

مترجم

جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر
(ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

غزلیات | اگرچہ غزل نے اس وقت شاعری میں کوئی مستقل جگہ حاصل نہیں کی تھی اور شاعری کا تمام سرمایہ قصیدہ اور مثنوی تک محدود تھا لیکن اس کے باوجود حکیم سنائی کے کلام میں لطیف غزلیات موجود ہیں۔ حکیم صاحب کے دل آویز قطعات کو غزلیات میں محسوب کیا جاتا ہے۔ اور ان کی خمریات میں ایک خاص کیف پایا جاتا ہے فرماتے ہیں۔

اے یار بے تکلف مارا نبیذ باید — ایں قفل رنج مارا امشب کلید باید
جامے بہائے جانے بستاں ز دستِ دلبر — آمد مراد حاصل اکنوں مرید باید
اے ساقی سمن بر در وہ تو بادہ تر — زیرا صبوح مارا اہل من مزید باید

عشق ورزی کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

دل بہ عشق است زندہ در تن مرد — مردہ باشد دے کہ عاشق نیست
اندر دلِ من عشق تو چوں نورِ یقین است — بر دیدہ من نام تو چوں نقشِ نگیں است
چوں درد عاشقی بہ جہاں ہیچ درد نیست — تا درد عاشقی نہ چشد مرد مرد نیست
جاناں بجز از عشق تو دیگر ہوسم نیست — سوگند خورم من کہ بہ غیر از تو کسم نیست

معشوق کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

چاک زد دلبرِ من دستِ صبا دامن گل — خیز تا ہر دو خرامیم بہ سیر اہنِ گل

تیرہ شد ابر چو زلفین تو بر چہرۂ چرخ — تا بیار است چو روئے تو رخِ روشن گل
ہمہ شب فاختہ تا روز ہمی گرید زار — زغم گل چو من از عشق تو اے خرمن گل

غزلیاتِ عارفانہ میں فرماتے ہیں

بے گانہ بود میان ما جاں — بے گانہ درمیاں نخواہم

رباعیات | حکیم سنائی کے مطبوعہ دیوان میں ۱۷۰ رباعیات مندرج ہیں۔ حکیم صاحب کے دوسرے اشعار کی مانند ان رباعیات میں مسائلِ توحید و معرفت دل نشیں اور مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

عشق کے متعلق فرماتے ہیں

برہانِ محبت نفسِ سردِ من است — عنوانِ نیاز چہرۂ زردِ من است
میدانِ وفا دل جوانمردِ من است — درمانِ دل سوختگاں دردِ من است

نیکوکاری کے متعلق فرماتے ہیں

غم خوردنِ این جہانِ فانی ہوس است — از ہستی ما بہ نیستی یک نفس است
نیکوی کن اگر ترا دست رس است — کایں عالم یادگار بسیار کس است

حسنِ سلوک کی ترغیب میں فرماتے ہیں

با ہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں — بیشتر گمرہ و کم تر برہند
تو چناں زی کہ بمیری برہی — نہ چناں زی کہ بمیری برہند

صحبتِ بد سے پرہیز کی نصیحت کرتے ہیں

منشیں با بداں کہ صحبتِ بد — گرچہ پاکی ترا پلید کند
آفتاب ارچہ روشن است و لے — پارۂ ابر ناپدید کند

راستبازی کی تعریف کرتے ہیں۔

راستاں رستہ اند روزِ شمار — جہد کن تا ازاں شمار شوی
اندریں رستہ راستکاری کن — تا دراں رستہ رستگار شوی

حکیم سنائی نے اخلاقی اشعار کو امثال معروف سے مؤثر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر کہ نیش عقرب طبیعی امر ہے فرماتے ہیں۔

گفت منیشم نہ از پے کین است   مقتضائے طبیعتش این است

خوئے بد زائل نہیں ہوتی۔

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست   نرود جز بوقت مرگ از دست

بیل کے قصور کی سزا اس کے مالک کو دی جاتی ہے

ہر گناہے کہ می کند گاواں   بر رتنبان او بود تاواں

باغ بالا و آسیا بہ پایاں

باغ بالا و آسیا بہ نشیب   داشتے بر یکے بروں ز حسیب

کلام منثور۔ حکیم سنائی کے منثور کلام کے جو جملے ہماری نظر سے گذرے ہیں ان کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے

(۱) حدیقہ کا دیباچہ۔ عبداللطیف عباسی نے لکھا ہے کہ میں نے اس نسخہ کو متعدد نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد لکھا ہے اور اس کی تائید کے لئے سوانح حیات زندگی کے سلسلہ میں فاضل معاصر سعید نفیسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے اس دیباچہ کے ایک نسخہ کو ایک کتب خانہ میں دیکھا تھا اُس نسخہ کے کاغذ سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ اوائل قرن ہفتم یعنی خود حکیم سنائی کے عہد میں لکھا گیا ہے

(۲) حکیم سنائی کا مکتوب ہے بہرام شاہ کے نام اس میں حکیم صاحب نے ان اعتراضات کو رد کیا ہے جو غزنی کے ظاہر بیں علماء نے حدیقہ پر وارد کئے تھے، یہ مکتوب اس حدیقہ میں موجود ہے جو محمد بن علی رفام نے جمع کیا تھا۔

(۳) حکیم سنائی کا ایک مکتوب ہے جو انھوں نے اپنے دوست کے لئے آٹا طلب کرنے کے لئے لکھا تھا۔

ذیل میں حکیم صاحب کے دو مکتوبات درج کئے جاتے ہیں، حدیقہ کا دیباچہ بمبئی کے نسخہ میں طبع

ہو چکا ہے۔ حکیم صاحب کا مکتوب بنام بہرام شاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعض آثار میں ہے کہ دو باتیں عمر اور زندگانی میں اضافے اور بارش اور درختوں کے اُگنے کا موجب ہوتی ہیں اُن میں ایک یہ ہے کہ مظلوموں کی مدد کی جائے دوسرے یہ کہ ظالموں پر قہر کیا جائے اور اس پر دلیل ہے پیشوائے عالمیاں محمد مصطفےٰ صلوات اللہ علیہ کا یہ ارشاد "بالعدل قامت السموات والارض" عدل ایک ایسے مرغ کی مانند ہے کہ جس جگہ اس کا سایہ پڑتا ہے وہاں سعادت و دولت پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں یہ مرغ پر زنی کرتا ہے وہ مقام فردوسِ اعلیٰ کی مانند ہو جاتا ہے اور جس جگہ یہ مرغ آشیانہ بنا لیتا ہے وہ زمین قبلہ و کعبۂ امید بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جور و ظلم ایک مرغ کہ جس جگہ پرواز کرتا ہے وہاں قحط رونما ہو جاتا ہے بارش رک جاتی ہے اور چشموں کا پانی قعرِ زمین میں چلا جاتا ہے۔ زندگی اور حیا معدوم ہو جاتی ہے۔ بادشاہ بے زوال جل جلالہ و تقدست اسمائہ سلطان اسلام بادشاہ عادل بہرام شاہ بن مسعود کو ظلم و جور سے آگاہ رکھے۔ اور عدل سے آراستہ کرے۔

• اگر تمام دنیا جمع ہو کر میرے سرمایۂ دل کو لوٹنے کی کوشش کرے تو اس میں کامیاب نہ ہو سکے جو درخت مشاہدہ اسرارِ غیوب نے ملک الملوک نے نصب کیا ہو اس میں جبرئیل اور میکائیل بھی تصرف نہیں کر سکتے تا بہ شیاطین الانس والجن چہ رسد۔ خلق کا ظلم گذر جاتا ہے متاعِ دنیا فنا ہو جاتی ہے.... آخر کار مظلوم پیش گاہ احد میں مقرب ہوتا ہے اور سب سے عجیب تر وہ ظلم جو علماء پر جہلا کی طرف سے ہو اور اس کا مصداق محمد مصطفےٰ صلوات اللہ علیہ کا یہ قول ہے "غنی قوم افتقر و عزیز قوم ذل و عالم بین الجہال" میں نے جو کتاب زبان اہل معرفت میں تصنیف کی ہے اس کو وہ عارف سمجھ سکتا ہے جو اپنی صفات کا دانا اور ملک الملوک کے اسرار کا بینا ہو۔ اگر اس عہد میں بایزیدؒ۔ جنیدؒ۔ اور شبلیؒ موجود ہوتے تو ان کا تصرف اس کتاب میں بجا ہوتا۔ اس لئے کہ وہ اہلِ معرفت تھے لیکن از راہِ خصلات دانش مندوں کا تصرف جو معرفت سے محروم ہیں سراسر کور دلی کا نتیجہ تھا ان لوگوں کے مثالب اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اور اس امر کی دلیل کہ یہ لوگ از راہِ جہل تصرف

کرنا چاہتے ہیں یہ اعتراض ہے کہ "سنائی نے آلِ مروان کی مذمت کی ہے اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ پر فضیلت دی ہے" یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کا ذکر صدیق اکبرؓ فاروق اور ذی النورین رضی اللہ عنہم کے بعد کیا ہے اور مدارج میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی ہے جو ائمۂ سلف کی قایم کی ہوئی ہے اور جو میر کائنات محمد المصطفیٰ صلوات اللہ علیہ سے باخبار صحیح مروی ہے اور جس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے خدا جہان کو ان علماء سے زینت دے جو تجھ سے ڈرتے ہوں اور مخلوق سے شرم کرتے ہوں ہمیں بے گانوں کی صحبت کے عذاب سے بچا اور سلطان عہد کو توفیق عطا کر کہ ان مفسدین پر نوازش سے بچے کہ ان کے حال پر نوازش دین کی تباہی ہے اور مصلحین کی نگہداشت دین و دولت کی بقا اور شادیٔ روانِ محمد مصطفیٰ (صلوات اللہ علیہ الی یوم الدین) کا موجب۔

ایک دوست کے نام سنائی کا مکتوب | بخشش دیکھنے والا بخشائندہ آفرنیش کے پاس ان لستیوں کی حکایت کرتا ہے جنہوں نے شراب خانہ خدم کی بو سونگھی اور تین سو نو سال[1] ایک حالت مستی میں رہے جب ولایت شراب سے ولایت طعام میں قدم رکھا تو تلمیخا سے کہا کہ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا اس تشبیت و ترتیب سے غرض یہ ہے کہ یہ آزاد مرد خواجہ عبد الصمد میرا تلمیخا ہے اور میں آپ کی مدد کا محتاج ہوں چار مہینہ سے تنگ دستی کے سیاہ عارضہ نے مجھے زرد رو کر رکھا ہے اگر آپ میرے سر کو سبز اور حاسدوں کے سینہ کو کبود کرنا چاہتے ہیں تو سپیدی آرد عنایت کیجئے اگر آپ کو آرزوئے دیدار ہے تو مجھے بھی آپ کی شکر ریز کی تمنا ہے جو دن خواجہ عبد الصمد دام توفیقہ مناسب سمجھ کر مقرر کریں اس دن قدم رنجہ فرما کر دولت دیدار سے بہرہ اندوز فرمایئے کہ لقاء الخلیل شفاء العلیل مشہور ہے تصدیعہ کے لئے عذر خواہ ہوں معز الدین احمد گرامی سے ملاقات ہو تو میری طرف سے انھیں دعائے عاشقانہ

---

[1] اس قصے میں ۳۰۹ کے عدد میں اشارہ اصحابِ کہف کی طرف ہے (فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا) اس سے مفسرین ۳۰۹ سال لیتے ہیں تفسیر روح البیان ج ۵ ص ۲۲۰ اصحاب کہف نے ہوش میں آنے کے بعد تلمیخا کو کھانا لانے کے لئے بستی میں بھیجا تھا۔ ۱۲

عرض کر دیجئے۔ والدعا۔

شعرا کی طرف سے سنائی کی عظمت کا اعتراف

طبقۂ صوفیا میں مولانا جلال الدین بلخی حکیم سنائی کی عظمت کے بڑے موید ہیں اور انھوں نے اپنی مثنوی میں متعدد مقامات پر ابیات سنائی کی شرح کی ہے حدیقہ اور مثنوی کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ترک جوشش کردہ ام من نیم خام　　از حکیم غزنوی بشنو تمام

دوسرے مقام پر کہتے ہیں

بشنو ایں پند از حکیم غزنوی　　تا بیابی در تنِ کہنہ نوی

ایں رباعی را شنو از جان و دل　　تا بکل بیروں شوی از آب و گل

آں حکیم غزنوی شیخ کبیر　　گفتہ است ایں پند نیکو یاد گیر

دوسری جگہ سنائی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

آں امام الغیب و فخر العارفیں　　در الٰہی نامہ گفتہ شرح ایں

ایک جگہ سنائی کو پیر دانا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

بشنو از قولِ سنائی ایں رموز　　معنی تا واقف آئی بر کنوز

گر تو بگشائی ز باطن دیدۂ　　زود یابی سربسر گنجیدۂ

پیر دانا اندریں رمزے بگفت　　در حقیقت زیں صدف درے بسفت

اپنی غزلیات میں فرماتے ہیں۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او　　ما از پے سنائی و عطار آمدیم

شمس الدین محمد افلاکی اپنی کتاب مناقب العارفین میں رقم طراز ہے کہ بہاء الدین بحری نے جو علم معانی سے بہرہ کامل رکھتا تھا روایت کی ہے کہ ایک روز مولانا جلال الدین بلخی نے فرمایا کہ جو عطار کا کلام پڑھے گا وہ سنائی کی باتوں سے مستفید ہوگا اور جو سنائی کے اشعار پر غور کرے گا وہ ہمارے اشعار کے معانی سمجھ سکے گا۔

مناقب العارفین میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ ایک روز ایک شخص نے مولانا کے سامنے حدیقہ پر اعتراض کیا آپ نے فرمایا کہ چپ ہو جا۔ اگر تو مسلمان ہے اور عظمت سنائی سے واقف تو تیرے سر سے ٹوپی گر جاتی۔

مولانا نے مثنوی میں چند مقامات پر اشعار سنائی کی تشریح و تفسیر کی ہے ان میں سے ایک یہ شعر ہے۔

بہر چہ از راہ دا مانی   چہ کفر آں نقش و چہ ایمانی۔
بہر چہ از دوست دور افتی   چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

اس کے علاوہ مندرجہ اشعار کی تشریح و تضمین کی ہے۔

ناز را روئے بہ باید ہم چو ورد   چوں نہ داری گرد بدخوی مگرد
عیب باشد چشم نابینا و باز   زشت روئے نازیبا و ناز
چوں نبی نیستی ز امت باش   چونکہ سلطاں نہ رعیت باش
کار زر دروں جان تو می باید   کز عاریت ہا ترا درے بکشاید

(رباعی)
یک چشمہ آب اندرون خانہ   بہ زاں جوئے کہ از بروں می آید
آسماں ہاست در ولایتِ جاں   کار فرمائے آسمانِ جہاں

(قطعہ)
درہ روح نسبت و بالاہاست   کوہ ہائے بلند و صحراہاست
بمیر اے دوست پیش از مرگ   اگر می زندگی خواہی
کہ ادریس از چنیں مردن   بہشتی گشت پیش از ما
چوں زباں حسد شود نخاس   یوسفے یابی از گز کرباس
بیت بن بیت بنیت اقلیم است   ہزل من ہزل بنیست تعلیم است

یہ تو وہ اشعار ہیں جن کی تضمین کے متعلق مولانا نے خود اشارہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ مثنوی میں اور مضامین اور امثال بھی موجود ہیں جو خفیف تغیر سے حدیقہ میں موجود ہیں۔ بہر حال

حدیقہ اور مثنوی میں بڑی حد تک معنوی اتحاد ہے۔ اور ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے میرے نزدیک حدیقہ اور مثنوی دو گلزار ہیں دونوں میں پھول کھلے ہوئے ہیں لیکن ایک میں کم اور دوسرے میں زیادہ۔

حدیقہ اور مثنوی کے درمیان موازنہ

عبداللطیف عباسی حدیقہ اور مثنوی کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ ان دونوں کتابوں میں عموم اور خصوص کی نسبت ہے۔ حدیقہ میں جو کچھ ہے وہ مثنوی میں بشرح و بسط نظر آتا ہے لیکن جو کچھ مثنوی میں ہے وہ حدیقہ میں بصورت ایجاز و اختصار ملتا ہے اگر حدیقہ کو متن اور مثنوی کو شرح قرار دیا جائے تو بجا ہے۔ دونوں بزرگوں کی وحدت خیال ظاہر کرنے کے لئے ذیل میں حدیقہ اور مثنوی کی دو حکایتیں درج کی جاتی ہیں۔

حدیقہ

بود شہرے بزرگ در حد غور — وزدراں شہر مردماں ہمہ کور
بادشاہے براں مکان گذشت — لشکر آورد و خیمہ زد در دشت
درشت پیلے بزرگ باہیبت — از پئے جاہ و حشمت و صولت
مردماں را نہ بہر دیدن فیل — آرزو خواست زاں چنیں تہویل
چند کور از میان آں کوراں — بر پیل آمدند زاں عوراں
ہر یکے را بہ لمس ہر عضوے — اطلاع اوفتاد بر جزو ے
ہر یکے صورتے محالے بست — دل و جاں درپے خیالے بست
چوں بر اہل شہر باز شدند — بر شاں دیگراں فراز شدند
آرزو کرد ہر یکے ز ایشاں — آنچناں گمرہان و بدکیشاں
ہیئت و شکل پیل پرسیدند — وانچہ گفتند جملہ بشنیدند
تا بدانند شکل و صورت پیل — ہر یکے با زباں دراں تعجیل
آمدند و بدست می سودند — زانکہ از چشم بے بصر بودند

آنکہ دستش بسودے گوش رسید | دیگرے حال پیل ازو پرسید
گفت شکلیست سہمناک و عظیم | پہن و صعب و فراخ ہم چو گلیم
و آنکہ دستش رسید زی خرطوم | گفت گشتہ است مرمرا معلوم
راست چوں بنے رواں میانہ تہی است | سہمناک است و مایۂ تبہیست
و انکہ را بد زپیل ملموسش | دست و پائے لطرد پر بوسس
گفت شکلش چنانکہ مضبوط است | راست ہم چوں عمود مخروطاست
ہر یکے دیدہ جزوے از اجزا | ہمگناں را نظر فتادہ خطا
ہیچ دل را نہ کلی آگہ نے | علم باہیچ کور ہمرہ نے
جملگی را خیال ہائے محال | کردہ مانند غبقرہ بجوال

از خدائی خلائق آگہ نیست
عقلا را دریں سخن رہ نیست

مثنوی

پیل اندر خانہ تاریک بود | عرضہ را آوردہ بودندش ہنود
از برائے دیدنش مردم بسے | اندراں ظلمت ہمی شد ہر کسے
دیدنش باچشم خود ممکن نبود | اندراں تاریکیش کف می بسود
آں یکے را دست برگوشش رسید | آں برو چوں باد بیزل شد پدید
آں یکے را کف چو بر پایش بود | گفت شکلِ پیل دیدم چوں عمود
آں یکے بر پشت او بنہاد دست | گفت ایں پیل چوں تخت بدست

ہم چنیں ہر یک بجزوے کو رسید
فہم آں میکرد و ہر جا می تنید

اس مسئلہ کے متعلق کہ توحید الٰہی کی راہ عقل سے نہیں مل سکتی سنائی کہتے ہیں۔

راہ توحید را بہ عقل مجوئی   دیدۂ روح را بخار مخار

ہر کہ از چوب مرکبے سازد   مرکب آسودہ راں وخستہ سوار

اسی تشبیہ کو مولانا مثنوی میں اس طرح لکھتے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

ظاہر بینوں کی تقلید سے بچنے کے لئے سنائی ان الفاظ میں ہدایت کرتے ہیں۔

اندریں رہ صد ہزار ابلیس آدم روئے ہست   تا ہر آدم روئے را زیں پایہ آدم نشمری

مولوی صاحب اسی موضوع پر فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہ ہر دستے نباید داد دست

سنائی و خاقانی | حکیم سنائی کے ارادت مندوں میں خاقانی شروانی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے
خاقانی نے بقول اصح ۵۹۵ھ میں وفات پائی)

خاقانی کی خود پسندی کا یہ عالم ہے کہ فن شعر میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا عنصری اور عسجدی کو اپنے خوانِ فضیلت کا ریزہ خوار کہتا ہے اور اپنے کو حسانِ عجم کہتا ہے۔

ایک جگہ تعلی کرتا ہے

شاعرِ مفلق منم خوانِ معانی مراست   ریزہ خورِ خوانِ من عسجدی و عنصری

دوسری جگہ کہتا ہے

اگر بر احمدِ مختار خوانند ایں چنیں شعرے   ز صدر او صدا آید کہ تو احسنت حسانی

پھر ایک جگہ یقین کے ساتھ کہتا ہے

گر نہ ردیف شعر مرا آمدے بکار   مانا کہ خود نساختے اسکندر آئینہ

لیکن اس تمام رعونت اور انانیت کے باوجود حکیم سنائی کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے کو ان کی ذیل میں سمجھتا ہے۔

چوں زماں عہد سنائی در نوشت   آسماں چوں من سخن گستر بزاد

چوں بہ غزنی شاعرے درخاک شد   خاک شرواں شاعرے دیگر بزاد
یوسف صدیق چوں بر نسبت نطق   از خفا موسی پیغمبر بزاد

دوسری جگہ کہتا ہے۔

بدل من آدم اندر جہاں سنائی را   بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

ایک جگہ اس اعتراض کا جواب دیتا ہے جو رشید وطواط نے حکیم سنائی کے دیوان پر کیا تھا

کہ احمقی است سر کردہائے شیطانی

خاقانی نے سنائی کے بعض قصائد کی اتباع میں قصیدے لکھے ہیں اس سلسلہ میں سنائی کا قصیدہ معروف بہ رموز الاولیا خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

تحفۃ العراقین کی تصنیف میں بھی خاقانی کی نظر حکیم سنائی کی مثنویات پر تھی اور حدیقہ کے بعض مضامین اس میں نظر آتے ہیں۔ سنائی نے خطاب بہ آفتاب کے عنوان سے لکھا تھا۔

چوں در آئی بہ بارگاہ حمل   بنمائی ہزار گونہ عمل
زیورِ حسن بر جہاں بندی   نقش دیبائے گلستاں بندی
قدح لالہ پر شراب کنی   عارضِ ارغواں خضاب کنی

خاقانی اسی عنوان کے تحت لکھتا ہے۔

باز از برۂ خوان استادی   یک سالہ غذائے خلق دادی
یاقوت چنیں باغ رخشاں   از طرۂ سبز و جعدِ ریحاں
گلگونہ لالہ ہم تو دادی   خاک پیش بہ رخ نہادی

سنائی نے لکھا تھا

از پے بزم تست چنگ گر   در سموم قصر زہرۂ ازہر
بستہ پشت کمر بہ سرہنگی   والی عقرب آں یل جنگی

خاقانی نے اسی موضوع پر تحریر کیا

لہ برۂ مراد از برج حمل

پروین بہ سرخانہ زاں سوئے نشست | ماہ اجزئے خود پہلوئے نشست
بالات شجاع ارغواں تن | زیر تو عروس ارغنوں زن

سنائی نے لکھا تھا۔

در حجاب تو دختراں یکسر | اندریں ہفت منظر اختر
تو کہ در ہفت کشوری خسرو | شہ سواری ولیک تنہا رو

خاقانی نے لکھا

از ہم تو در نقاب خضرا | مستوری صد ہزار رعنا
صاحب صدری ولیک خود رائے | در صف نعال ہر کست جائے

نظامی گنجوی | سنائی کے ارادت مندوں میں نظامی گنجوی بھی شامل ہیں، نظامی فارسی کے مقتدر شعرا کی صف اول میں ہیں۔ مخزن الاسرار میں حکیم سنائی کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی کتاب کو حدیقہ کا ہمسر ٹھہرا کر ان الفاظ میں فخر کرتے ہیں۔

نامہ دو آمد ز دو ناموس گاہ | ہر دو مسجل بہ دو بہرام شاہ
آں بدر آوردہ ز غزنی علم | ویں زدہ بر سکہ رومی رقم

جمال الدین اصفہانی | جمال الدین اصفہانی نے بھی حکیم سنائی کا اتباع کیا ہے (جمال الدین قرن ہشتم کے نامور شاعر تھے) لیکن اپنے قصائد کو سنائی کے قصائد کی برابر نہ پہنچا سکے جمال الدین نے سنائی کے اس قصیدہ کا استقبال کیا ہے۔

اے خداوندان قال الاعتبار الاعتبار | وے خداخوانان قال الاعتذار الاعتذار

جمال الدین لکھتا ہے۔

الحذر اے عاقلاں زیں وحشت آباد الحذر | الفرار اے غافلاں زیں دیو مردم الفرار

سلمان ساوجی | سلمان ائمہ شعر میں سے ہے [illegible] سنائی [illegible] عقیدت رکھتا تھا اور اکثر قصائد میں حکیم کا اتباع کیا ہے اور اپنے دیوان میں حکیم صاحب کا ذکر احترام کے ساتھ کیا ہے

ایک جگہ لکھا ہے۔

سنائی گر مرادیدے ز ننگ نام کے گفتے مسلمانی زسلماں جود در دِ دین زبو دردا

اوحدی | جامِ جم کا مولف اوحدی بھی سنائی کا مداح ہے اوحدی نے ۷۳۸ھ میں وفات پائی سنائی کے قصیدہ رموز الاولیاء کا استقبال کیا ہے ۔ اوحدی کا مطلع ہے۔

سرِ پیوند من ندارد یار چوں تواں شد زوصل برخوردار

ابو حامد کرمانی | ابو حامد احمد بن حامد کرمانی مولف تاریخ عقد العلی الی الموقف الاعلی بھی حکیم سنائی کا ارادت مند ہے ابو حامد نے ۵۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس نے اپنی کتاب میں حدیقہ کے ۷۵ اشعار نقل کئے ہیں۔

حافظ | خواجہ حافظ نے بھی اپنے دیوان میں سنائی کا ذکر احترام کے ساتھ کیا ہے

اگر شاعر بخواند شعر چوں آب کہ دل را زو فزاید روشنائی

نہ بخشندش جوے از بخل و امساک اگر خود فی المثل باشد سنائی

شرف الدین بخاری | شرف الدین بخاری نے رسالہ نام حق میں سنائی کی دو شعروں کو تضمین کیا اور حکیم صاحب کی تعریف کی ہے۔

خود سنائی چو بس نکو گفتہ است در معنی نگر کہ چوں سفتہ است

غم دیں خور کہ غم غم دین است ہمہ غمہا فروتر از ایں است

غم دنیا مخور کہ بیہودہ است ہیچ کس در جہاں نیاسودہ است

الحق کہ حکیم نیک موعظت نمودہ زیرا کہ دنیا بہ نسبت آخرۃ قلیل است بالصرورغم آں بلقائے آخرۃ بیہودہ گفتہ می شود پس بر عاقل لازم است کہ در اتمام دین ساعی باشد و دنیا را مزرعۂ آخرت دانستہ اگر دراں غم خواری نماید از دین شمردہ می شود۔ انما الاعمال بالنیات۔ والا لا۔

ملک الشعرائے بہار | ہمارے عہد میں بھی ملک الشعرائے بہار نے سنائی کا یہ شعر اپنے مشہور قصیدہ میں اقتباس کیا ہے۔

گاؤ را دارند باور در خدائے عامیاں نوح را باور نہ دارند از پے پیغمبری

ملک الشعرائے بہار نے اسی مضمون کو ان الفاظ میں لکھا ہے

بہ نبوت نہ گرفتند رہ نوح نبی وائے از ایں بے ادبی

بخدائی نمودند بہ گوسالہ سلام داد از دست عوام

اس مقالے کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتب عربی وفارسی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۱) اغانی ابوالفرج اصفہانی
(۲) معجم الادباء یاقوت حموی
(۳) معجم البلدان یاقوت حموی
(۴) طبقات ناصری
(۵) تاریخ کامل ابن اثیر
(۶) تاریخ ابوالفداء
(۷) وفیات الاعیان ابن خلکان
(۸) دائرۃ المعارف محمد فرید وجدی
(۹) روضۃ الصفا
(۱۰) تاریخ ابوالقاسم فرشتہ
(۱۱) عقد العلالی الموقف الاعلیٰ
(۱۲) تاریخ ابوالفضل بیہقی
(۱۳) تاریخ یمینی
(۱۴) تاریخ سلاجقہ۔ تالیف عماد کاتب
(۱۵) نفحات الانس جامی
(۱۶) رشحات
(۱۷) چہار مقالہ عروضی
(۱۸) شعر العجم شبلی
(۱۹) خزینۃ الاصفیاء
(۲۰) سفینۃ الاولیاء
(۲۱) اقتباس الانوار
(۲۲) النبوۃ والخلافت محمد حضری بیگ
(۲۳) حدائق السحر فی دقائق الشعر رشید وطواط
(۲۴) ترکتازان ہند
(۲۵) آتش کدہ آذر
(۲۶) مجمع الفصحاء
(۲۷) مجلہ کابل
(۲۸) سخن وسخنوران تالیف بدیع الزماں
(۲۹) تاریخ ادبیات۔ تالیف ڈاکٹر رضازادہ شفق
(۳۰) منتخبات ادبیات ایران تالیف بدیع الزماں

(۳۱) احوال و آثار سلمان بقلم رشید یاسمی
(۳۲) مناقب العارفین تالیف شمس الدین محمد افلاکی
(۳۳) تذکرۂ حسینی
(۳۴) تذکرہ دولت شاہ
(۳۵) تذکرہ والہ داغستانی
(۳۶) مآثر الکرام آزاد
(۳۷) خزانۂ عامرہ
(۳۸) کشف الظنون حاجی خلیفہ
(۳۹) قاموس الاعلام شمس الدین سامی
(۴۰) بیوک مجلہ
(۴۱) مجلۂ ارمغاں
(۴۲) تزک بابر
(۴۳) تاریخ گزیدہ حمداللہ مستوفی
(۴۴) نامۂ دانشوراں
(۴۵) تاریخ سرجان مالکم
(۴۶) مفتاح الکفایہ شرح عوارف المعارف
(۴۷) بیان الادیان
(۴۸) تاریخ بارتولا
(۴۹) تاریخ ہفت اقلیم امین احمد رازی
(۵۰) مثنوی شریف
(۵۱) حدیقۂ سنائی
(۵۲) طریق التحقیق
(۵۳) سیر العباد
(۵۴) کارنامہ بلخ
(۵۵) عشق نامہ
(۵۶) عقل نامہ
(۵۷) بہرام و بہروز
(۵۸) دیوان قصائد
(۵۹) قاموس افغانی
(۶۰) تفسیر مولانا یعقوب چرخی
(۶۱) قصائد خاقانی
(۶۲) تحفۃ العراقین خاقانی
(۶۳) مخزن الاسرار نظامی
(۶۴) مجمع الانساب سمعانی
(۶۵) فرہنگ جہانگیری
(۶۶) فرہنگ آنند راج
(۶۷) دیباچہ خطی جو محمد بن علی رقام نے حدیقہ پر لکھا ہے
(۶۸) دیباچہ جو عبداللطیف عباسی نے حدیقہ پر لکھا ہے
(۶۹) کلیات شیخ عطار
(۷۰) تاریخ ادبیات افغانستان مدونہ فاضل کریم خاں نزہی
(۷۱) تذکرہ لباب الالباب محمد عوفی
(۷۲) تفسیر روح البیان شریف
(۷۳) ہفت مقالہ قزوینی
(۷۴) روضۃ الالواح تالیف محمد رضا خاں

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

از

(جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب)

(۲)

اس قرآن میں اگلے اور گذرے ہوئے لوگوں کی خبریں بھی ہیں۔ اور پچھلے یعنی آنے والے زمانے اور لوگوں کی اطلاعیں اور پیشین گوئیاں بھی۔ اور تمہارے درمیان کا یعنی تم (ہر دور کے) موجودہ لوگوں کے لئے حکم و احکام اور ہدایات و تعلیمات بھی ہیں۔ یہ پاک کلام نہایت مستحکم اور اٹل فیصلہ ہے، ہنسی، دل لگی، اور للو پچو کی باتیں اس میں نہیں ہیں۔ جو آدمی نافرمانی اور سرکشی سے اس کو چھوڑے گا، حق تعالیٰ اس کی کمر اور ہمت توڑ دیگا۔ اور جو کوئی اس کے سوا کہیں اور سے ہدایت تلاش کرے گا، اللہ پاک اس کو راہ راست سے دور فرما دئے گا۔ یہ کتاب کریم حق تعالیٰ کی قوی اور مضبوط رسی ہے ذکر حکیم ہے اور صراط مستقیم، اس سے انسانی خیالات اور آراء و افکار میں کجی نہ ہوگی، اور اس سے انسانوں کی زبانوں میں اشتباہ و شبہات پیدا نہ ہونگے۔ یہ وہ پاک کتاب ہے جس سے یعنی جس کی تلاوت جس کے فہم، اور جس پر عمل کرنے سے علماء اور جاننے والوں کو کبھی سیری نہ ہوگی۔ قرآن پاک بار بار کی تلاوت و قراءت اور درس و مذاکرت سے پرانا اور مردہ نہ ہوگا۔ اس کے اسرار و لطائف اور نصائح و حکم عمیق و وسیع، حقائق و بصائر لامعدود، ولامحدود ہیں، جو کبھی ختم نہ ہو پائیں گے۔ جو شخص بھی اس کے ساتھ قول کرے گا اور حق پر استشہاد کرے گا، سچا رہے گا اور جو اس کے ارشاد و ہدایت اور بیان و حکمت کے مطابق عمل کرے گا، فلاح و ثواب سے بہرہ ور ہوگا۔ اور جو بھی اس کے موافق حکم کرے گا، انصاف کرے گا، اور جو اس کی دعوت مانے گا،

راہ راست پاوے گا، (ترمذی شریف)

حدیث بالا کا مطلب خیز عام فہم مفہوم موجودہ دور کے ہم تمام مسلمانوں کو بلکہ تمام افراد و اقوام انسانی کو ایک ایسا پیغام ہدایت دے رہا ہے جس کی طرف عام و خاص سب کی توجہ مطلوب ہے، فتنوں سے بچاؤ اور زندگی کے مصائب و آفات سے ہدایت کس کو مطلوب نہیں؟ اور پھر کون ہے جو قدرت کے اس الٰہی انتظام سے اپنے آپ کو محروم رکھے اور محروم رہنا پسند کرے؟

فتنہ، گڑبڑی، اور فساد زندگی کے کسی مرحلے میں ہو۔ مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے نقصان و خسران کا سبب بن جاتا ہے مرنے کے بعد کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اور اس دنیا کی چندروزہ زندگی کا نتیجہ۔ اگر یہ اچھی ہے تو وہ بھی اچھی ہوگی اور یہ بری ہے تو وہ بھی۔ اسی لئے ہمیں قرآن مجید میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی حسنہ، نیکی بھلائی اور خوبی عنایت فرما اور آخرت میں بھی۔ اور آگ کے عذاب سے بچالے اور محفوظ کر دے۔

فتنہ محیا و ممات سے حفاظت، اور دنیا و آخرت کے فتنوں اور عذابوں سے بچاؤ کے لئے قدرت نے اپنے خاص انتظام سے رکیوں کہ خدا نے انسانوں کو پیدا کر کے ان کو ان کے حال پر آزاد اور مطلق (بے قید نہیں چھوڑ دیا) انسانوں کو اپنا پاک کلام قرآن مجید عطا فرمایا ہے، اور اس کو مضبوطی سے پکڑنا۔ فتنوں سے بچاؤ کا۔ آفتوں سے چھٹکارے کا اور دنیا و آخرت کے وبال سے خلاصی اور نجات و مخلصی کا سبب بنایا ہے۔

کتاب اللہ کو مضبوط پکڑنے کی صورت کیا ہے۔ یہ کہ اس پر ایمان لائیں۔ اور سچی محبت پاک نیت اور مضبوط ارادے کے ساتھ اس کی ہدایت کے مطابق اپنی تمام زندگی، زندگی کی ہر حرکت و سکون، اخلاق اور سیرت و کردار بنائیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے الفاظ کو سیکھیں، اس کو پڑھیں، اور تلاوت کریں۔ اس کے، معنی کو سیکھیں اور خدا کی بتلائے ہوئے مطلب و مفہوم کو حاصل کریں۔ اور ان الفاظ و معانی کے فہم و علم سے اصلی مقصد یعنی

عمل کی ہمت و توفیق پائیں جس کے نتیجہ میں فتنوں پر غالب آئیں گے اور مغلوب ہونے سے حفاظت ہوگی۔

قرآن پاک کی تلاوت، اس کا فہم اور اس پر عمل۔ یہ تینوں چیزیں نزول قرآن کا اولین مقصد اور بنیادی و اساسی مقصود ہے اور ان میں ہر ایک باہم دگر لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا اور ایک دوسرے پر موقوف و مترتب ہے۔

تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے۔ فہم کے ساتھ ہو یا بغیر فہم۔ ثواب و سعادت کا باعث، خدا کی ہم کلامی کا موجب اور نزول برکت و خیر کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک تجربہ شدہ اور اہل ذوق پر عیاں حقیقت ہے کہ علم و فہم بار بار کی تلاوت و قراءت اور ورد و تکرار سے جتنا مضبوط اور راسخ ہوتا ہے اتنا سرسری طور پر دیکھ لینے یا معمولی طریقہ سے پڑھ لینے سے نہیں ہوتا۔ شاعری یا کسی دوسرے فن و ہنر کا صحیح ذوق رکھنے والوں سے پوچھئے اور اگر آپ خود اس راہ کے راہ نوردہیں تو اپنی حالت و ذوق کا اندازہ لگائیے کہ کسی کام کی تکرار کرنا، بار بار پڑھنا اور پڑھتے رہنا اور بار بار کسی کام کو کرتے رہنا قوت حافظہ کی نگہداشت بھی کرتا ہے اور صحیح ذوق و معرفت بھی بلکہ کمال و مہارت بھی انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اور کسی کام کی مداومت اور ہمیشگی اس کی استقامت کا موجب بن جاتی ہے "خیر العمل ما دِیم علیہ" یعنی بہترین کام وہ ہے جو ہمیشہ کیا جاتا رہے کہ ارشاد نبوی کا عملی ثبوت بہم پہونچاتا ہے قرآن مجید شعر و شاعری نہیں "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ" اور اس کا علم انسان کا تخیلاتی علم نہیں۔ یہ لطیف و مقدس کلام انسان کے تخیلی فنون لطیفہ میں سے نہیں بلکہ اس سے بھی ماوراء، بدرجہا زائد اور بمراتب بلند و برتر اور درحقیقت انسانی علم و فکر کی قوتوں سے فزوں تر اور بیروں تر، اور نہایت الطف اعلیٰ روحانی و نورانی عالم و مقام کی ایک قدرتی اور فطری واضح اور بین شے یعنی خدائے قادر و توانا، ہمہ بین، ہمہ دان اور ہمہ توان کا مقدس و لطیف حکیمانہ کلام ہے۔

قرآن مجید کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت یا ایک آیت کو لے لیجئے اور اس کے الفاظ

وکلمات کو صحت کے ساتھ حاصل کر کے اس کے معانی ومفہوم اور مقصود ومطلب میں گم ہو جائے اور اپنے آپ کو پوری طرح منہمک، مستغرق اور اس طرح محو بنا لیجئے کہ اس کا صحیح عرفان حقیقی ذوق اور سچی معرفت حاصل ہو جائے۔ اور پھر اپنی زندگی میں اس کے اثرات و نتائج کو محسوس کیجئے اور زندگی کے مختلف ادوار و حالات پر اس کا انطباق کرتے اور اس کو پھیلاتے جائیے تدریجی طریقہ پر اپنی پوری زندگی میں قرآن پاک کے آیات اور ان کے مضامین ومقاصد کو اپنا کر اور اس کے اثرات اپنے اندر سما کر دیکھئے۔ فہم کے ساتھ اور مطلب ومعنی کی فہمید کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت وقرارت بے حد مسرت وراحت بے انتہا یقین و اطمینان کا سبب اور عمل پر ہمت واستقامت کا وسیلہ ہوتا ہے، ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے اپنے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

اور جب تک اس طرح قرآن پاک اور اس کا علم وعمل حاصل نہ کیا جائے گا قرآن پاک سے اور قرآن پاک کے فہم وتدبر اور علم وعمل سے کوئی فائدہ اور نتیجہ برآمد نہ ہوگا، شاید ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی کے تجربہ کے لئے کہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن فہمی اور قرآن مجید سے خدائے بزرگ وبرتر کی مراد معلوم کرنے اور کلام خدا کا مطلب سمجھنے کے تین ذریعہ ہیں ایک ترجمہ دوسرے تفسیر تیسرے تاویل۔

ترجمہ غیر اہل زبان کے لئے ہوتا ہے اور تفسیر وتاویل اہل زبان وغیر اہل زبان دونوں کے لئے۔

ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں اصل مطلب ومراد کو منتقل کر دینے کا نام ہے تاکہ دوسرے لوگ جو کہ اہل زبان نہیں ہیں اسے سمجھ سکیں اور مطلب ومراد معلوم کر کے نفع پا سکیں۔ اس کے لئے ہم ہندوستانی لوگوں کے واسطے آج سے سو سوا سو برس پہلے

ہندوستان کی عام بولی میں امام المحققین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے خاندان کے دو بزرگوں شاہ عبدالقادر صاحب رح اور شاہ رفیع الدین صاحب رح نے۔ اول الذکر بزرگ نے اس دور کے ہندوستانی محاورے کے مطابق اور ثانی الذکر بزرگ نے تحت اللفظ" قرآن مجید کے معانی و مطالب کو اردو ہندی اور ہندوستانی میں منتقل فرمادیا اور جمہور کی آسانی اور عمل میں سہولت کے لئے قرآن پاک کے ترجمہ کا یہ فرض کفایہ انجام دیا۔

قرآن پاک کے ظاہری، بدیہی اور عملی یقینی پہلوؤں پر یعنی اصول دین، احکام شریعت، اخلاق و تصوف اور عبرت و نصیحت کی تمام باتوں اور جملہ امور معاش و معاد پر ان دونوں ترجموں کی مدد سے کامل بصیرت اور عمل کی قوی ہمت پیدا ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رح کا با محاورہ ترجمہ قرآن کچھ ایسا مستند و مقبول اور بابرکت و سعادت ثابت ہوا کہ اسی سلسلۂ علم و دین اور حوزۂ قرآن و حدیث کے ایک مستند و مقبول بزرگ استاذ الاساتذہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہ نے اس ترجمہ کو موجودہ دور کی اردو ہندی زبان اور ہندوستانی بولی کے محاورہ کے مطابق تبدیل فرمایا اور آپ کے وصال کے بعد اس کے تفسیری حواشی کو آپ کے ایک شاگرد جلیل حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی نہج پر مکمل فرمایا۔ اب سے ہمیشہ تک ان سب بزرگوں کی قرآن فہمی اور قرآن پاک کے روحانی ذوق سے اہل بصیرت اور ارباب علم اپنے روح و قلب کو سیراب کرتے اور جمہور عوام و خواص اپنے ظاہری و باطنی اسقام و امراض کا مداوا طلب کرتے رہیں گے۔ تراجم قرآن میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب محدث و مفسر میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بھی بہت نافع اور مستند ہے۔ اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن پاک جو مختصر تفسیر پر حاوی و مشتمل ہے عام و خاص میں مقبول اور فقہ و دینیات مسائل و احکام کا جامع ہے۔

یہ ترجمہ تقریباً تحت اللفظ ہونے کے باوجود بامحاورہ اور نہایت سلیس ہے طلبہ اور اہل علم کو اس کا مطالعہ میں رکھنا اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی دیندار عربی داں سے پڑھنا بہتر ہے اور اگر عام طور پر مساجد و مکاتب میں درس قرآنی کے سلسلہ میں اس ترجمہ کو سامنے رکھ کر ترجمہ وتفسیر بیان کیا جائے تو میری رائے میں قرآن فہمی کا حق ادا ہو جائے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب (رحمہما اللہ تعالےٰ ورحمنا معہم) ان دونوں بزرگوں کے ترجمے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مصدقہ پسندیدہ اور نہایت عمدہ صاف سلیس مطلب خیز اور لفظی و معنوی آزاد فہمی کی ہر قسم کی غلطیوں اور خرابیوں سے خالی ہیں۔

حضرت الاستاد مولانا احمد علی صاحب محدث و مفسر لاہوری کا ترجمہ قرآن پاک بھی بہت مقبول و مستند ہے، قرآن پاک کی سورتوں کی تشریح اور تفسیر و تاویل کا بھی حضرت مولانا نے ایک سلسلہ شروع فرمایا تھا، جس میں ان اصول کو مدنظر رکھا ہے کہ

(۱) قرآن پاک کا وہ مطلب سمجھا اور بیان کیا جائے جو ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ پاک میں سمجھا گیا ہے۔ اور

(۲) اس کے بعد موجودہ دور کے مسلمانوں کے حالات پر اس کو منطبق کر کے اس سے فائدہ اور سبق حاصل کیا جائے خدا کرے عامۃ المسلمین کی آگاہی اور فائدے کے لئے یہ سلسلہ جو چند سورتوں تک ہوا تھا تکمیل کو پہنچے، اور برادر مکرم مخلص محترم مولانا حبیب اللہ صاحب زاد مجدہم جو اپنے بزرگ باپ کے سچے جانشین ہیں اس طرف توجہ فرمالیں۔ عصری تراجم میں امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام صاحب آزاد وزیر تعلیمات ہند کا مختصر ترجمہ وتفسیر، عالم اسلامی پر ایک احسان عظیم ہے اور اہل علم و اصحاب ذوق کے مطالعہ میں رکھنے کی کتاب ہے، اس میں قرآن عزیز کے معنی مرادی اور منشاء الٰہی کو مولانائے محترم دامت معالیہم ومتع اللہ المسلمین بنفائس افاداتہم " نے اپنے خاص علمی و ادبی اسلوب اور دینی و روحانی ذوق میں بیان فرمایا ہے۔ یہ ترجمہ نادرۂ روزگار ہے۔

فَفِی کُلِّ لَفْظٍ مِنْہُ رَوْضٌ مِنَ الْمُنٰی　　　وَفِی کُلِّ سَطْرٍ مِنْہُ عِقْدٌ مِنَ الدُّرِّ

قرآن عزیز کے مطالب و مضامین اور نکات و لطائف پر عمیق نگاہ اور حقائق قرآنی میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے اس دور میں ایسی سلاست و اختصار، جامعیت و احتواء کے ساتھ شاید ہی کسی اور نے لکھا ہو۔

لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ　　　اَنْ یَجْمَعَ الْعَالَمَ فِی الْوَاحِدِ

ترجمان القرآن، قرآن کریم کے بنیادی حقائق کی ترجمان اور اس کے تعمیری وجمالیاتی نقطہ نظر کی کمال لطافت کے ساتھ حکیمانہ تفسیر ہے، دینی ذوق و بصیرت، اسلامی ذہنیت اور لوازم علم وعمل پیدا کرنے کے لئے بہترین روحانی معلم

لَا یُدْرِکُ الْوَاصِفُ الْمُطْرِیْ خَصَائِصَہٗ　　　وَاِنْ یَکُ سَابِقًا فِیْ کُلِّ مَا وَصَفَا

ثقافۃ الہند (ہندوستان کی مجلس ثقافتی کے عربی رسالہ) میں حضرت مولانا آزاد مدظلہ کا ایک سلسلۂ تفسیر عربی میں شائع ہو رہا ہے اس کے لئے تمام اقوام عربیہ اور ممالک اسلامیہ حضرت مولانا کے منت پذیر ہیں۔ اور ہم سب اہل ہند آپ کے شکر گزار، حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین انصاری فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن شریف کی مختلف سورتوں کی عربی تفسیرات کا اردو ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے نہایت خوبی اور کمال لطافت سے فرمایا ہے اور موجودہ دور کی ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مولانا خواجہ عبد الحئی صاحب، مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی، حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تفسیریں اور ترجمے بھی صحیح، مستند اور بہت عمدہ مضامین سے مملو ہیں۔

غرض اس کتاب الٰہی کی اس تیرھویں اور چودھویں صدی میں اور بھی بہت سی تفسیریں اور ترجمے لکھے گئے ہیں اور ہر اہل ذوق عالم نے اپنے رجحان طبع، مذاق طبیعت، ماحول کی ضرورت اور زمانہ کی فضا کے مطابق اور اپنی علمی و دینی عملی و روحانی لیاقت و قابلیت کے

اندازے پر اس کتاب عزیز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ان سب کا ذکر و احصاء اور ان سب کی تعریف، و تنقید کے لئے کافی فرصت اور طویل دفتر کی ضرورت ہے، تاہم مقصود سب کا قرآن مجید کی ہدایات و تعلیمات کا نشر و ابلاغ، احیاء دین و اصلاح حالات مسلمین و غیر مسلمین ہے۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ عن الاسلام و امۃ القرآن خیر الجزاء و احسنہا الی یوم الدین

ترجمہ کے بعد قرآن مجید کی تفسیر و تاویل کا درجہ ہے۔ یعنی اصلی مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے بعد اس کو خوب کھول کھول کر اور واضح کر کے تشریح و بسط کے ساتھ بیان کرنا۔ ترجمہ کا کام الکل پچو کام نہیں ہے بلکہ نہایت اہم ذمہ داری اور حد درجہ احتیاط کا کام ہے اور تفسیر کا کام اس سے بھی بدرجہا زیادہ اہم اور ذمہ داری کا ہے، ترجمہ کے متعلق حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اور ان کے تتبع میں حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اپنے تراجم کے مقدموں میں بعض اصولی باتیں اور ہدایتیں ذکر کی ہیں۔

مخدوم ملک و قوم حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قبلہ سیوہاری دامت معالیہم کی سعی بلیغ سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کا ایک فارسی رسالہ (ندوۃ المصنفین دہلی کے ماہانہ رسالہ برہان میں) گذشتہ سنین میں چھپا ہے جس کو مولانائے موصوف نے ترجمہ کر کے اجمال کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ اس رسالہ سے خاص طور پر اور حضرت شاہ صاحب رح کے رسالہ الفوز الکبیر فارسی و الفتح الخبیر عربی سے بھی عام طور پر ترجمہ و تفسیر کے متعلق چند ایسی ہدایات ملتی ہیں جن سے قرآن فہمی میں مدد ملتی اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں ایک حد تک رہنمائی ہوتی ہے۔ یہ رسالے بھی ملک کی عام زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رح کے عربی رسالہ اصول تفسیر کا مولانا خالد صاحب انصاری زاد مجدہم نے اردو ترجمہ بھوپال سے شائع فرمایا ہے اس کے علاوہ بھی ترجمہ و تفسیر کے قواعد و اصول اور قرآن شریف کے معنی فہمی کے متعلق سابقین و لاحقین علماء کی طرف سے نہایت مفید

خدمات انجام دی گئی ہیں۔

علامہ سیوطیؒ کی کتاب الاتقان فی علوم القرآن جس کے متعلق جمہور علماء کا مسلّمہ ہے کہ اسلام میں قرآن مجید کے بارے میں لاجواب ولاثانی کتاب ہے اور اپنا نظیر نہیں رکھتی، اس کا بھی اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور بھی متعدد چھوٹی بڑی کتابیں، رسالے، مضامین ترجمہ وتفسیر کے اصول وقواعد معلوم کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں جن سے قوم اہل علم واہل ملک اور اردو بولنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والوں کو بے حد فائدہ پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔

لیکن ان میں سے کسی کتاب میں فہم قرآن اور ترجمہ وتفسیر وتاویل کے علمی اور عقلی ونقلی ایسے کلی اصول اور عام قوانین بیان نہیں کئے گئے، جیسے کہ احادیث نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے معنی فہمی اور متن وسند علم حدیث کے لئے (علم اصول حدیث) اور (مصطلحات فن اثر میں بیان کئے گئے ہیں احادیث وروایات کے متون واسناد کے بارے میں حضرات محدثین کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ وایانا معہم) نے جو زریں خدمات انجام دی ہیں وہ اسلام میں اور تمام علمی دنیا میں ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، اور گو ان اصول سے تفسیر وتاویل اور فہم وترجمہ قرآن میں بھی مدد لے سکتے ہیں مگر یہ ہر ایک کا کام یا دشما کا منصب نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی اہمیت اور ذمہ داری وہ شخص بخوبی جان سکتا ہے جس کو کبھی ایک زبان سے دوسری زبان میں ادائے مطالب کا اور ایک کلام کو دوسری زبان کے الفاظ وعبارات میں منتقل کرنے اور بدلنے کا موقع ملا ہو، یا کم سے کم اپنی زبان کے کسی نثر یا نظمیہ کلام کو سمجھنے غور کرنے اور پھر اس کی شرح وتفصیل کرنے کی نوبت آئی ہو۔ چونکہ طبیعتیں عام طور پر اختصار کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور اس زمانہ میں تو اس کا عام مذاق اور رواج ہوگیا ہے خاص کر حضرات اہل علم اور عربی علوم کے طلبائے کرام اور دینی تعلیمات حاصل کرنے والوں کو اپنی مادری اور عام ملکی زبان میں سمجھ کر یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے اس لئے ذیل کا مختصر مضمون "مبادی عشرہ" اور "دروس ثمانیہ" کے اسلوب پر قرآن مجید

کے فہم و تدبر اور ترجمہ و تفسیر و تاویل کے بارے میں پیش کیا جاتا ہے۔

مے تند اور حوصلۂ مے گسار بلند ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا!

کِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

علم تفسیر و فنِ تاویل کی تعریف، اور اس کی حقیقت کی توضیح کرنے سے پہلے یہ تبلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر و تاویل سے ہماری مراد خاص وہ علم و فن ہے جو کتاب اللہ یعنی قرآن مجید سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ تو لغوی معنی کے اعتبار سے ہر کلام کی تشریح و توضیح کو تفسیر اور ہر بات کے عقلی طور پر ثبوت و اثبات کو تاویل کہتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کا پاک کلام ہے، اور جس طرح اس کی ذات و صفات و افعال کی کماحقہ حقیقت اور کنہ رسی انسان کے محدود علم و ناقص عقل سے محال و ناممکن ہے اسی طرح اس کے پاک کلام کی حقیقت و ماہیت اور جامع مانع تعریف انسانی الفاظ و عبارت میں بعید و مستبعد ہے ؎

دریا نہ سمائے گا سبو میں پیمانۂ ذوقِ رنگ و بو میں

البتہ مختصر تعارف اور سہولتِ فہم کے لئے سید العارفین سند المحققین حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ کے الفاظ کا خلاصہ و ماحصل ہم نقل کرتے ہیں جس میں اس کی اس طرح تعبیر کی گئی ہے، جو اقرب الی الحقیقت ہی نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچا دینے والی بھی ہے اور حقانیت سے مملو بھی ہے اور جس سے دل و دماغ، عقل و وجدان، ظاہر و باطن، کامل طور پر منور و مستنیر ہو جاتے ہیں۔ اور بصیرت و بصارت کے لئے دائمی و مستقل اور پائندہ روشنی دستیاب ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پاک کلام، اس ذات پاک کا کلام ہے جو اول و آخر اور ظاہر و باطن نور ہی نور ہے، لفظ و عبارت اور معنی و مفہوم دونوں اسی نورانی ذات کے ہیں، دنیا میں کوئی متکلم جو بھی کلام کرتا ہے وہ اس کے باطن اور اندرون سے نکلتا ہے۔ اب جو پاک ذات نور ہی نور ہے اس میں سے جو کلام نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ سراپا نور ہی نور ہو گا۔

محمدؐ نور اور قرآں ملا نور نہ ہو پھر مل کے کیوں نورٌعلیٰ نور

نور اپنی ذات میں خود روشن اور دوسرے کو روشنی دینے والا اور روشن کرنے والا ہوتا ہے۔ یہی صفت اس نورانی ذات کے نورانی کلام کی ہوگی کہ وہ خود بھی روشن ہے اور دنیا کی ہر شئے کو روشن کرنے والا اور روشنی بخشنے والا بھی حضرت شاہ صاحبؒ۔ جیسا کہ خود قرآن مجید میں قرآن کا ایک نام "النور" بتلایا گیا ہے "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهٗ" (پ ۹ س ۷) اور نور بھی کیسا نورِ مبین، روشن، بیّن، بدیہی اور واضح چنانچہ نہایت وضاحت سے فرمایا گیا ہے

یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (پارہ ۶ س ۲)	اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سند آچکی ہے اور واضح روشنی ہم نے اتاری اور نازل کی ہے۔

قرآن مجید کی اس نورانیت اور تنویر کو دیکھو جس نے اوّلاً عرب کے جاہل بدوؤں اور وحشی عربوں کے دلوں، دماغوں اور ارواح وابدان میں علم وحکمت کے نورانی چشمے جاری کر دیئے اور دین وآخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر شعبۂ حیات تمدن وسیاست کے تمام اصول وکلیات، تصوف واخلاق کے جملہ مدارج ومراتب کو سورج اور چاند سے زیادہ روشن الفاظ وآیات میں بیان فرما کر پھر تمام دنیا کو عالمگیر اخوت ومحبت، معاشرۂ انسانی کی اصلاح وہدایت اور انسانی وحدت وتنظیم کی کبھی نہ بجھنے والی ہمہ گیر قوی دائمی اور پرتاثیر روشنی عطا فرمائی ــ

کلامِ پاکِ رحمان است قرآنے کہ من دارم　　سراسر نورِ یزدان است قرآنے کہ من دارم

تمام دنیا چودہ سو برس سے ہمارے اس بیان کی شاہدِ صدق اور ہندوستان کی ہزار بارہ سو سالہ اسلامی تاریخ اس کی مصدق ومؤید ہے۔ یہ نورانی پاک کلام دفتین میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور ہمارے دل ودماغ میں، سینے میں قوتِ حافظہ وریادداشت

ـــــــــــــــ

۱؎ کی یہ تعریف لغوی اعتبار سے چاہے اس کو حقیقی سمجھو یا لفظی اور منطقی اصطلاح میں چاہے اس کو حد کہو یا رسم یہ تعریف خود ذاتِ نبوی کی عطا فرمودہ الفاظ میں ہے عطا فرمودہ نفسِ نفیس ہے۔

میں محفوظ۔ ہماری زبانوں پر جاری اور تمام انسانی زندگی میں۔ پیدائش سے موت تک بلکہ پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد بھی۔ اس کا قانون نافذ اور اس کا حکم وہدایت دائر وساری ہے۔ اگرچہ ہم مسلمانوں نے اس سے محرومی اختیار کی ہوئی ہے اور اس کو چھوڑا ہوا ہے۔ سے

اس چاندنی پہ ہم مہِ تاباں سے دور ہیں دل کی خطا بھی ہے یہ نظر کی خطا بھی ہے

علوم دنیا اور تہذیب و تمدن کے ہر ایک شعبہ پر تہذیب الاخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدن پر سب سے زیادہ جامع مکمل غیر مبدل اور محکم و منضبط اصول اسی کتاب کے ذریعے انسانی افراد و اقوام کو ملے ہیں کہ ان کے بعد پھر کسی اور الہامی یا عقلی ہدایت و تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی خدا کا یہ آخری اور پاک کلام لوح محفوظ سے، جبریل امین اور روح القدس کی وساطت سے نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں وقتاً فوقتاً، حسب موقع وحسب ضرورت نازل ہوا ہے، اس کی منزلوں، سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق اور لسان نبوت سے مسموع و منقول ہے اس کے الفاظ و معانی میں شک و شبہ اور تبدیلی و تغیر کا کوئی امکانی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر ملک و قوم کے انسانوں کے واسطے، علم و عمل کا کامل و مکمل دائمی قانون و دستور ہے۔

علمائے متکلمین، علمائے اصول و فقہ اور علمائے مفسرین نے اپنے اپنے علوم کی حدود میں رہ کر اس کلام الہٰی اور صحیفۂ ربانی کی مختلف الفاظ و عبارات میں مختلف تعریفیں لکھی ہیں۔ یہ تعریفیں باختلاف عبارات و الفاظ ان مذکورہ علوم کے بحث و مقتضا اور موضوع کے مطابق صحیح ہیں، لیکن تعبیرات کے اختلاف سے اصل معبر عنہ، اور محدود و معرّف کی اصل حقیقت میں کوئی اختلاف اور فرق نمایاں نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ وہی متوارث و متواتر، مروج و مشہور، مسموع و منقول اور مستند و مقبول متعارف کلام رہتا ہے جو اس پاک نورانی ذات کا ذاتی و نفسی نورانی کلام ہے کہ جس کے الفاظ بھی خدا کے فرمودہ ہیں سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰی اور معنی و مفہوم بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ؕ (سورۃ قیامہ) یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ہمارے نبی اس قرآن کا حرف حرف تمہارے پاک سینے میں جمع کر دینا، اور تمہاری زبان سے پڑھوانا اور اس کے علوم و معارف کا تمہارے اوپر کھولنا اور تمہاری زبان سے دوسروں تک پہنچانا یہ سب باتیں ہمارے ذمہ ہیں۔

(باقی آئندہ)

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از

(سعید احمد)

(۲)

الحمد کے ترجمہ میں فرماتے ہیں "الحمد" کسی دیوتا کی جے پکارنا یا اس کی تعریفیں کرنا....

... یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ کے نام کی جے پکارو۔ اسی کے نام کو بلند کرو" الخ" اگرچہ موصوف نے صفحہ ۲۷ پر یہ ترجمہ کرنے کے بعد خود صفحہ ۸۷ پر اس لفظ کا ترجمہ وہی کیا ہے جو عام اور متداول ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ" کل حمد اللہ کے لئے ہے جو سب کا بادشاہ ہے" اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں ترجمے لائق مصنف کے نزدیک ایک ہی ہیں یا ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ اگر مفہوم مختلف ہے تو آپ ایک جگہ ایک ترجمہ کرتے ہیں اور دوسری جگہ دوسرا۔ حالانکہ الحمد للہ یہاں بھی ہے اور وہاں بھی ایسی صورت میں کس کو صحیح مانا جائے اور کس کو لغزش قلم کہا جائے اور اگر آپ کے نزدیک دونوں ترجمے متحد المفہوم ہیں تو پھر خواہ مخواہ شاہراہ عام سے عدول کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

علاوہ بریں اس دوسری صورت میں ہم عرض کریں گے کہ (۱) جے ہو خدا کی اور (۲) سب حمد اللہ کے لئے ہے۔ ان دونوں کے مفہوم میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہے۔" جے ذی روح کی بھی ہو سکتی ہے اور غیر ذی روح کی بھی۔ جیسے" جے ہند" اور گاندھی جی کی جے" لیکن حمد چونکہ "الثناء علی الجمیل الاختیاری" یعنی اختیاری اور ارادی افعالِ جمیلہ پر ہی تعریف کرنے کا

نام ہے اس بنا پر ظاہر ہے کہ وہ ذی روح کی اور صاحب مشیت وارادہ کی ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابو سفیان اور اس کے ساتھی "اعل ھبل (جے ہو ھبل کی)" کا نعرہ لگاتے تو انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اکبر یا الحمد للہ پکارتے تھے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ ہے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں

"کسی مشرک کے متعلق یہ کہیں کہ اس نے نہ رسول اللہ کی تصدیق کی نہ نماز پڑھی تو اس میں صلّٰی" کا ترجمہ غلط ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اوّل تو اس وقت صلاۃ کے معنی بھی دوسرے تھے۔ دوم یہ کہ اصطلاحی نماز کی کسی مشرک سے کیسے امید کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس ابتدائی دور میں صلی کے معنیٰ وہی ابتدائی معنی سلام کرنے یا حلم وانکسار و تہذیب سے گفتگو کرنے کے ہوں گے نہ کہ نماز پڑھنے کے" (ص ۶۳)

گذارش یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے اور قرآن مجید کی آیات بھی بتاتی ہیں کہ صلوٰۃ کبھی بغیر رکوع وسجود وقیام وقعود کے نہیں ہوئی۔ نماز کے یہ ارکان صرف اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ کتب قدیمہ یعنی تورات، زبور اور انجیل میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ تدریجی نزول جو کچھ ہے وہ صرف اوقات سے متعلق ہے۔ مکہ کے شروع سالوں میں صرف رات میں نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ پھر مسلمانوں کو جتنی آزادی اور قوت حاصل ہوتی رہی اسی کے مطابق نماز کے اوقات میں اضافہ ہوتا رہا۔ صلوٰۃ کے معنیٰ اگرچہ دعا، وسلام کے اور درود بھیجنے کے آتے ہیں۔ جیسے اِنَّ اللہَ وَمَلٰئِکتَہ یصلون علی النبی یاایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما میں، لیکن جس صلوٰۃ کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ کبھی بھی محض سلام کرنے یا حلم وانکسار و تہذیب سے گفتگو کرنے کے معنی میں مستعمل نہیں ہوئی۔ رہی دوسری وجہ یعنی یہ کہ مشرک نے جب تصدیق ہی نہیں کی تو اصطلاحی نماز کا مکلف کیسے ہوگا؟ تو بات یہ ہے کہ یہاں ولا صلی کا عطف فلا صدق پر عطف المسبب علی السبب ہے۔ اور یہ عام بول چال اور محاورات میں شائع ذائع ہے۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ کتاب سے متعلق ضمنی اور جزوی گفتگو تھی۔ اصل چیز جس کی طرف کتاب رہنمائی کرتی ہے اور جو اس کا خاص موضوع و مقصد تالیف معلوم ہوتا ہے اور جو اس کتاب کا سب سے زیادہ خطرناک اور گمراہ کن پہلو ہے وہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک اسلام کی حقیقت صرف یہ ہے کہ دوسری قومیں جن میں سے ہر ایک کے پاس پیغمبر آئے کچھ بغیر کتاب کے اور کچھ کتاب الٰہی لے کر وہ پروہتوں۔ پجاریوں۔ اور احبار و رہبانین کے زیر اثر آ کر اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات کو بھول چکے تھے اور بجائے خدا پرستی کے مختلف طاقتوں اور قوتوں کی پوجا کرنے لگے تھے اسلام نے آ کر صرف یہ کیا کہ ان قوموں کو ان کی مذہبی تعلیمات یاد دلائیں اور ان سے ایک ہی مطالبہ کیا کہ تم اپنے مذہب کے سچے پیرو بنو اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خدا پرستی کرو اور نیک کام کرو۔ جناب خاں صاحب کے نزدیک اسلام کا صرف یہی ایک مشن تھا اور بس! اپنے اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسلامی عبادات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا ان کی نہ کوئی خاص اہمیت ہے اور نہ ضرورت، چنانچہ نعبد کا ترجمہ بتاتے ہوئے صاف صاف لکھتے ہیں کہ "ہم دوسروں کے عبد نہیں۔ صرف تیرے عبد۔ بندے رب کے یا آقا کے ہوئے ہیں" پھر قوسین میں اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "مقصد عبودیت کا اظہار ہے نہ کہ عبادت (پوجا و قربانی)" اس کے بعد لکھتے ہیں "اس کے علاوہ جمع کا صیغہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندگی جماعتی ہو۔ انفرادی نہ ہو" (ص ۴۷) علاوہ بریں نماز اور روزہ کی جو حقیقت موصوف نے بیان کی ہے اس کا ذکر گذشتہ شمارہ میں آچکا ہے۔

(۲) سورۃ الحمد میں منعم علیہم اور مغضوب علیہم کا ذکر ہے۔ اور خود قرآن مجید کے بھی بیان کے مطابق منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو احکام خداوندی کا اتباع کرتے ہیں خواہ دنیوی

اعتبار سے وہ کیسے ہی غریب ، مفلس اور قلاش ہوں ۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو لوگ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری
مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ	کرتے ہیں یہ بھی وہی ہیں جو ان لوگوں کے
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے جیسے نبی
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۔	صدیق ، شہداء ، اور صالحین یہ کتنے اچھے رفیق ہیں

اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ میں جن منعم علیہم کا ذکر ہے وہ احکام خداوندی پر ظاہراً و باطناً عمل کرنے والے لوگ ہیں ۔ اس سے ہرگز بحث نہیں کہ دنیوی اعتبار سے ان کی حالت کیا ہے ؛

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مغضوب علیہم اور ضالین کون لوگ ہیں ؟ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کا راستہ صراط مستقیم ہے جو سراپا اعتدال ہے ۔ اس کے برخلاف جو راستہ ہوگا (جیسا کہ علم الاخلاق سے واضح اور ثابت ہے) وہ دو قسم کا ہوگا ایک تفریط کا اور دوسرا افراط کا ۔ تفریط یعنی سستی ، بے پروائی ، بے اعتنائی اور عدم توجہ کا راستہ اختیار کرنے والوں پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور افراط یعنی بے جا غلو در غیر ضروری انہماک و تجاوز عن الحد کے راستے پر چلنے والے گمراہ ہوں گے ، مفسرین نے اسی بناء پر مغضوب علیہم سے مراد یہود لیے ہیں کہ وہ تفریط میں مبتلا تھے اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن تعطیل منانے اور اس روز کسی کام کے نہ کرنے کو ہی سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے ۔ اور ان کے برعکس نصاریٰ تھے جنہوں نے راہبانہ زندگی کو عبادت کا لازمی جزء بنا کر خواہ مخواہ اپنے اوپر تشدد کیا تھا ۔ چنانچہ قرآن کو تنبیہ کرنا پڑا لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ [1]

بہر حال تقریر بالا سے یہ ظاہر ہے کہ اللہ کا انعام ، غضب اور ضالین کا ضلال جو کچھ بھی ہے وہ احکام الٰہی کا اتباع اور عدم اتباع ہے ۔ اگرچہ خدا نے جیسا کہ وعدہ کیا ہے پہلے طبقہ کو

---

[1] راقم الحروف کے نزدیک یہود و نصاریٰ کے ساتھ مغضوب علیہم اور ضالین کی تخصیص صحیح نہیں اس کا مصداق ان لوگوں کا ہر وہ طبقہ ہے جو احکام خداوندی کے اتباع میں افراط و تفریط سے کام لیتا ہے ، خواہ یہ لوگ مذہبی قومیت کے اعتبار سے یہود ہوں ۔ یا نصاریٰ ، مجوسی ہوں یا خود مسلمان ! مسلمانوں کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک مغضوب اور ضال یہود اور نصاریٰ ہی (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

دنیوی انعامات بھی ملیں گے اور دوسرا اور تیسرا طبقہ ان سے محروم ہوگا خواہ جلد ہو یا بدیر لیکن بہرحال دنیوی انعام صرف ایک ثمرہ ہے اصل مقصد نہیں۔ دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی جو لوگ احکام خداوندی کا اتباع صدق دل سے کریں گے ان کو دنیوی انعامات یعنی اقتدار۔ معاشی رفاہیت اور صحت وتندرستی ضرور ملیں گے۔ لیکن جو دنیوی نعم کے مالک ہوں ضروری نہیں کہ وہ قرآن کی اصطلاح میں منعم علیہم بھی ہوں۔ لیکن پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کے نزدیک چونکہ رضاء وعدم رضائے الٰہی کا معیار ہی دنیوی نعمتیں ہیں اس لئے "اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" کے ترجمہ میں بھی انھوں نے قرآن کی عام مراد کے برخلاف یہ ہی جرأت کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"دنیوی انعامات والی قومیں جو اہل کتاب (یعنی مہذب) اور قانونی زندگی بسر کرتی ہیں۔ دنیا میں فساد کی جگہ ترقی اور امن کی علمبردار ہیں اللہ کے اس قانون کی پابند ہیں کہ سب انسان برابر ہیں اور بھائی بھائی ہیں لہٰذا نہ ایک دوسرے کو لوٹتی ہیں۔ نہ خود غرضی سے کسی کی زندگی تلخ کرتی ہیں:"

(۳) شریعت اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اسلام ایک کامل ومکمل مذہب ہے بے شبہ اس کی بنیاد بھی دوسرے مذاہب کی طرح خدا پرستی اور اعمال صالحہ پر ہے۔ لیکن اسلام اس بارہ میں گول مول باتیں نہیں کرتا بلکہ صاف صاف بتاتا ہے کہ خدا پرستی کا مطلب کیا ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اعمال صالحہ کون کون سے اعمال ہیں؟ ان کی شکلیں اور صورتیں کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں اسلام ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور مکمل نظام پیش کرتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں حالانکہ پوری تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمان کہلانے والوں پر بھی کتنی مرتبہ اللہ کا غضب نازل ہوا ہے اور کتنی مرتبہ وہ ضال بن گئے ہیں۔ آخرت میں جو کچھ معاملہ ہوا سے تو خدا ہی جانتا ہے لیکن دنیوی زندگی میں غضب الٰہی اور ضلال کے جو مظاہر ہیں مسلمان بھی احکام الٰہی میں افراط وتفریط کے باعث ان سے محفوظ نہیں رہے اور کتاب الٰہی کی عالمگیری کا تقاضا بھی یہی ہے

پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی حاوی ہے اسلام انھیں تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے اگر آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو اس نظام کو من حیث الکل قبول کرنا ہوگا۔ اس بات کی اجازت ہرگز نہیں ہوگی کہ آپ بنو اسرائیل کی طرح "نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ" کہیں۔ اور اس مجموعہ کے بعض جز کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اس بنا پر اسلام درحقیقت نام ہے فکر و عمل کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے کا۔ اور ایک نہایت مرتب۔ منظم اور متوازن و ہموار زندگی بسر کرنے کا۔ لیکن ہمارے فاضل دوست کے نزدیک اسلام کیا ہے؟ ذرا خود ان کی زبانی سنیئے! غزوۂ احد سے متعلق آیت قرآنی نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں (۱) کیا اسلام کی تعلیم احد سے پہلے ختم ہو چکی تھی؟ اور (۲) کیا یہ تعلیم وہی تھی جو پہلے رسول دے چکے تھے؟ لیکن یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ دشمنان رسول نے آپ کو ہجرت سے پہلے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی تو کیا اسلام ہجرت سے پہلے آ چکا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک آ چکا تھا۔ ہجرت سے پہلے ہی نہیں بلکہ شعب ابی طالب میں ۷ھ سے پہلے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آنحضرتؐ کے ذریعے جو اسلام دنیا میں آیا وہ غار حرا کی پہلی وحی میں آ چکا تھا اور آنحضرتؐ نے بعد کے زمانے میں مختلف قوموں سے اس کی تشریحیں کیں۔ ورنہ پیغام یہی تھا کہ اللہ کو مانو اور غیر اللہ کے آگے نہ جھکو۔ وہی خالق ہے وہی آقا ہے۔ وہی علیم ہے۔ شیطان یا شیطان کے بندوں کو نہ تو کسی طرح کا خدائی علم ہے نہ وہ خدا کی طرح خالق ہے۔ پورا قرآن اسی پیغام کی تشریح ہے (ص ۳۳-۳۴)

اتنا لکھنے کے بعد خاں صاحب کو خود اس کا احساس ہوا کہ اگر ان کی تحریر کے مطابق اسلام واقعی غار حرا کی پہلی وحی میں ہی آ چکا تھا تو پھر قرآن مجید کی آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" جو سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے اس کا کیا مطلب ہوگا؟ اس سوال کا جواب خود ہی دیتے ہیں ظاہر ہے کہ "لکم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین قدیم یعنی اسلام کے نئے ماننے والے تھے ورنہ دوسری قوموں میں رسول آ چکے ہیں ان کے لئے وہی تعلیم کافی تھی اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم ہے کہ پرانے نبیوں کی تعلیمات پر قرآن کی روشنی میں تحریفوں سے پاک کر کے عمل کرو گویا پہلی وحی کے بعد آنحضرتؐ کی وفات ہو جاتی تو ہم دینی معاملات میں پرانی اللہ کی کتابوں سے ہدایت لیتے یہی حکم یہود کو دیا گیا کہ توراۃ کے مطابق حکم کرو........ اسی طرح ہر کتابی کو حکم ہے کہ اللہ کو ان کی اپنی کتاب پر عمل کرے اور خود آنحضرتؐ کو یہی حکم دیا گیا کہ خدا پرستی کے دین قدیم پر عمل کریں "ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" یعنی اصل تعلیم قرآن خدا پرستی ہے اور اسی لئے اہل کتاب کو توحید کلمہ کی دعوت دی تھی۔

(باقی آئندہ)

حالاتِ حاضرہ

از

(اسرار احمد صاحب آزاد)

کوریا کی جنگ کوریا کی جنگ کا معاملہ اس وقت نازک ترین بین اقوامی مسئلہ بنا ہوا ہے گذشتہ ماہ اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس مسئلہ کے طے ہونے کی توقع بھی پیدا ہو گئی تھی لیکن اول تو جنوبی کوریا کے صدر ڈاکٹر ری نے معاہدہ کے خلاف کم و بیش ۲۷ ہزار اسیرانِ جنگ کو رہا کر دیا دوسرے ان کی طرف سے صلح کی ہر کوشش کی مخالفت شروع کر دی گئی اور اس طرح اس تنازعہ اور تصادم کو ختم کرنے کی تمام کوششیں بے سود اور بے اثر ہو کر رہ گئیں۔ اور اب ڈاکٹر صلح کی حمایت پر آمادہ ہو گئے ہیں اور امید ہے کہ عنقریب یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس وقت تک سنگ مان ری کے رویہ پر غور کرنے کے لئے ادارہ اقوام متحدہ کی مجلس عمومی یا مجلس تحفظ کا کوئی اجلاس طلب یا منعقد نہیں کیا گیا اور اس نازک ترین بین اقوامی معاملہ کو صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ ہی پر چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ یہ جنگ ادارہ اقوام متحدہ اور شمالی کوریا کی جنگ تھی اور اس معاملہ میں ڈاکٹر ری نے جو کچھ کیا ہے اسے ادارہ اقوام متحدہ کے اثر و اقتدار پر ایک ضرب تصور کیا جاتا ہے بہرحال جنگ کے ختم ہونے کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہے گا۔ سنگ مان ری کے معاندانہ اعلانات اور غیر مصالحانہ طرزِ عمل کے سلسلہ میں ادارہ اقوام متحدہ خاموش کیوں رہا اور اس تصفیہ کے تمام اختیارات ایک ایسی حکومت کو کیوں سپرد کر دیئے گئے جسکو کوریا کی جنگ کے سلسلہ میں قطعاً جانبدار تصور کیا جاتا ہے۔

اُردو!

اردو کو یو۔پی میں علاقائی زبان قرار دلانے کے سلسلہ میں جو کوششیں کی جارہی ہیں، یو۔پی کانگرس کمیٹی نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی ہے حتیٰ کہ اس نے یو۔پی کے لئے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد کو بھی غیر ضروری قرار دیا ہے جو اس نے علاقائی زبانوں میں اردو کو اس کا جائز مقام دئے جانے کے متعلق منظور کی تھی۔

ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان کو جو مقام حاصل ہے یہاں اسے واضح کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر اردو کو علاقائی زبان قرار دلانے کے حامی اپنی کوششوں میں مصروف رہے تو ہمیں ان کی کامیابی میں کوئی شبہ بھی نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے ملک کی ایک ہمہ گیر اور عوامی زبان کی ترویج اور ترقی کی مخالفت کررہے ہیں کانگرس میں رہنے یا کانگریسی کہلانے کے مستحق ہیں اور کیا ان کی سیاسی بصیرت اور قیادت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

اردو زبان ملک کی مشترکہ زبان ہے لیکن بدقسمتی سے بعض حلقے اسے صرف مسلمانوں کی زبان تصور کرتے ہیں اور اس کی بقا کی راہ میں جو دشواریاں پیدا کی جارہی ہیں وہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھ کر کی جارہی ہیں لیکن متعصب قوم پروروں کے اس طرزِ عمل سے اردو کے حامیوں کو مشتعل یا پست ہمت ہونے کی بجائے اپنی مساعی کو جاری رکھنا چاہئے اور اس بات کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ جدوجہد کی آخری منازل میں حریف بھی اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کردیا کرتا ہے اور حریف کی یہ شدید ترین مخالفت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ہم کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

ادبیات

غزل

جناب الم مظفر نگری

حجابِ نور و ظلمت میں رہے پرتو فگن ہم بھی
کبھی تھے شامِ غربت اور کبھی صبحِ وطن ہم بھی

نہ رکھیں کیوں غمِ ہستی سے ربطِ حسنِ ظن ہم بھی
ازل سے ہیں رہینِ گردشِ چرخِ کہن ہم بھی

کہے جاتے تھے اک دن زینتِ بزمِ وطن ہم بھی
چمن میں تھے شریکِ نغمہ سنجانِ چمن ہم بھی

قفس کی شام سے کرتا ہے جو صبحِ چمن پیدا
اسیری میں لئے بیٹھے ہیں وہ دیوانہ پن ہم بھی

سرِ منزل پہنچ کر یہ حقیقت کھل گئی آخر
رہے خود زندگی کی رہ میں اپنے راہزن ہم بھی

برنگِ بوئے گل موجِ نفس اڑتی ہے ہر لحظہ
چمن میں کر رہے ہیں مشقِ پروازِ چمن ہم بھی

نمودِ ماسوا کو کہہ رہا ہے پردۂ جلوہ
حرم والو سمجھتے ہیں مذاقِ برہمن ہم بھی

ہمیں شوخیٔ ہر جلوہ سے کیوں ہوتی نہ آگاہی
میانِ انجمن تھے نکتہ دانِ انجمن ہم بھی

ہر اک ذرہ انا الحق کہہ اٹھا خاکسترِ دل کا
جگا بیٹھے پھر اک ہنگامۂ دار و رسن ہم بھی

کریں تجزیۂ خاکِ شمع و پروانہ کا محفل میں
ذرا دیکھیں تو اسبابِ شکستِ انجمن ہم بھی

نئے آئینوں میں عکسِ قدامت دیکھ لیتے ہیں
بالآخر ہیں تو دانائے روایاتِ کہن ہم بھی

حضورِ شمعِ محفل کیوں نہ جلتے کیوں نہ مٹ جاتے
پتنگے کی طرح تھے سرفروشِ انجمن ہم بھی۔

خدا رکھے امانت دار ہے خونِ شہیداں کی
سمجھتے ہیں مقامِ عظمتِ خاکِ چمن ہم بھی

الم ماتم کرے گا کون بربادیٔ گلشن کا
اگر ہو جائیں نذرِ انقلاباتِ زمن ہم بھی

غزل

از

(جناب عتیق انجمی مالیگانوی)

مرنے کے لئے تو جیتے ہیں، جینے کے لئے مر جائیں گے
آغاز ہمیں شرماتا ہے انجام کو ہم شرمائیں گے

یہ علم ہے کیا نیت ہوگی، یہ ہوش ہے کیا فرمائیں گے
وہ آئیں تو تجھ کو سمجھانے، سمجھونگا جو کچھ سمجھائیں گے

آغاز میں پردہ ہوتا ہے، انجام میں کیا شرمائیں گے
اے ڈھونڈنے والے فکر نہ کر وہ سامنے آ ہی جائیں گے

اس رازِ تغیر کا شاید، صیاد کو اب تک علم نہیں
تنکے ہی نشیمن بنتے ہیں، تنکے ہی قفس بن جائیں گے

کیوں بزمِ طرب سے اُٹھ جائیں، کیوں ذوقِ نظر کو ٹھکرائیں
الزام ہمیں پر آتے ہیں، الزام ہمیں پر آئیں گے

موجوں کے تھپیڑے سہنے دو، نظارۂ ساحل رہنے دو
جس رو میں بہیں ہم بہنے دو، ڈوبے تو اُبھر بھی آئیں گے

موجوں کی سیاست کچھ بھی سہی، احساس کر، مایوس نہ ہو
اے ڈوبنے والے آہ تو دے، طوفان گذر ہی جائیں گے

اے ذوقِ نشیمن گلشن سے، کچھ دور ہی رہنا اچھا ہے
پھولوں کی تباہی کے بدلے، کانٹوں سے نکالے جائیں گے

آدابِ قفس کی عظمت ہے، دنیا کو عتیق آگاہ کرو
اربابِ چمن کا شکوہ کیا، یہ راہ پہ آ ہی جائیں گے

شئونِ علمیہ

تخلیق حیات

دیوہیکل برقیائی (الکٹرانک) مشینوں کی تیاری میں جو سائنس داں مصروف ہیں وہ ایک زبردست اختلافی مسئلے پر بحث کر رہے ہیں وہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا یہ سائنس داں زندگی کو اپنی سادہ ترین شکل میں پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بمقام کینبرا آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی میں یا راچسٹر (امریکہ) میں جو مشینیں سائیکلوٹرون (Cyclotron) کے نام سے تیار کی گئی ہیں وہ برقی ذروں کے ایسے دھارے پیدا کر سکتی ہیں جن میں ۲ ہزار ملین (۲ ارب) وولٹ کی برقی توانائی ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ طاقتور مشینیں بھی زیر تیاری ہیں۔ چنانچہ بروک ہیون (امریکہ) میں جون ۱۹۵۲ء میں ایک میسوٹرون (Mesotron) تیار کیا گیا ہے جس میں ۳ ارب وولٹ کی برقی توانائی پیدا ہو سکتی ہے۔ انگلستان کی برمنگھم یونیورسٹی میں اس سے بھی زیادہ توانائی پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

ان سائنس دانوں کے اس اعلان سے ایک تہلکہ سا مچ گیا کہ انہوں نے دو نامیاتی کیمیائی اشیاء کی "تخلیق" کی ہے۔ یہ اشیاء فارمک ایسڈ (چیونٹی وغیرہ کا زہر) اور فارملڈیہائڈ ہیں۔ پیدا کرنے کی صورت یہ تھی کہ ایسے پانی میں جس میں کاربن ڈائی آکسائڈ حل تھی انہوں نے ہیلیم کے باردار ذرات کا ایک دھارا گزار دیا۔

یہ دونوں اشیاء بے جان ہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طاقتور ترین بوچھاڑ سے کیا ان اشیاء کو زندگی کی ادنیٰ ترین شکل میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا؟

اس عمل سے مصنوعی طور پر کوئی شعاعیں (کاسمک ریز) پیدا ہو جاتی ہیں جو زندگی پر پراسرار طریقہ پر عمل کرتی ہیں۔ جو مرکبات پیدا ہوتے ہیں وہ جیلی نما یا تخم مایہ (پروٹوپلازم) کی طرح ہوتے ہیں۔ زندگی کی اساس یہی تخم مایہ سمجھا جاتا ہے۔

سائنس دانوں کو ایک عرصہ سے یہ معلوم ہے کہ غیر نامیاتی (ان آرگینک) مادے اور خود زندگی بنتی زندہ ذرات میں ایک حد فاصل ہے۔ ویرس (V i r u s) بھی ایسے ذرات میں شامل ہے اس کی قلمیں بن سکتی ہیں یا اس سے پیچیدہ آیوڈائڈ مرکبات بن سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی "معلق" ہو جاتی ہے۔

اگر آیوڈائڈ کو دور کر دیا جائے تو ایک خلیہ والے یہ ویرس پھر اپنی طبعی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنا تکثر اور تغذیہ اس طرح شروع کر دیتے ہیں جیسے کسی حادثہ کا وقوع ہوا ہی نہیں قدرتی کوئی شعاعیں اس تحول کو نہیں پیدا کر سکتیں لیکن مصنوعی کوئی شعاعیں زبردست دباؤ کے تحت یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہیں۔ ماہرین طبعیات کا یہی کہنا ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۵۰ ملین (۵ کروڑ) برس سے دنیائے حشرات میں ترقی نہیں ہوئی ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی شعاعوں کا ہاتھ ہو۔

زندگی کی گتھی کو شاید جوہر پاش (ایٹم اسمیشر) حل کر سکیں اور انسانی ادنیٰ ترین شکل زندگی کی تخلیق کر سکے گو انسان کو اس طرح وجود میں لانے کا کوئی امکان نہیں۔

بہر حال جوہر پاش نے ایک سنسنی پیدا کر دی ہے خواہ دنیا اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

صفر مطلق پانی جس تپش (ٹمپریچر) پر جمتا ہے وہ صفر درجہ کہلاتی ہے اور جس پر پانی جوش کھاتا ہے وہ ۱۰۰ درجہ کہلاتی ہے۔ یہ ایک پیمانہ کے درجے ہیں جو سنٹی گریڈ (سنٹی گرڈ) کہلاتا ہے۔ ایک دوسرا پیمانہ ہے جس سے بخار بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس پیمانے کو فارن ہائٹ پیمانہ کہا جاتا ہے اس پر پانی کا نقطۂ انجماد ۳۲ درجہ ہوتا ہے اور نقطۂ جوش ۲۱۲ درجہ

برف کو ہم سرد کہتے ہیں لیکن اس سے بھی سرد تر چیزیں موجود ہیں چنانچہ برف میں نمک ملا دینے سے تپش اور بھی پست ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم تپش کو پست تر کرتے چلے جائیں تو ایک تپش ایسی ہوگی کہ اس سے پست تر کوئی تپش نہ ہوگی یعنی یہ سردی کا انتہائی نقطہ ہوگا۔ اس نقطہ یا تپش کو صفر مطلق کہتے ہیں۔ سنٹی گریڈ پیمانہ پر یہ ۲۷۳ درجہ نقطہ انجماد سے پست تر ہے اور فارن ہائٹ پیمانہ پر یہ ۴۵۹۶۶ درجہ ہے۔

اس پست ترین تپش پر پہنچنے کے لئے سائنس داں انتہائی جوٹی کا زور لگا رہے ہیں وہ اس تپش کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن ٹھیک اس تپش تک ابھی نہیں پہنچے ہیں۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ۵ ٹن کا ایک مقناطیس بنایا جو ۱۲ ٹن کی قوت پیدا کر سکتا ہے اس دیو ہیکل مقناطیس کے ذریعہ مادے سے ساری حرارت کھینچ لینے کا کام لیا گیا۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ صفر مطلق تک پہنچنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس تپش پر مادہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس کا مطالعہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے ہم کو بظاہر لوہے کا ایک کندہ بہت ٹھوس معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے ذرات ہر دم حرکت میں ہیں۔ برقیے (الکٹران) جوہروں میں رقص کرتے ہیں۔ جوہر سالموں ([illegible]) میں اور سالمے فضا محیط میں رقصاں ہوتے ہیں۔ جتنی تپش زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی یہ رقص تیز تر ہوتا ہے بالآخر ایسی تپش آجاتی ہے کہ جوہروں کی حرکت اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ نکل بھاگتے ہیں اسی کا نام شے کا پگھلنا ہے اگر اور حرارت پہنچائی جائے تو پھر شے گیس بن جاتی ہے۔

بالعکس اگر تپش کم کر دی جائے تو رقص سست ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر جوہر سکون میں ہو تو اس کا مطالعہ آسان تر ہوگا لیکن اگر درحقیقت پہنچ کر مادے کو بالکلیہ جامد کر دیا جائے تو شاید وہ اپنے اسرار بیان کر دے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسرار کیا ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ذرہ سکون محض میں ہوگا جس کو ابھی تک انسان نے مشاہدہ نہیں کیا ہے۔

اس تگ و دو میں سائنس دانوں کو کئی چیزیں ہاتھ لگی ہیں۔ ایک تو "خشک برف" ہے جو درحقیقت منجمد کاربن ڈائی آکسائڈ ہے۔ غذا کو محفوظ رکھنے میں اس کا نمایاں حصہ ہے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور بعض نادر گیسوں کی تجرید ممکن ہو گئی۔

ابھی تک سائنس داں صفر مطلق تک پہنچے نہیں ہیں لیکن ان کی کوششیں جاری ہیں۔ اگر کامیابی ہو گئی تو ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوگا کیونکہ وہاں سکون محض ہوگا۔

تبصرے

اسلام اور جنسیات

از بدر شکیب (عثمانیہ) تقطیع اوسط۔ ضخامت ۳۶۸ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر، قیمت پانچ روپے ناشر پاک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس ۱۶۳۴ کراچی ۱/

موجودہ دور میں جنسی مسئلوں کو عوام و خواص میں جو اہمیت حاصل ہے، یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں، روشن خیال اور جدید تہذیب کے دلدادہ حضرات کی ایک بڑی جماعت ہے جو رات دن ان مسئلوں کو چھیڑتی رہتی ہے، اور جنسیات کے پروپگنڈا میں مصروف رہتی ہے، آپ جس مجلس میں بیٹھ جائیے، اور خموشی سے سنئے تو معلوم ہو، دنیا میں بس دو ہی چیزیں ہیں، ان کے علاوہ کوئی چیز لائق توجہ ہے ہی نہیں، ایک پیٹ، دوسرے جنسی مسائل، اس لئے ضرورت تھی کہ اسلام نے جو کچھ جنسیات و معاشیات کے سلسلہ میں تعلیم دی ہے، اسے تفصیل سے قوم و ملک کے سامنے پیش کیا جائے، اسلامی معاشیات پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جنسیات پر البتہ لکھنے کی گنجایش تھی، بلا شبہ اس سے پہلے بھی متعدد بزرگوں نے جنسی مسئلوں پر دوسرے عنوان سے بہت کچھ لکھا ہے مگر مؤلف "اسلام اور جنسیات" مستحق شکریہ ہیں کہ انھوں نے اس مسئلہ پر کھل کر گفتگو کی ہے، اور اپنی کتاب کو پاکستان کے مرکزی شہر کراچی سے شائع کیا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ دوسرا پیرس بنتا جا رہا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس شہر کو مسلمانوں کی مرکزیت حاصل ہے جو سرمایہ دار اور جدید تہذیب کے دلدادہ ہیں۔

زیر نظر کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت متعدد ضمنی عنوانات ہیں مؤلف نے ہر باب پر بڑی سنجیدگی سے لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت سلجھا ہوا ہے، پڑھنے

والوں کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا، اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر مسئلہ کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے اور مغربی تمدن اور اس کے جو اثرات ہیں اسے انگریز مصنفین کے حوالہ سے درج کیا ہے اور ہر باب کے آخر میں اسلامی تعلیمات کا نچوڑ پیش کرنے کی سعی کی ہے اور بتایا ہے کہ جنسیات کے مسائل میں اسلام نے کتنی زبردست اصلاح کی ہے اور اس سلسلہ میں جو قوانین اور دستور وضع کئے ہیں، وہ کتنے مفید، درست اور محکم ہیں، اور عقل و فطرت کے مطابق ہیں ان عنوانات سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنس اور زندگی، جنس اور مذہب، جنس اور تمدن، جنس اور اسلام، شرم و حیا کے تصورات، پردہ، مرد کی عورت پر فوقیت، رہبانیت، زناکاری، استلذاذ بالمثل، ازدواج، وحدت ازدواج، طلاق و خلع، ضبط تولید، متفرق مسائل۔

ان خوبیوں کے ساتھ کتاب میں چند خامیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں احادیث کے جو ترجمے نقل کئے گئے ہیں ان کے حوالے باضابطہ درج نہیں، اسی طرح جو بعض فقہی مسئلے نقل کئے گئے ہیں اور ان کا حوالہ درج نہیں کیا گیا ہے، اگر معتبر و مستند کتابوں کے باضابطہ حوالے درج ہوتے تو کتاب کی اہمیت دو چند ہو جاتی،

کتاب میں کہیں کہیں کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں مگر اس سے پاک ہونا آج کل کسی کتاب کا ناممکن ہے۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہے، وہ پردہ کی بحث کا آخری حصہ ہے جس میں مؤلف پاکستانی فضا سے متاثر معلوم ہوتے ہیں پردہ کی بحث کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ احکام تو زمانۂ امن کے ہیں، لیکن جب قوم و ملک کو کسی غیر معمولی صورت حال سے سابقہ پڑے قومی عزت و ناموس کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ اپنی وحدت و سالمیت کو برقرار رکھنے، اور اپنی سرحدوں کو دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھنے اور جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے کی ضرورت درپیش ہو، تو پردے کے مذکورہ بالا احکام پر عمل کرنا، ناممکن ہے اور نہ ان کی پابندی کا لزوم ہے

ایسی صورتوں میں عورتیں میدانِ جنگ میں مرد کے دوش بدوش دشمن کا مقابلہ بھی کر سکتی ہیں۔" الخ (صفحہ ۱۵۵ صفحہ ۱۵۶)

مؤلف نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے اور اس شدومد سے اسے پیش کیا ہے، مگر اس سلسلہ میں جو دلیل پیش کی ہے وہ صرف اس قدر۔

"چنانچہ غزواتِ نبوی میں عورتوں کی شرکت اور جنگی خدمات کی ادائی سے صاف ظاہر ہے، کہ ایسے موقعوں پر پردے کی شرائط سے صرفِ نظر کیا گیا ہے" (صفحہ ۱۵۶)

افسوس ہے کہ فاضل مؤلف نے جو کچھ بھی دلیل دی ہے، اس کا کسی معتبر کتاب سے حوالہ درج نہیں کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے۔

غزوات کی شرکت سے یہ بات ہرگز لازم نہیں آتی۔ کہ عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں لڑنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہو، جن حدیثوں کی بنیاد پر عورتوں کی شرکت غزوات نبوی میں مشہور ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفرار رضہ سے روایت ہے۔

قالت کنا نغزو مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونسقی القوم ونخدمھم ونرد القتلی والجرحیٰ الی المدینۃ (بخاری باب ھل یداوی الرجل المرأۃ والمرأۃ الرجل)	ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں جاتیں، قوم کو پانی پلاتیں ان کی خدمت کرتیں اور مقتولین یا زخمیوں کو مدینہ کی طرف منتقل کرتی تھیں۔

دوسری حدیث حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے، ان کا بیان ہے

غزوت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبع غزوات اخلفھم فی رحالھم فاصنع لھم الطعام واداوی الجرحیٰ واقوم علی المرضیٰ لمسلم (جمع الفوائد ص ۲۶ ج ۹)	میں رسول اکرم صلعم کے ساتھ سات غزوات میں گئی، میں کیمپوں، (کجاؤں) میں رہتی، میدانِ جنگ سے پیچھے ہوتی چنانچہ میں ان (مجاہدین) کے لئے کھانا تیار کرتی، زخمیوں کو دوا دیتی اور بیماروں کی دیکھ بھال کرتی۔

یہ دونوں صحیحین کی روایتیں ہیں، الفاظ آپ کے سامنے ہیں، بغور بار بار پڑھئے اور دیکھئے ان حدیثوں سے کس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ عہد نبوی میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش لڑتی تھیں، پہلی حدیث میں عورتوں کی خدمات کا تذکرہ جن لفظوں کے ساتھ ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات سمجھی جاسکتی ہے وہ یہ کہ عورتیں پانی پلانے کا نظم اور مقتولین یا زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام کرتی تھیں۔

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

وانما لم نجزم بالحکم لاحتمال ان یکون	ہم یقین کے ساتھ عام حکم نہیں کرسکتے ہیں کیونکہ
ذالک قبل الحجاب او کانت المرأۃ	احتمال ہے کہ یہ خدمات حجاب سے پہلے کی ہوں،
تصنع ذالک ممن یکون زوجہا	یا عورت یہ خدمت ان لوگوں کی کرتی ہو جو ان کے
لہا او محرما (فتح الباری پ ۲۵ ص ۲۸۶)	شوہر اور محارم ہوں۔

حجاب کا حکم غالباً ۵ھ کا واقعہ ہے اور یہ مسلّم ہے کہ اس سے پہلے بھی غزوات ہوئے ہیں اور اہم غزوات ہوتے ہیں اس لئے جو احتمال پیش کیا گیا ہے، اس کے درست ہونے میں شبہ نہیں ہے، اور دوسرا احتمال بھی قوی ہے کہ عورتیں ان لوگوں کی خدمات انجام دیتی ہوں جو ان کے اپنے لوگ ہوں، جیسے شوہر، بھائی، باپ، چچا وغیرہ وغیرہ کیونکہ غزوات میں ایک ایک خاندان کے سیکڑوں آدمی شریک ہوتے تھے۔

یہ بحث تو پہلی حدیث کے پیش نظر ہے، دوسری حدیث جو مسلم کی ہے، وہ بہت واضح ہے اور کہا جاسکتا ہے پہلی حدیث کی شرح ہی ہے۔

اس دوسری روایت میں وضاحت ہے کہ عورتیں مجاہدین کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں جاتی تھیں، بلکہ یہ مجاہدین سے علیحدہ کیمپ میں رہتی تھیں، اور ان کا کام کھانا پکانا، مریضوں اور زخمیوں کو دوا دینا اور ان کی دیکھ بھال کرنا تھا، اور ان کاموں کے لئے پردہ کے مذکورہ احکام پر عمل کے ناممکن ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، کھانا پکانے میں پردہ کے احکام نہیں ٹوٹ سکتے، دوائیں

بھی پردہ کے احکام پر عامل ہونے کے ساتھ دی جا سکتی ہیں، دیکھ بھال بھی ہو سکتی ہے، ہر مریض اور زخمی کے پاس صراحی میں پانی ڈال دینا، کھانا پکا کر پہنچا دینا یا اس طرح کے دوسرے کام کرنا، یہ ایسے امور نہیں ہیں جن کی وجہ سے عورت کو شرعی پردہ سے باہر آنا پڑے، پھر اس وقت اور بھی جب کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ضرورت مجبور کر دے، تو عورتیں اجنبی مردوں کا علاج کر سکتی ہیں اور بقدر ضرورت دیکھ بھی سکتی ہیں اور چھو بھی سکتی ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے پہلی حدیث کے ضمن میں لکھا ہے

واما حکم المسئلۃ فتجوز مداواۃ الاجانب عند الضرورۃ وتقدر بقدرھا فیما یتعلق بالنظر والجس بالید وغیر ذالك (فتح الباری ۲۳ پ ص ۳۸۹)	بہر حال اصل مسئلہ، تو اجنبیوں کا علاج ضرورت کے وقت جائز ہے اور جس قدر ضرورت ہو اس مقدار بھر دیکھنے اور ہاتھ سے چھونے وغیرہ کی بھی اجازت ہو گی۔

پھر ان حدیثوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ دوا علاج میں صرف عورتیں ہی ہوتی تھیں، کوئی مرد نہیں ہوتا تھا بلکہ کتاب المغازی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مرد کیمپ میں رہتے تھے، جو میدانِ جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے، ان کا کام کیمپ کی نگرانی وغیرہ تھا، پھر یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ زخم دھونے، پٹی باندھنے اور اس طرح کے دوسرے کام کرنے کے لئے مرد ہی ہوتے تھے، عورتیں اوپری کام کر دیا کرتی تھیں۔

سرسری طور پر جو کچھ لکھا گیا اس سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کی حدیثوں سے ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ غزوات میں پردے کے احکام حذف کر دیئے جاتے تھے، یا عورتیں مردوں کے دوش بدوش لڑتی تھیں، آزادانہ پریڈ کیا کرتی تھیں یا اس طرح کی کوئی اور بات، ——

کتاب کے شروع میں بعض مشہور علماء کی تقریظیں ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے ان کی نگاہ اس حصہ پر نہیں پڑی،

ان چند فروگذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب مجموعی حیثیت سے بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اور بڑی دلچسپ و لائق مطالعہ ہے

(ظ)

شاہنامۂ اسلام جلد اول

از جناب عامر عثمانی۔ تقطیع کلاں ضخامت ۶۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- مکتبہ ماہنامہ تجلی دیوبند ضلع سہارنپور۔

اردو میں حفیظ جالندھری نے سب سے پہلے شاہنامہ اسلام لکھا جو بہت زیادہ مقبول ومشہور ہوا۔ اب انھیں کے تتبع میں ایک نوجوان شاعر عامر عثمانی نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا ہے جس کی پہلی جلد اس وقت زیر تبصرہ ہے اس شاہنامہ کی بحر اور انداز نگارش وہی ہے جو حفیظ کے شاہنامہ کا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ حفیظ کے ہاں شاعری تاریخیت پر غالب ہے۔ اور عامر کے شاہنامہ میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعری کو حتی الوسع تاریخیت کے قریب ہی رکھا جائے چنانچہ وہ جگہ جگہ حاشیہ میں اشعار کے مضمون کے ماخذ کے طور پر قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے ٹکڑے نقل کرتے چلے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود شعر کا مقصد جو جذبات انگیزی ہوتا ہے اس پر کوئی اثر نہیں پڑنے پایا ہے اس جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر جنگ یمامہ تک کے حالات کا منظوم بیان ہے اور صرف بیان ہی نہیں۔ بلکہ ہر واقعہ پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ان سے جو سبق لینا چاہئے اور جو اس کے اسباب وعلل ہیں ان کو بھی پُر زور وولولہ انگیز طرز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بعض حصے اس لائق ہیں کہ مسلمان بچوں اور بچیوں کو زبانی یاد کرائے جائیں۔ تاکہ بچپن سے ہی تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کی اہمیت وعظمت کا نقش ان کے دلوں پر بیٹھ سکے اس کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

قوموں کا عروج وزوال

از جناب سید حامد علی صاحب تقطیع خورد ضخامت ۶۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸۰ پتہ : مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور (یو۔ پی)

مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب پر اب تک مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب تک یہ سلسلہ " شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا " کا مصداق بن جانے

کے باعث ختم نہیں ہوا۔ اس رسالہ میں بھی پہلے لائق مؤلف نے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر ایک عام بحث کر کے ان بعض افکار کی تغلیط کی ہے جو اس بحث میں عموماً بیان کئے جاتے ہیں اس کے بعد انھوں نے خود ان صفات کو بیان کیا ہے جو کسی قوم کے لئے بھی عروج کا باعث ہو سکتے ہیں پھر ان خرابیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مذکورہ بالا صفات میں سے کسی ایک صفت میں یا سب ہی صفات میں کچھ نقص ہونے کے باعث پیدا ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کی بحث ایک نہایت وسیع اور پیچیدہ بحث ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نفسیات اقوام تاریخ اور فلسفہ تاریخ ان سب کا مطالعہ ضروری ہے اور یہ سب مباحث ایک مختصر سی کتاب میں نہیں سما سکتے تاہم اس رسالہ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔

رسول مقبول از جناب منظر جلیسری تقطیع خورد ضخامت تقریباً سو صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ۔ پتہ (۱) سنگم کتاب گھر اردو بازار۔ دہلی (۲) یونین بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

یہ چند نظموں۔ رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے جن کا موضوع حمد و نعت، درود و سلام منقبت۔ شہادت کبریٰ کا بیان۔ اور تاریخ اسلام کے بعض واقعات ہیں اشعار پر اثر اور ولولہ انگیز ہیں جن سے لائق مصنف کی گہری عقیدت و ارادت کا اظہار ہوتا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کر کے ثواب دارین حاصل کریں گے۔

بُرہان

جلد نمبر ۳۱ شمارہ نمبر ۲

اگست ۱۹۵۳ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے سپرد کر دینا اور اپنی زندگی کو بغیر کسی پس و پیش کے احکام الٰہی کی بجا آوری کے لئے اس طرح وقف کر دینا کہ اس راہ میں خاندانی رسم و رواج یا کنبہ قبیلہ کا کوئی طور طریق - اپنی کوئی ذاتی خواہش یا جذبہ - کسی شخص یا کسی گروہ کی محبت یا ڈر حائل نہ ہو سکے، اشیا کے حسن و قبح کا معیار وہی ہو جائے جو شارع اسلام نے مقرر کر دیا ہے اور لذت و کرب یا محبت و نفرت کی کسوٹی وہی ایک چیز ہو جو اسلام نے بتا دی ہے - یہ ہی اسلام ہے اور یہی دینِ فطرت ہے اور زندگی کو اسی ایک قالب میں ڈھال لینے سے حقیقی امن و سکون حاصل ہوتا ہے اسی سے آخرت سنورتی اور نجات و کامرانی کے دروازے کھلتے ہیں اور اسی سے دنیوی زندگی میں سکھ اور چین آتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آیا ہے جس کو تمہاری تکلیف ناگوار ہے اور جس کو تمہاری بھلائی کی لو لگی ہوئی ہے اور وہ مومنوں پر بڑا شفیق اور مہربان ہے

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات بیان کی گئی ہیں جن سے ضمناً یہ خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کیسا سادہ - آسان اور سہل مذہب ہے۔ انہی صفات کی طرف آیت ذیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

یہ پیغمبر لوگوں کے لئے پسندیدہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو ان کے لئے حرام کرتا ہے ان کے بوجھ کو اور ان بیڑیوں کو جو ان لوگوں کو جکڑے ہوئے تھیں ان کو ان سے دور کرتا ہے۔

یہ بیڑیاں جن میں لوگ جکڑے ہوئے تھے کیا تھیں؟ اس کا مصداق جہاں یہود اور نصاریٰ کی وہ من مانی بندشیں اور پابندیاں ہیں جو ان لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے سر تھوپ لی تھیں ان سے مراد وہ بیہودہ رسم و رواج بھی ہیں جو یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کسی خاندانی یا معاشرتی عصبیت کی بنا پر اپنے ذمہ عائد کر لی ہوں کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ یہود اور نصاریٰ کی جن من مانی باتوں پر قرآن مجید انہیں زجر و توبیخ کرتا ہے، اسی طرح کی۔ یا اسی سے ملتی جلتی چند خصلتیں ہیں جن میں مسلمان مبتلا ہو گئے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن زنجیروں کو توڑنے کے لئے تشریف لائے تھے ہم نے آج خود آنحضرتؐ کی امت میں ہونے کے باوجود ان زنجیروں کو خوشی خوشی پہن لیا ہے اور اگرچہ اس خود آفریدہ عصبیت نے ہمارے معاشرہ کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں لیکن پھر بھی ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ان زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کر سکیں کسی ایک قوم کی بدنصیبی کی علامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ امن و طمانیت اور عافیت و راحت کے خزانوں کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور درد و کرب کے جہنم میں پڑے رہنے پر قناعت کر کے بیٹھ گئی ہے۔

ذرا سوچئے! گذشتہ ماہ کے نظرات میں جس رسم بد کا ذکر کیا گیا تھا جو مسلمان اس میں مبتلا ہیں کیا وہ خود ان کے لئے اور جو مسلمان اس کی زد میں آ گئے ہیں ان کے لئے جہنم نہیں ہے! ایک مسلمان کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کو ابھی سے تشویش لاحق ہو جاتی ہے اور اس خیال سے کہ اس کی شادی بغیر وافر روپیہ کے ہو ہی نہیں سکتی وہ ابھی سے اپنے اخراجات کو کم کرنے شروع کر دیتا ہے۔ خود سختی اٹھاتا ہے۔ تنگی ترشی سے گذر بسر کرتا ہے اپنے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے اپنی آمدنی کے مطابق عمدہ اور صحت بخش غذاؤں کا انتظام نہیں کرتا بیماری کے علاج پر خاطر خواہ روپیہ صرف نہیں کرتا بچوں کی تعلیم کا مناسب اور بہتر انتظام نہیں کرتا اور ایک ایک پیسہ بچا کر روپیہ جوڑتا ہے، آخر وہ اس روپیہ سے بیٹی کے لئے ایک شوہر اور اپنے لئے ایک داماد خریدتا ہے اور اب دامن جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے وہ یہ سب کچھ کرتا ہے لیکن چونکہ اس کا یہ عمل دین فطرت کی تعلیم کے مخالف ہے اس بنا پر اس کا انجام نہایت برا اور خطرناک ہوتا ہے۔ ایک طرف لڑکے نے چونکہ صرف روپیہ کی خاطر شادی کی ہے اس لئے اگر بیوی حسب منشا نہیں ہے تو وہ اسی بیوی کے روپیہ سے اپنے لئے تسکین نفس کی دوسری راہیں پیدا کر لیتا ہے اور بیوی کو عمر بھر کے جلاپے کی

لئے تنہا چھوڑ دیتا ہے اور دوسری جانب چونکہ شوہر نے ایک معینہ رقم کے بدلہ میں اپنے آپ کو فروخت کیا ہے اس لئے بیوی اس کو اپنے باپ کا زرخرید سمجھتی ہے اور اس بنا پر اس کے دل میں شوہر کی وہ عظمت اور بڑائی نہیں ہوتی جو اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ کے ارشاد کے مطابق ہونی چاہئے تھی ایسی صورت میں ایک عام تباہی و بربادی اور ایک ہمہ گیر بدنظمی و انتشار کے سوا اور کیا نتیجہ ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کسی شخص واحد کے فعل کو صرف اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا کہ وہ ایک شخص کا فعل ہے اور اس فعل کا اثر اچھا یا برا خود اس شخص کے حق میں کیا ہوگا بلکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس ایک شخص کے فعل کا اثر دوسرے لوگوں پر یا عام سوسائٹی پر کیا پڑیگا اس بنا پر ممکن ہے کہ کوئی فعل کسی ایک شخص کے مخصوص حالات کے اعتبار سے اس کے لئے جائز اور مباح ہو لیکن سوسائٹی پر اس کے برے اثرات پڑنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس شخص کو اس فعل سے باوجود اس کے جائز ہونے کے روکا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے کسی عجمی کتابیہ عورت سے نکاح کر لیا اور آپ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حکم دیا کہ طلاق دو اور فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح غیروں میں نکاح کرنے لگے تو عرب کی ان دوشیزہ لڑکیوں کا حشر کیا ہوگا؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد گرامی سے ان مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے جو محض لفظی اور رسمی اباحت کی آڑ لے کر ایسے اعمال و افعال کا ارتکاب بے جھجک کرتے ہیں جن کے تمدنی اور معاشرتی اثرات سوسائٹی پر نہایت تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہو سکتے ہیں۔

بہر حال کسی بھی پہلو سے غور کیجئے۔ خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی۔ اقتصادی ہو یا سماجی و معاشرتی، اپنے مفاد کے نقطۂ نظر سے ہو یا غیروں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے۔ یہ رسم بد انتہائی جاہلانہ اور مشرکانہ ہے اور اسلامی سوسائٹی کے جسم پر ایک ایسا پھوڑا ہے جس کے غلیظ و متعفن مادہ نے تمام جسم کو فاسد اور داغ دار بنا دیا ہے۔ آج مسلمان بحیثیت مجموعی جن تباہ حالیوں میں گرفتار ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ منجملہ اور اسباب کے اس میں ان ہزاروں مسلمان نوجوانوں ناکدخدا لڑکیوں کے صبر کو دخل نہیں ہے جو اس شیطانی رسم کی زد میں آ کر اپنے ماں باپ کے سینہ کا بوجھ بنی بیٹھی ہیں اور جو غایت شرم حیا سے آہ زیر لب کرنے کی بھی مجاز نہیں ہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ

کس لئے ؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شرک قدیم ہو یا جدید، آثار و نتائج بھی دونوں ہی کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، سب کی تفصیل تو مشکل ہے لیکن چند کھلی کھلی واضح چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہی کہ "خدا فراموشی" آدمی کو "خود فراموشی" کے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے قرآنی قانون

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (الحشر) بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے۔

کا جو مفاد و اقتضار ہے۔

یا مآلاً اسی کے قریب قریب نفسیاتی مکافات و مجازات کا یہ قدرتی دستور یعنی "آغاز فراموشوں" کا دل و دماغ "انجام فراموشی" کی آفت سے ماؤف ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں جس کا حاصل یہی ہے، کہ "انجام اندیشی" کی بصیرت سے ان کو محروم کر دیا جاتا ہے، جو "آغاز" سے آنکھیں چراتے ہوئے اپنے جینے کا پروگرام بناتے ہیں، اور اپنی زندگی کے قیمتی سرمایہ کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے نہ یہ سوچتے ہیں اور نہ سوچنا چاہتے ہیں کہ جہاں سے ان کو یہ سرمایہ ملا ہے وہاں کا منشار کیا ہے؟ یہی ناشکری، نمک حرامی، اور کفر کی ذہنیت ہے، یوں تو سارا قرآن ہی اس "قدرتی قانون" کے ذکر سے بھرا ہوا ہے لیکن سورہ ممتحنہ کے خاتمہ کی آیتیں جن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ

لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ نہیں جوڑ رکھا ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غصہ

قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ

ٹھٹک چکا ہے، وہ "الآخرۃ" (یعنی انجام) سے مایوس ہو چکے ہیں (اسی طرح مایوس) جیسے "الکفار" (ناشکروں کا طبقہ) مایوس ہو چکا ہے قبر والوں سے

ان الفاظ میں ایک طرف تو یہ بتایا گیا ہے، کہ قبر والوں (یعنی اصحاب قبور) سے مایوسی کا احساس کفر کی پیداوار ہے، اور دوسری طرف اس کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ "انجام سے مایوسی کی یہ ذہنیت" اللہ کے غصہ کا نتیجہ ہے اور یہی میری غرض ہے کہ "انجام اندیشی" کی بصیرت سے محرومی، سمجھنے والے خواہ اسے خرد و دانش کا ہی تقاضا کیوں نہ سمجھتے ہوں، لیکن یاس و قنوط کا یہ احساس درحقیقت قدرتی انتقام کا ایک باطنی اور ذہنی رنگ ہے "آغاز" کی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی "انجام" سے مایوسی کی اس کیفیت کو دلوں میں پیدا کرتی ہے اور اس وقت تک پیدا کرتی رہے گی، جب تک کہ "آغاز" سے لاپرواہی اختیار کی جائے گی، لاکھ سمجھایا جائے مگر مایوسوں پر سمجھ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، قرآن ہی میں یہ فرماتے ہوئے کہ خالقِ کائنات نے

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ

(الانعام)

رحمت اور مہربانی کو اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے (اس کی مہربانی اور رحمت ہی کا اقتضا ہے) کہ اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن (قیامت کا وہی دن) جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

مطلب جس کا یہی ہے، کہ جو جینا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ کے لئے مٹایا اور نیست و نابود کر کے نہیں رکھ دیا جائے گا۔ بلکہ پیدا کرنے والے کی رحمت ہی کا یہ اقتضا ہے کہ دنیا کی فرسودہ زندگی سے بھی زیادہ تر و تازہ حیات انھیں بخشی جائے گی۔

فہمائش کا یہ کتنا پیارا، کتنا دل آویز اور اثر انگیز لہجہ ہے اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتا کہ جس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے وہی اپنے اوپر رحم اور مہربانی کو واجب ٹھہراتے ہوئے، مرنے والوں

کو دلاسا دے رہا ہے، کہ تم زندہ ہی رہو گے، مگر پڑھئے اسی کے بعد یہ بھی اطلاع دی گئی ہے، کہ

اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ — جنہوں نے اپنا دیوالہ نکال لیا ہے اور خسارے کے جو شکار ہو گئے ہیں! وہ کبھی نہ مانیں گے۔

یہ "دیوالہ" اور "خسارہ" جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، اس کا تعلق زندگی کے اسی سرمایہ سے ہے، جس میں زندگی کے آغاز کے متعلق یکسوئی[1] حاصل کئے بغیر کاروباری تصرفات میں لوگ مشغول ہو جاتے ہیں؛ آگاہ کیا گیا ہے کہ لاکھ ان کو سمجھایا جائے کہ تم مٹو گے نہیں، مگر وہ اڑتے ہی چلے جائیں گے کہ ہم تو مٹ ہی کر رہیں گے، ہٹ دھرمی یا اصرار بے جا کی یہ دماغی کیفیت، سزائی کیفیت کے سوا بتایئے کہ اسے اور کیا سمجھا جائے۔

ان دو قدرتی شکنجوں کے ساتھ تیسرا قدرتی "شکنجہ" وہ بھی ہے جس میں دبے اور کسے ہوئے ذہنی سزا پانے والے قدرت کے مخفی انتقامی ہاتھوں سے سزا پاتے رہتے ہیں، اپنے لفظوں میں جس کی تعبیر

"اَحَدٌ اَوْ کُلُّ اَحَدٍ"

سے کر کے اردو میں اسی کا ترجمہ

"ایک یا ہر ایک"

کر دیا کرتا ہوں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک خالق کے سامنے سے بھاگنے والے مجبور ہیں، کہ مخلوقات جن کی تعداد گنی نہیں جا سکتی، ان ہی کے پیچھے بھاگے بھاگے پھریں، جو ایک

---

[1] یہ یاد رکھنا چاہئے "الدین القیم" کے پہلے حصہ میں اس پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ اس سلسلہ میں یکسوئی حاصل کرنے کی جو قدرتی طبعی راہ ہے اس سے بے تعلق ہو کر صرف عقلی اور حسی قوتوں سے خدا تو خدا یہ فیصلہ بھی ناممکن ہے کہ زندگی کا آغاز کسی ایسی چیز سے ہوا جو زندگی سے خالی تھی یعنی مادہ کے وجود تک رسائی کا ذریعہ نہ پہلے کسی کے پاس تھا نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگا "مادہ" صرف ایک لفظ ہے جس کا کوئی صحیح تخیل ان غریبوں کے پاس بھی نہیں ہے جو غایت سادگی میں اپنے آپ کو "مادہ پرست" مشہور کئے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں عقل و دانش کے ساتھ یہ کتنا اہانت آمیز تمسخر ہے کہ "خدا جو کچھ چاہتا ہے" ہم عقل کے زور سے اس کو دریافت کر سکتے ہیں ۱۲

سے نہیں ڈرتا، انسے ہر ایک سے ڈرنا پڑتا ہے وہی ہر ایک کے آگے جھکنے پر بے بس ہو جاتے ہیں جو اس ایک کے آگے جھکنا نہیں چاہتے یہی قدرت کا ایک ایسا قدرتی شکنجہ ہے "جس کی گرفت سے نکلنے والے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے، آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے جئے اور مرے، دیکھئے کہ آسودگی راحت و عافیت کی ضمانت کس میں ہے قرآن میں ان ہی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا ہے کہ

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ — بہت سے پروردگاروں سے (اپنی پرورش کا تعلق قایم کر کے جینا) یہ بہتر ہے یا تنہا اللہ، جو سب پر سب سے زیادہ غالب ہے (اسی ایک کو اپنا پروردگار بنالینا)

اسی واقعہ کو دوسرے پیرایہ میں یوں بھی سمجھایا گیا ہے سورۂ "زمر" میں ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ — اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے ایک آدمی تو ایسا ہے جو باہم چند کش مکش رکھنے والوں کے ساجھے میں ہے اور دوسرا آدمی وہ جو مسلم ایک ہی شخص کے ساتھ مختص ہو؟

اسی مثال کو پیش کر کے پوچھا گیا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؟ — کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے۔

جواب تجربہ کے سپرد کر دیا گیا ہے وہی بتا سکتا ہے کہ زندگی کے ان دونوں مثالی شکلوں میں زندگی، کب تک باقی رہتی ہے اور موت سے زیادہ اجیرن بن کر یہ زندگی کب اور کس حال میں رہ جاتی ہے۔

بہر حال ایک کی نیازمندی ہر ایک سے جب آدمی کو بے نیاز کر رہی ہو، ایک کا ڈر ہر ایک سے آدمی کو نڈر بنا رہا ہو، ایک کا سجدہ ہر ایک کے آگے ناک رگڑنے کی ذلت سے بچا لیتا ہو قدرت کے اس قانون سے استفادہ کی توفیق سے محرومی یقیناً سزا ہی کی ایک شکل ہو سکتی ہے جو

نمک حرامی کے مجرم ناشکروں کو دی جاتی ہے اور مرنے سے پہلے ہی دی جاتی ہے، زندانِ مصر میں یوسفی خطبہ کا یہ فقرہ یعنی

مَا کَانَ لَنَا اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ

ہمارے لئے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرائیں یہ ہم پر بھی اللہ کا فضل ہے اور عام لوگوں پر بھی ہے۔

اس کی قدر و قیمت اب سمجھ میں آتی ہے۔

قرآن جس زمانہ میں نازل ہو رہا تھا اس وقت یا اس سے پہلے بھگتنے والے ان سزاؤں کو کس طرح بھگت رہے تھے جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ یورپ و امریکہ کی "بقراطیت" میں بھی اس کا جواب آپ کو مل سکتا ہے، کم از کم میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ زیادہ مہیب اور زیادہ خوفناک قالب میں یہی باطنی سزائیں آج دنیا کے سروں پر کھیل رہی ہیں۔ بجز ایک خاص پہلو کے جس کا ذکر کیا جائے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ یورپ و امریکہ کی "نشاۃ جدیدہ" کی پیدا کی ہوئی مادی زندگی میں ان کے کوڑھ جس طرح پھوٹ پڑے ہیں، جو پھوڑے اور گھاؤ سر نکال رہے ہیں، جو گندگی، سڑاندھ اور عفونت ان سے اُبل رہی ہے شاید ان کو "دماغ پاش" بھبکوں کا تجربہ گذری ہوئی جاہلیت کے زمانہ میں بھی مشکل ہی سے لوگوں کو ہوا ہوگا، میں جو کچھ عرض کرتا ہوں اسے پڑھئے اور بتائیے کہ اپنے اس احساس میں کس حد تک فقیر حق بجانب ہے

دیکھئے "خدا فراموشی" کی سزائیں "خود فراموشی" کے عذاب کو تہذیب جدید کی نئی اور ملحدانہ مشرکانہ ذہنیت جس طریقہ سے خرید چکی ہے اور اپنی اس "خود فراموشی" پر اصرار و ناز جس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکا ہے اس کی تفصیلی داستان آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں تحقیق و تلاش کی علمی فہرست میں دیکھ چکے کہ ذرہ سے آفتاب تک کیڑے مکوڑوں، جنگل کے بھیڑیوں، اور درندوں سانپوں اور بچھوؤں تک کے سامنے کس لئے کا سوال اور ؟ کا سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اب تو اسی

کس لئے؟

کے سوال کو زمین سے اٹھا کر سیاروں تک بھی پہنچایا جا چکا ہے سورج کے اندر جو داغ اور دھبے دکھائی دیتے ہیں، پوچھا جا رہا ہے کہ وہ کیوں ہیں، اور کس لئے ہیں؟ مریخ کے سیارے میں دوربینوں سے جن نشانوں، اور لکیروں کا پتہ چلا ہے، کیوں اور کس لئے کے سوالات کے نشانے وہ بھی بن چکے ہیں

لیکن زمین اور آسمان کی ساری پیداواروں میں کس لئے کے اسی سوال سے محروم، قطعی محروم خود ان کا اپنا وجود بنا ہوا ہے، انسان کس لئے پیدا ہوا ہے، کس قدرتی نصب العین کی تکمیل آدمی کے وجود سے ہوتی ہے؟ عرض ہی کر چکا ہوں کہ یہی سوال ان کو بھلا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال پانچ مسافروں کی اس ٹولی کی نظر آتی ہے، جن میں ہر ایک اپنے رفیقوں کو اسی طریقہ سے گنتا تھا کہ خود اپنے آپ کا گننا بھول جاتا تھا، کہرام مچا ہوا تھا کہ ہمارے پانچ رفیقوں میں کوئی نہ کوئی رفیق ضرور ڈوب مرا، ہم پوچھتے تھے کہ بجائے پانچ کے آخر میزان سب کی کل چار ہی کیوں ٹھہرتی ہے؟ آج دنیا کا نیا "انسان" اسی دماغی حادثہ کا شکار ہے، یقین مانئے کہ "خدا" جب تک یاد نہ آئے گا، اس وقت تک خود اپنے آپ کو بھی وہ کبھی یاد نہ آئیں گے۔

انسان کس لئے ہے؟ اس سوال کا جواب تو جواب میرا خیال تو یہی ہے کہ سوال کی یاد بھی ان کے حافظہ میں انگڑائی کیا کروٹ بھی نہیں بدل سکتی، یہ "خود فراموشی" اسی "خدا فراموشی" کی قدرتی سزا ہے، اپنے سوا کسی دوسری چیز کو آدمی بھول جائے یہ تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اپنے آپ کو بھی بہ ثبات عقل و ہوش کوئی بھول جائے اپنے حافظہ سے خود نکل پڑے بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی مگر جو واقعہ آپ کے سامنے ہے، بتائیے اس کا انکار کیسے کیا جائے یقیناً اپنے آپ سے آدمی بھلایا جا چکا ہے، خود اپنے حافظہ سے اس کی اپنی یاد چھینی جا چکی ہے اسی لئے تو اس کو میں "ذہنی عذاب" سمجھتا ہوں کہ بات جو سمجھ میں نہیں آتی وہی واقعہ بن کر ہم سب کے سامنے آ چکی ہے آخر اس کو عذاب نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے؟

"خدا فراموشی"... "خود فراموشی" کے عذاب کو آدمی پر مسلط کرتی ہے، یہ زور تو

نَسُوا اللّٰہَ فَاَنسٰھُمْ اَنفُسَھُمْ   بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے

کے قرآنی قانون کا تھا۔

اب دیکھئے "آغاز" سے بے اعتنائی "انجام" سے آدمی کو اندھا کیسے بنا دیتی ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ   جب ہم مرجائیں گے اور خاک بن جائیں گے، پھر زندگی واپس ہوگی یہ دور از عقل خیال ہے۔

یہ احساس تو عرب کے جاہل بت پرست مشرکین کا تھا، لیکن آج نئی روشنی میں دیکھئے کیا ہورہا ہے، یہ انسانی افکار پر ایک اِزم کے بعد دوسرے اِزم کی، دوسرے کے بعد تیسرے اِزم کی ڈاک گاڑی مسلسل یکے بعد دیگرے، جو چھوڑی جارہی ہے ان سارے اِزموں کے انبار یا طومار کے اندر اگر صحیح طور پر ٹٹولے گا تو صرف یہی ہاتھ آئے گا کہ "ماضی" تو خیر "ماضی" ہی ہوچکا ہر "حال" کو دوزخ ثابت کرتے ہوئے، ہر ایک دوسرے کو اور ہر پہلی نسل پچھلی نسلوں کو "مستقبل" میں آدمی کے فردوس گم گشتہ کی پیداوار، صرف امید وار اس طریقہ سے بناتی چلی جارہی ہے کہ ہر امید دلانے والے کے سامنے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس کے "انجام" کے سوال کو اوجھل اور اوٹ میں ڈال دیا گیا ہے اور یوں دوسروں کو "مستقبل" کی جنت کی امید دلانے والے خود "حال" ہی کی "جہنموں" میں دم توڑتے چلے جارہے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ "ناتمام زندگی" میں زندگی کی تمام آرزوؤں کی یافت کی کوشش، غلط کوشش نے اس "ناتمام زندگی" کو بھی ناکام زندگی" بنا کر چھوڑ دیا ہے، اسی لئے تو میں کہا کرتا ہوں،

"جنت کا انکار کر کے دیکھو! یہی خاکی زندگی جہنم بن کر تم سے لپٹ پڑے گی"

باقی "احد اور کل احد" یعنی وہی

"ایک یا ہر ایک"

کا قدرتی شکنجہ، پرانے شرک کے مخبوطوں کو اس شکنجے کے اندر کیسے پھڑانے اور تڑپنے کا نظارہ تو جتنا دردناک ہے اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے لیکن مادی شرک کی "عصری ذہنیت" کے

تماشے بھی اس سلسلہ میں کیا کچھ کم دلچسپ یا کم دل دوز ہیں، ایک کو چھوڑ کر بھاگنے والے آج کس کس کے پیچھے کہاں کہاں بھاگ کر ہو پچ رہے ہیں، آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے زبان اور قلم سے اسے کیا دکھایا جائے؟ ایک سے نڈر بن کر اپنے اوپر جن جن چیزوں کے ڈر کو لوگوں نے مسلط کر لیا ہے کیا ان کو ہم گن سکتے ہیں؟ پانی کا ایک ایک قطرہ جس زمانہ میں صرف زہریلے، کاٹ کھانے والے جراثیم کا سمندر بن چکا ہو، ہوا کی ہر موج سمی جرمس اور بکٹیریا کی آندھی ٹھہرائی جا رہی ہو؟ گویا دوسرے لفظوں میں ساری دنیا دہشت و خوف، اندیشہ اور ہیبت کی دوزخ کا قالب اختیار کر چکی ہے بدتمیزی کے اسی طوفان میں انسانیت کی بہتی ہوئی لاش سمجھی جاتی ہو، کہ بہ رہی ہے ایسی لاش جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، عذاب کے سوا بتایا جائے کہ اس "فکری روش" اور تصور کے اس طریقہ کو ہم اور کیا قرار دیں؟

حق تو یہ ہے کہ "اوہام و خرافات" کے پرانے عہد میں پرانے پیپل اور برگد کے ہر پیڑ پر شیطان کا گھونسلا اور املی کے ہر اکیلے درخت پر مان لیا جاتا تھا کہ بھوت پریت بسیرا لیتے ہیں، چڑیلوں سے باور کر لیا جاتا تھا کہ ہر ویرانہ آباد ہے، خالی مکانوں کو جنات اور پریاں اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔ گذرے ہوتے لوگوں کے ان پارینہ احساسات پر قہقہہ لگانے کا حق مری سمجھ میں تو نہیں آتا ان لوگوں کے لئے کیسے باقی رہا ہے جن کے لئے آج ہر لنگڑا مچھر دیوانے ہاتھی سے بھی زیادہ خوفناک بن چکا ہے، جس کی ہر بھنبھناہٹ ان کے لئے موت کی "آہٹ" اور مرگ کا پیغام بن جاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ باور کرایا جا رہا ہے یہ سب جھوٹ ہے بلکہ جیسے ان پرانے اوہامی خرافات پارینہ میں بھی کہنے والے آج بھی مانتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ "حقیقت" کے دھوکے بھی مخفی تھے میں مانتا ہوں کہ آج بھی جو کچھ پھیلایا جا رہا ہے اس کی بھی کچھ نہ کچھ ایسی "بنیاد" ضرور ہے، جس کی تجربہ سے تصدیق ہوتی ہے لیکن سوال اس خفقانی دور سے ہے جس کی بدولت راستہ کی ہر گری پڑی رسی، سانپ بن کر لوگوں کے سامنے لہرانے لگی ہے، یہ صحیح ہے کہ سانپ سے بھی راستوں کے چلنے والے دوچار ہو جاتے ہیں لیکن ہر رسی کو دیکھ کر اسی طرح بھاگنا جیسے

سانپ کو دیکھ کر آدمی بھاگتا ہو دماغی خبط کے سوا بتایا جائے کہ اسے آخر اور کیا باور کیا جائے؟
ایک ہی ارادہ، ایک ہی حکم، ایک ہی اذن، ایک ہی فعل کا یہ نظامِ محکم جس کا نام عالم ہے، انتشاری کثرتوں کی بکھری ہوئی دنیا کی شکل جن لوگوں کے لئے اختیار کر چکی ہے۔ انتشار اور کیسا انتشار؟ گویا کائنات کیا ہے ایک میدان ہے جس میں بگٹٹ گھوڑے ادھر سے ادھر سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب، کہاں کس کو اپنی ٹاپوں سے کچل کر رکھ دیں گے۔ ان کی جھپٹ میں کون کس وقت آجائے گا۔ حد ہے اس دماغی کوفت، اور "ذہنی دکھ"، کی جس کے تھپیڑوں میں انسانی احساسات جھونک دئے گئے ہیں کوئی مانے یا نہ مانے لیکن ہے یہ قدرت کے اسی "شکنجہ" کی گرفت کا نتیجہ، جس کا نام میں نے "ایک یا ہر ایک" رکھ لیا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں چاہا گیا کہ ایک کا ڈر دلوں سے نکال دیا جائے ابھی اس ایک کا ڈر پورے طور پر نکلا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کا ڈر ان ہی دلوں میں گھس پڑا ایک سے ڈرو ورنہ ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا یہ تو قدرت کا قانون ہے، اس قانون کی زد سے بچ کر نکل جانے کی صورت ہی کیا ہے؟ مخلوق پرستی کے اصنامی نظام کے زیرِ اثر اگلوں نے بھی یہی کیا تھا اور اب جو خالق سے روٹھ کر مخلوقات ہی میں سب کچھ ڈھونڈھنے کا نیا سائنٹفک طریقہ جاری ہوا ہے اس میں بھی یہی کیا جا رہا ہے، اور جو کچھ کیا جا رہا ہے اسی کا نتیجہ بھی بھگتا جا رہا ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے، کہ "ایک" سے بھی سرگرانی کا عارضہ پھیلا دیا گیا، لیکن "ایک" سے روٹھ کر "ہر ایک"، کے منانے کی مہم سر کرنے کے لئے جو آمادہ ہوتے دیکھا جاتا ہے کہ کثرت کے اس بحرِ ناپیدا کنار میں وہ بھی اسباب و علل کی چند کڑیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں آگے کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں "مجہول اعتماد" کی مبہوتی کیفیت کے سوا خود ان ہی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو غریب پوچھنے والے کی تسلی وہ کیا کریں گے۔؟ حالانکہ ایک کو جب چھوڑ ہی دیا گیا تھا، تو "ہر ایک"، کو قابو میں لائے بغیر اطمینان و سکون کی جو ضمانت بھی دی جائے گی، وہ جھوٹی اور قطعاً جھوٹی ضمانت اور ان سائنٹفک ضمانت ہوگی، اور یقین مانیے کہ اس "ضمانت"، کے حاصل کرتے میں عقل و حواس والے نہ پہلے کبھی کامیاب

تماشے بھی اس سلسلہ میں کیا کچھ کم دلچسپ یا کم دل دوز ہیں، ایک کو چھوڑ کر بھاگنے والے آج کس کس کے پیچھے کہاں کہاں بھاگ کر پہونچ رہے ہیں، آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے زبان اور قلم سے اسے کیا دکھایا جائے؟ ایک سے نڈر بن کر اپنے اوپر جن جن چیزوں کے ڈر کو لوگوں نے مسلط کر لیا ہے کیا ان کو ہم گن سکتے ہیں؟ پانی کا ایک ایک قطرہ جس زمانہ میں صرف زہریلے، کاٹ کھانے والے جراثیم کا سمندر بن چکا ہو، ہوا کی ہر موج ستی جرمس اور بکٹیریا کی آندھی ٹھہرائی جا رہی ہو، گویا دوسرے لفظوں میں ساری دنیا دہشت و خوف، اندیشہ اور ہیبت کی دوزخ کا قالب اختیار کر چکی ہے بدتمیزی کے اسی طوفان میں انسانیت کی بہتی ہوئی لاش سمجھی جاتی ہو، کہ بہ رہی ہے ایسی لاش جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، عذاب کے سوا بتایا جائے کہ اس "فکری روش" اور تصور کے اس طریقہ کو ہم اور کیا قرار دیں؟

حق تو یہ ہے کہ "اوہام و خرافات" کے پرانے عہد میں پرانے پیپل اور برگد کے ہر پیڑ پر شیطان کا گھونسلا اور املی کے ہر اکیلے درخت پر مان لیا جاتا تھا کہ بھوت پریت بسیرا لیتے ہیں، چڑیلوں سے باور کر لیا جاتا تھا کہ ہر ویرانہ آباد ہے، خالی مکانوں کو جنات اور پریاں اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔ گذرے ہوتے لوگوں کے ان پارینہ احساسات پر قہقہہ لگانے کا حق مری سمجھ میں تو نہیں آتا ان لوگوں کے لئے کیسے باقی رہا ہے جن کے لئے آج ہر لنگڑا مچھر دیوانے ہاتھی سے بھی زیادہ خوفناک بن چکا ہے، جس کی ہر بھنبھناہٹ ان کے لئے موت کی آہٹ" اور مرگ کا پیغام بن جاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ باور کرایا جا رہا ہے یہ سب جھوٹ ہے بلکہ جیسے ان پرانے اوہامی خرافات پارینہ میں بھی کہنے والے آج بھی مانتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ "حقیقت" کے دھوکے بھی مخفی تھے میں مانتا ہوں کہ آج بھی جو کچھ پھیلایا جا رہا ہے اس کی بھی کچھ نہ کچھ ایسی "بنیاد" ضرور ہے، جس کی تجربہ سے تصدیق ہوتی ہے لیکن سوال اس خفقانی دور سے ہے جس کی بدولت راستہ کی ہر گری پڑی رسی، سانپ بن کر لوگوں کے سامنے لہرانے لگی ہے، یہ صحیح ہے کہ سانپ سے بھی راستوں کے چلنے والے دو چار ہو جاتے ہیں لیکن ہر رسی کو دیکھ کر اسی طرح بھاگنا جیسے

سانپ کو دیکھ کر آدمی بھاگتا ہو دماغی خبط کے سوا بتایا جائے کہ اسے آخر اور کیا باور کیا جائے؟
ایک ہی ارادہ، ایک ہی حکم، ایک ہی اذن، ایک ہی فعل کا یہ نظام محکم جس کا نام عالم ہے، انتشاری کثرتوں کی بکھری ہوئی دنیا کی شکل جن لوگوں کے لئے اختیار کر چکی ہے۔ انتشار اور کیسا انتشار؟ گویا کائنات کیا ہے ایک میدان ہے جس میں بگٹٹ گھوڑے ادھر سے ادھر سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب، کہاں کس کو اپنی ٹاپوں سے کچل کر رکھ دیں گے۔ ان کی جھپٹ میں کون کس وقت آجائے گا۔ حد ہے اس دماغی کوفت، اور "ذہنی دکھ" کی جس کے شکنجے میں انسانی احساسات جھونک دئے گئے ہیں کوئی مانے یا نہ مانے لیکن ہے یہ قدرت کے اسی "شکنجہ" کی گرفت کا نتیجہ، جس کا نام میں نے "ایک یا ہر ایک" رکھ لیا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں چاہا گیا کہ ایک کا ڈر دلوں سے نکال دیا جائے ابھی اس ایک کا ڈر پورے طور پر نکلا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کا ڈر ان ہی دلوں میں گھس پڑا ایک سے ڈرو ورنہ ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا یہ تو قدرت کا قانون ہے، اس قانون کی زد سے بچ کر نکل جانے کی صورت ہی کیا ہے؟ مخلوق پرستی کے اصنامی نظام کے زیر اثر اگلوں نے بھی یہی کیا تھا اور اب جو خالق سے روٹھ کر مخلوقات ہی میں سب کچھ ڈھونڈھنے کا نیا سائنٹفک طریقہ جاری ہوا ہے اس میں بھی یہی کیا جا رہا ہے، اور جو کچھ کیا جا رہا ہے اسی کا نتیجہ بھی بھگتا جا رہا ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے، کہ "ایک" سے بھی سرگرانیوں کا عارضہ پھیلا دیا گیا، لیکن "ایک" سے روٹھ کر "ہر ایک" کے منانے کی مہم سر کرنے کے لئے جو آمادہ ہوتے دیکھا جاتا ہے کہ کثرت کے اس بحر ناپید اکنار میں وہ بھی اسباب و علل کی چند کڑیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں آگے کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں "مجہول اعتماد" کی مبہوتی کیفیت کے سوا خود ان ہی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو غریب پوچھنے والے کی تسلی وہ کیا کریں گے؟ حالانکہ ایک کو جب چھوڑ ہی دیا گیا تھا، تو "ہر ایک" کو قابو میں لائے بغیر اطمینان و سکون کی جو ضمانت بھی دی جائے گی، وہ جھوٹی اور قطعاً جھوٹی ضمانت اور ان سائنٹفک ضمانت ہوگی، اور یقین مانیے کہ اس "ضمانت" کے حاصل کرتے میں عقل و حواس والے نہ پہلے کبھی کامیاب

ہوئے اور نہ آئندہ ہو سکتے ہیں۔

بہرحال اس قصے کو کہاں تک دراز کیا جائے خلاصہ یہی ہے کہ "خالق" جس کا سب کچھ ہے اس کے ساتھ طوطا چشمیوں کی راہ کل اختیار کی گئی ہو یا آج بے باکیوں کی راہ اسی کے متعلق آج کھولی گئی بہ نتیجہ اس باغیانہ طریقہ کار کا ایک ہی رنگ میں جاہیئے بھی یہی کہ سامنے آئے اور وہی سب کے سامنے آیا، جو تماشہ عاد و ثمود کے زمانہ میں دیکھا گیا تھا، آسمان کبود کے نیچے آج بھی وہی نظارہ پیش ہے، تو اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ میں نے تو صرف اشارہ کیا ہے غور کرنے والے چاہیں تو ان اجمالی اشاروں کی روشنی میں تفصیلات کو خود سوچ سکتے ہیں۔

مگر آثار و نتائج کے اشتراک و یک رنگی کے باوجود اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا کہ "مخلوق پرستی کا "اصنامی قالب" اور شرک قدیم کی جاہلی نوعیت یعنی

"بت پرستی"

کے پرانے فرسودہ مسلک کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس نے النامنیت کی اس "شدید گمراہی" اور "کج اندیشی" کو حد سے زیادہ خطرناک اور ایسا "فکری مغالطہ" بنا دیا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد گلو خلاصی کا مسئلہ پہلے بھی کافی دشوار ثابت ہوا ہے اور آج بھی اس کی نہ سمجھنے والی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی آسان نہیں ہے

میرا مطلب یہ ہے بار بار ذکر کر چکا ہوں کہ خالق سے بے اعتنائی و لاپروائی کا رویہ اختیار کرکے "مادیت" کی "عصری ذہنیت" میں مخلوقات کے ساتھ صرف عقلی رشتہ جو نکہ قائم کیا جاتا ہے اس لئے قدرتاً مذہبی جذبہ کا جو رجحان انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے وہ ان کے یاں بے کار اور معطل ہو کر رہ گیا ہے صحیح ہو یا غلط کسی قسم کا کوئی کام اس جذبہ سے نہیں لیا جاتا ہے، برخلاف اس کے "بت پرستی" کے پرانے مسلک میں حسی اور عقلی قوتوں کے ساتھ ساتھ مخلوقات ہی کی طرف "مذہبی جذبہ" کا رخ بھی پھیر دیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اپنی شنوائی کی قوت کو کوئی اگر بے کار بنا لے اور رنگ روشنی جیسی چیزوں کے لئے بینائی کی قوت

جو بخشی گئی ہے ان ہی کے دیکھنے اور جاننے میں اپنی بینائی کی اس قوت کو خرچ کرتا رہے تو شنوائی کے فوائد سے محرومی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہیں کہ قوت بینائی کے فوائد سے مستفید و متمتع نہ ہو، مادیت کے دورِ جدید میں مذہبی جذبہ کے تعطل اور بے کاری کے باوجود حسی اور عقلی قوتوں سے کافی فائدہ اٹھایا جارہا ہے، آخر کانوں میں اپنے جو ڈاٹ کس دے گا، اس کے کان ہی تو بند ہوں گے، آنکھیں جب اس کی کھلی ہوئی ہیں اور دیکھنے کا کام ان سے لے رہا ہے تو بینائی کے منافع سے وہ محروم ہی کیوں رہے گا۔

لیکن مخلوق پرستی کے مسلک قدیم اصنامیت کے دور میں جو کچھ کیا جارہا تھا یا اس وقت تک کرنے والے اس راہ میں جو کچھ کر رہے ہیں، ان کی مثال گویا اس شخص کی ہے جو آنکھوں کے ساتھ ساتھ چاہتا ہو کہ کانوں سے بھی دیکھنے ہی کا کام لے اور اسی فیصلہ ارادہ کے زیر اثر کپڑوں کو کان سے رگڑ رگڑ کر پتہ چلانا چاہتا ہے، کہ وہ سرخ ہیں، یا سبز، سفید ہیں یا سیاہ،

الغرض بت پرستی، یا شرک کی "جاہلی ذہنیت" میں مخلوقات ہی کی طرف "مذہبی جذبہ" کا رخ جو پھیر دیا جاتا تھا، یا آج بھی کرنے والے یہی جو کر رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے چند خطرناک اور مہلک نتائج میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ قدرت نے جس مقصد اور غرض و غایت کے لئے جس چیز کو پیدا کیا ہے مثلاً کان سننے کے لئے دیے گئے ہیں، اب کوئی بجائے سننے کے دیکھنے کی کوشش میں شنوائی کی قوت کا تجربہ اگر کرے گا، اس تجربہ میں لاکھ ہاتھ پاؤں مارے روپے کی ندیاں ہی کیوں نہ بہادی جائیں۔ کچھ بھی خرچ کر ڈالا جائے۔ لیکن قدرت کے قانون کو کیسے بدل دیا جائے گا، شنوائی کی قوت کا جو کام ہی نہیں ہے، وہی کام اس سے کیسے لیا جاسکتا ہے

اب دیکھئے مذہبی جذبہ کی کمند تو آدمی کی جبلت میں "یزداں گیری" کے حوصلہ کی تکمیل کے لئے سجھائی گئی ہے، یعنی خالق کی جستجو اور تلاش، قرب اور نزدیکی کا کام "مخلوق انسانی"

اس سے لے، اور یوں باوجود مخلوق ہونے کے "خالق" تک رسائی حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو، وو یعت ہی کیا گیا ہے آدمی کی فطرت میں مذہب کا یہ جذبہ اسی نصب العین تک پہو نچنے اور پہنچانے کے لئے، اس کا حقیقی مقصد اور بالذات غرض یہی اور فقط یہی ہے، اب اسی جذبہ کے رخ کو مخلوقات کی طرف پھیر کر ان ہی مخلوقات کے نفع بخش پہلوؤں سے مستفید ہونے یا ضرر رساں پہلوؤں سے بچنے کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جواب تک ہوتا رہا ہے اس تجربہ کی راہوں پر کون بتا سکتا ہے کہ اپنی پیشانیوں کی گاڑھے پسینوں کی کمائی ہوئی آمدنیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ آدم کی اولاد انتہائی بے دردیوں کے ساتھ برباد کر چکی ہے اور برباد کرتی ہی چلی جاتی ہے دودھ ہی کی اس مقدار کو دنیا کے کس ترازو میں تولا جا سکتا ہے جواب تک ان ہی سنگی مجسموں اور برنجی و آہنی مورتیوں کے قدموں پر بہائے گئے اور اس طور پر بہائے گئے کہ نہ ایک قطرہ اسی دودھ کا آدم کے بچوں کے حلق تک واپس ہوا، اور کسی دوسری شکل میں بھی اس کا کوئی نتیجہ نہ بہانے والوں ہی کے سامنے آیا، اور نہ کسی دوسرے آدمی کو اس کا نفع پہنچا۔

اور ایک دودھ ہی کیا نذر و نیاز منت اور چڑھاوے کے ناموں سے جنس اور نقد، کی شکلوں میں جو کچھ اب تک ان راہوں میں برباد ہو چکا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی ہزار صدیاں ان ہی کو زندگی بنا کر آدمؑ کی اولاد جی سکتی تھی لیکن آدمی کے بچوں کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد ان کے منہ سے سب کچھ چھین لیا گیا اور اس طور پر چھین لیا گیا کہ ان کا کوئی ثمرہ کسی زمانہ میں خواہ کسی شکل میں ہو کسی کے سامنے کبھی نہیں آیا تماشہ یہ ہے کہ دیکھنے والے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ کمائی ہوئی دولت انسانوں کی لاحاصل طور پر لٹ رہی ہے، لٹائی جا رہی ہے لیکن کوئی زبان بھی اس کے خلاف ہلا نہیں سکتا اور وقت، ازجی کا جو ذخیرہ لاحاصل بن بن کر ان ہی راہوں میں ضائع ہوا بلکہ انسانی جانوں تک کو بھینٹ چڑھانے والوں نے بھینٹ چڑھایا اس کا ماتم کس سے کیجئے۔

(باقی)

"ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات"

از

(مولانا ابوسلمہ شفیع احمد البہاری استاذ مدرسۂ عالیہ کلکتہ)

مولانا المحترم جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے ہند میں علم حدیث پر مقالات کا ایک سلسلہ لکھا جو معارف کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا، اس سلسلے میں جناب ممدوح نے حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک کے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ بسط کے ساتھ فرمایا ہے۔[1]

لیکن زمین اتنی سنگلاخ تھی کہ مولانا جو ایک ایک دانہ کو چن چن کر خرمن بنانے کے عادی ہیں عاجز آ گئے اور یہ اعتراف کرنا پڑا کہ

کئی سال ہوئے جب میں نے ہندوستان میں علم حدیث، کا سلسلہ لکھنا شروع کیا تو بکھرے ہوئے معلومات کو اکٹھا کرنے اور الجھے ہوئے بیانات کو سلجھانے میں وہ زحمت اٹھانی پڑ گئی کہ آخر اس کو ناتمام چھوڑنا پڑا۔[2]

پھر بھی جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا گیا وہ بہت قیمتی تھا، مگر مولانا نے اپنے اس مضمون میں تصانیف و تالیف کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اپنی بضاعت اور اپنے ماحول کے مطابق حصہ لیا یا نہیں؟ اس لئے جناب ڈاکٹر زبید احمد صاحب الہ آباد یونیورسٹی نے علوم حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات،" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا اور یہ فیصلہ دیا کہ ہندوستان کی جغرافی و سیاسی دشواریوں اور دقتوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس خدمت سے کما ینبغی عہدہ برآ ہوتے۔"

---

[1] معارف نمبر ۶ ج ۵۰۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب [2] مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مضمون میں عہد غزنوی سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے غدر تک کے پہلے ان چھیالیس (۴۶) مصنفین و مؤلفین کے اسماء گرامی جمع کیے جنہوں نے عربی زبان میں علم حدیث کے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی اور اس فہرست سے نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی وغیرہ اور ان کے معاصرین کو خارج کیا اور یہ فرمایا کہ

ان مصنفین کی ستر تصانیف ایسی ہیں جن میں سے کچھ تو چھپ چکی اور بقیہ ہاتھ کی لکھی ہوئی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اور پھر

ان ستر کتابوں میں سے بائیس کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں

اس لیے ڈاکٹر صاحب نے انہی بائیس کتابوں کا ذکر کیا اور اس کی فہرست یہ دی۔

(۱) چھ[1] کتابیں تو صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کی شروح و حواشی ہیں۔

(۲) تین تالیفات ایسی ہیں جن میں حدیث کے سابق مجموعوں کو نئی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔

(۳) ایک کتاب لغت حدیث پر ہے۔

(۴) ایک کتاب اربعین یعنی رسالہ چہل حدیث ہے

(۵) دو ایسے رسالے ہیں جن میں ایک خاص جدید نقطۂ خیال سے حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے

(۶) تین ایسی کتابیں ہیں جن میں خاص خاص مسائل و مباحث کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں

---

[1] لمعات، حاشیہ صحیح البخاری للسندی، مسوی، شرح تراجم ابواب بخاری، محلی شرح موطا، المواہب اللطیفہ فی شرح مسند الامام ابی حنیفہ، (۲) مشارق الانوار، کنز العمال، مسند امام اعظم مرتبہ عابد سندھی (۳) مجمع بحار الانوار (۴) اربعین للشاہ ولی اللہ الدہلوی (۵) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین للشاہ ولی اللہ دہلوی، کتاب النوادر من الحدیث للصغانی (۶) تلخیص البیان فی علامات مہدی آخر الزمان للشیخ علی متقی، ماثبت بالسنۃ فی السنۃ للشیخ عبد الحق محدث الدہلوی، تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ (۷) حجۃ اللہ البالغۃ (۸) الفیض النبوی فی اصول الحدیث، فہارس البخاری لمحمد عارف پٹنی (۹) در السحابۃ للصغانی، اسماء رجال مشکوٰۃ للشیخ الدہلوی (۱۰) الموضوعات من الحدیث للصغانی تذکرۃ الموضوعات لمحمد طاہر پٹنی۔

(۷) ایک تصنیف اپنی ایسی ہے جس میں اسرارِ حدیث کا انکشاف کیا گیا ہے۔

(۸) ایک تالیف اصولِ حدیث پر ہے۔

(۹) دو رسالے اسماء الرجال کے متعلق ہیں۔

(۱۰) دو رسالے موضوع حدیثوں پر ہیں کل ۲۲

پھر سلسلہ شاہ ولی اللہ کی خدمتِ حدیث، کے عنوان سے مولانا ظفر احمد صاحب حقانی نے اپنا ایک گراں قدر مقالہ اورینٹیل کانفرنس بنارس کے شعبہ اسلامیات میں پڑھ کر سنایا جس کا موضوع امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے تلامذہ کی خدمتِ حدیث ہے، یہ مقالہ اگرچہ رجال و اشخاص سے بحث کرتا ہے پھر بھی بہت سی قابلِ قدر تصانیف کا احاطہ کئے ہوئے ہے، (اور وہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے)

اس کے کچھ دنوں بعد جناب مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی کا ایک مضمون اسی موضوع پر معارف کے دو نمبروں میں (اکتوبر و نومبر ۱۹۴۵ء نمبر ۴ و ۵ ج ۵۶) آیا جس کے متعلق موصوف نے خود یہ دعویٰ کیا کہ مضمون ایک حیثیت سے گویا اس کا ڈاکٹر زبید احمد صاحب کے مضمون کا تکملہ ہے[1]

پر ڈاکٹر صاحب کا مضمون، اہم و مشہور عربی تالیفات یا تصنیفات تک محدود تھا مگر مولوی صاحب موصوف نے اس تحدید کو ختم کر کے عام کر دیا یعنی اس میں فارسی، اردو کی بھی ہر طرح کی تصانیف کو شمار کر لیا۔

اس طرح ان کے مضمون میں ۱۸۳[2] مؤلفات اور ۱۰۴ مؤلفین کا ذکر آ گیا جو باعتبار فن

---

[1] معارف نمبر ۴ ج ۵۶۔ [2] تفصیل انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو (۱) اصولِ حدیث پر ۷ (۲) اسماءِ حدیث پر ۱۱ (۳) تخریجات پر ۶ (۴) رجال پر ۳ (۵) غریب الفاظ پر ۳ (۶) شروح بخاری ۱۰ (۷) شروح مسلم ۵ (۸) شرح ابو داؤد ۱ (۹) شرح نسائی ۱ (۱۰) شروح ترمذی ۲ (۱۱) شروح ابن ماجہ ۳ (۱۲) شروح مسند احمد ۱ (۱۳) شروح موطا مالک ۲ (۱۴) شروح مشکوٰۃ ۶ (۱۵) شرح بلوغ المرام ۱ (۱۶) کتبِ متفرق ۲۰ (۱۷) سیرۃ ۱۳ (۱۸) سیر و مناقب ۱۸ (۱۹) مدونات ۱۲ (۲۰) موضوعات ۲ (۲۱) اربعینات و شروح ۱۲ (۲۲) اوراد و وظائف ۳ ۔ کل ۱۸۱ ؟

۲۲ اقسام پر منقسم ہیں مگر سنہ کی تحدید انھوں نے نہیں قایم رکھی اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ کو نہیں چھیڑا۔

مندرجہ بالا فہرست سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی حدیثی تصنیفات کا کل سرمایہ اسی قدر ہے۔ حاشا و کلا نہ کسی نے احاطہ کا دعوی کیا اور نہ عملاً ممکن ہے اس لئے اس سے استنباط بھی غلط۔

لہ یہ اس ہندوستان کی تصانیف ہیں جس کے متعلق ہر کس و ناکس یہ اعلان کرتا پھرتا ہے کہ ہندوستان فن حدیث سے بالکل کورا تھا اور چند مخصوص کتب کے سوا سارے ذخیرہ احادیث سے بے خبر تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے علماء و مشائخ بھی رطب و یابس، غث و سمین اور صحیح و موضوع میں تمیز نہ کر پاتے تھے اور اس سلسلہ میں اس مناظرہ کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے سماع کے جواز کی سند میں یہ حدیث پیش کی کہ السماع مباح لاھلہ، اور بادشاہ یہ حدیث سن کر بہت متاثر ہوا۔ "سبحانک ھذا بھتان عظیم" صاحب سیر الاولیاء نے اس مناظرہ کی پوری تفصیل نقل کی ہے مگر کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے اور اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے جیسا کہ تاریخ فرشتہ نے نقل کیا ہے تو مخالفوں نے اس فقرہ کو صرف ضد، ہٹ دھرمی حسد، شرارتِ نفس کی بنا پر حدیث کہہ کر مشہور کر دیا (نظام تعلیم و تربیت ج ۲ ص ۲۳۵)

لہ نواب صاحب کے متعلق ایک عیسائی عالم نے اپنی کتاب اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع میں یہ لکھ مارا کہ "نواب صاحب معمولی آدمی تھے مگر کسی صورت سے بھوپال پہنچے اور وہاں ملکہ سے شادی کر لی جب مال و دولت پر قبضہ ہو گیا تو اپنے یہاں علماء کو جمع کیا اور اطراف عالم میں لوگوں کو بھیج کر قلمی نسخے خریدے اور بڑا کتب خانہ جمع کیا اور علماء کو تالیف و تصنیف پر مجبور کیا پھر ان کی تصانیف کو اپنایا اور اپنے نام اسی طرف منسوب کیا اور صرف یہی نہیں کہ اپنے علماء کی تصانیف پر قبضہ کر لیتے تھے بلکہ متقدمین کی وہ کتابیں جس کا نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہوتا تھا اس میں تغیر و تبدل اور کاٹ چھانٹ کر کے ٹائٹل پیج پر اپنا نام بڑے بڑے القاب کے ساتھ لکھ دیتے تھے اور شائع کرتے تھے۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کو مندرجہ بالا خیالات پڑھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس نے نواب کا تذکرہ ایسے انداز میں کیا اور یہ فرمایا کہ

"اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کے متعلق اس قسم کی باتیں ہندوستانی مولویوں میں بھی مشہور ہیں اور غالباً کسی ہندی مولوی ہی سے مصر کے اس عیسائی عالم کو اس کا سراغ ملا لیکن خود نواب
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ذیل میں چند کتب کا اور نام لیتے ہیں جو ان دونوں حضرات کی فہرست میں آنے سے رہ گئی ہیں۔

(۱) شرح شمائل ترمذی۔ مؤلفہ مولانا نور الحق صاحب م ۱۰۷۳ ابن الشیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔

(۲) سرور المحزون۔ شاہ ولی اللہ الدہلوی

(۳) اربعین۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

(۴) فتح الغفور۔ ملا حیات السندھی رح

(۵) رسالہ منع قراۃ خلف الامام مولانا خرم علی بلہوری م ۱۲۶۰ھ

(۶) شرح در السحابہ امام حسن صنعانی لاہوری م ۶۵۰

امام صنعانی رح نے در السحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ میں اپنی ایک مختصر کتاب اور اس کے ذیل کو جس میں صحابہ کے وفات کے مقامات کو بیان کیا تھا بہ ترتیب حروف تہجی یکجا کر دیا تھا اس میں تقریباً آٹھ سو صحابہ کے مقامات رحلت کا ذکر ہے پھر اس کی شرح لکھی اور یہی شرح فہرست میں آنے سے رہ گئی ہے متن یعنی اصل کتاب درۃ السحابہ کا ذکر ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں ہے۔ مولانا رحمان علی صاحب لکھتے ہیں کہ

درۃ السحابہ[۱] و شرح[۲] درۃ السحابہ در علم حدیث (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۹)

(۷) فی الضعفاء والمتروکین فی رواۃ الحدیث للصنعانی رح

(۸) شرح اسماء الرجال للبخاری للشیخ عبد الحق محدث دہلوی رح

(۹) سلک الدرر۔ لفصعت اسمال۔ در سیرۃ نبویہ علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ۔ مؤلفہ محمد صدیق لاہوری م ۱۱۹۲ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے ملنے والوں سے جہاں تک میں نے سنا ہے عقیدتاً اور عملاً ان کی حالت جیسی کچھ ہو لیکن علم کی سب تعریف کرتے ہیں (نظام تعلیم ص ۱۳ ج ۲) کہنا یہ ہے کہ راقم الحروف ایسی توثیق کا قائل نہیں کیونکہ یہ بھی الٹی باتوں میں سے ایک ہے جو ہندوستانی مولویوں میں مشہور ہیں۔

(۱۰) شرح اسمائے حسنیٰ ملا مبین لکھنوی م ۱۲۲۵ھ

(۱۱) زینۃ النکاۃ فی شرح المشکوٰۃ ۔ سید محمد ابو المجد محبوب عالم م ۱۱۱۱ھ

(۱۲) مدارج الاخبار خواجہ ارزانی محدث جونپوری م ۱۱۸۹ھ یہ حضرت مخدوم شیخ ارزانی کے لڑکے اور مرید تھے صاحب زہد و تقویٰ اور تمام علوم و فنون میں ماہر تھے اپنے زمانہ کے مشہور علمائے محدثین میں سے تھے احادیث مشارق کو جو بہ ترتیب حروف تہجی ہیں حسب ترتیب مصابیح الانوار تالیف کر کے اس کا نام مدارج الاخبار رکھا عہد شیر شاہ میں درجہ وزارت تک پہنچے

(۱۳) رسالۃ التسلیم مولوی محمد سلیم مچھلی شہری م ۱۲۲۶ھ ابتدائی تعلیم مولوی علی اکبر مچھلی شہری سے اور تکمیل مولانا محمد شکور سے کی اور ملا رحمت اللہ کابلی سے بھی فیض حاصل کیا ملازمت سرکاری میں منصفی سے صدر الصدور تک پہنچے

(۱۴) سیرۃ الرسول (عربی) مؤلفہ مولوی کرامت علی صاحب دہلوی ۔ جو مولانا شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے شاگرد رشید تھے ۔ ناصر الدین غفران منزل کے زمانے میں حیدر آباد آئے اور یہیں فوت ہو کر مدفون ہوئے، ان کی سیرۃ نہایت ضخیم کتاب ہے جو سیرۃ المحمدیہ کے نام سے چھپ گئی ہے ۔ سیرۃ حلبیہ اور مواہب لدنیہ وغیرہما کی تلخیص ہے لیکن ان کا سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا اور نہ اس وقت کوئی کتاب ہے جس کی طرف رجوع کیا جا سکے ۱۱۶۵ھ تک بقید حیات تھے اگر ان کی وفات ۱۲۷۳ھ کے قبل ہے تب تو یہ سیرۃ پاک استدراک میں آجاتی ہے ورنہ نہیں ۔

(۱۵) سیرت پر ایک رسالہ قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتی کا بھی ہے جسے حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش سے تالیف کر کے ان کی خدمت میں گذرا تھا جسے حضرت نے بہت پسند فرمایا ۔

لہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ و دیگر اکابر و اعاظم کو صاحب تراجم علمائے حدیث ہند مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی نے اہل حدیث (غیر مقلد) ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اب راقم الحروف ۱۸۵۷ء کے بعد کی بعض حدیثی تصنیفات کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے سنگ میل بن سکے، جامع اور مکمل فہرست نہیں ہے، بلکہ ما حضر، پیش خدمت ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں ترجمہ بھی ہوا اور تصنیف بھی اور انہی دونوں کاموں کا شمار علمی خدمت میں تھا مگر ممالک اسلامیہ اور یورپ میں ان دونوں کاموں کے ساتھ ایک اہم علمی کام یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم اور نایاب کتابیں جو اب تک غیر مطبوع ہیں ان کے متعدد نسخے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے جائیں اور بعد از تصحیح و مطابقت طبع کرا کر شائع کیا جائے اس لحاظ سے ہندوستان تہی دامن تھا کچھ انفرادی کام ضرور ہوئے اور جس سے جو بن آیا کر گذرا مگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اس سے زیادہ تعجب و افسوس اس پر ہے کہ علمائے احناف جواب دینے کے پیچھے پڑ گئے (چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اپنے سابق الذکر مضمون میں ایسا ہی کیا ہے) حضرت قاضی صاحبؒ کی ایک مشہورِ عالم تصنیف مالابد منہ (فارسی) ہے جسے یگانہ و بیگانہ سب انہی کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کے آخر میں ایک وصیت نامہ ہے اس میں قاضی صاحب اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک نہایت اہم نسخہ ہے جو شاہ صاحب کی درسگاہ میں زیر درس رہا ہے اس پر شاہ صاحب کے دست خاص سے ایک تحریر ہے اس کتاب کے آخر میں حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں جس کا ترجمہ ذیل ہے۔

اس کو ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود نے اپنے ہاتھ سے لکھا جو نسباً عمری وطناً دہلوی عقیدۃً اشعری طریقۃً صوفی عملاً حنفی اور تدریساً حنفی شافعی اور تفسیر و حدیث و نحو و عربیت اور کلام کا خادم ہے سہ شنبہ ۲۳ رشوال ۱۱۵۹ھ

اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ عبارت ہے۔ ایں خط والد بزرگوار است بے شبہ نمقہ الفقیر محمد رفیع الدین۔ ع جمعیت یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما۔ اسی کتاب میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ یہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ نجاح الحاجۃ والے ہیں جن کا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان سے کوئی نسلی اتصال نہیں ہے۔ نیز تفسیر موضح القرآن کو شاہ رفیع الدین صاحب کی تالیف بتایا ہے یہ بھی صحیح نہیں یہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی فیوضات

موجودہ دور میں ایسے کاموں کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں ۔ خدا جزائے خیر دے عماد الملک مرحوم، ملا عبد القیوم صاحب مرحوم اور مولانا انوار اللہ خاں صاحب مرحوم کو جنہوں نے دائرۃ المعارف کی بنیاد ڈال کر ایک اہم مذہبی و ملی فریضہ کو پورا کیا ۔ دائرۃ المعارف بلاشبہ ہندوستان کی عزت و آبرو اور مشرق میں اپنے طرز کی واحد علمی مجلس ہے جس نے عربی زبان کی قدیم تصنیفات کی حفاظت اور ان کی طبع و اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لے کر سینکڑوں قدیم ضخیم عربی کتابوں کو تلف و بربادی سے بچا کر ارباب علم کے ہاتھوں تک پہنچا دیا

و نیز مولانا رحیم الدین صاحب مفتی صدارت عالیہ حیدر آباد کی مساعی سے حیدر آباد ہی میں ایک اور مفید مجلس احیاء المعارف النعمانیہ قائم ہوئی ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ متقدمین ائمہ و علمائے احناف کی وہ تصنیفات جو دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں قلمی موجود ہیں انھیں صحت اور خاص اہتمام سے شائع کیا جائے اور اسی طرح وہ مطبوعہ کتابیں جو نایاب ہو چکی ہیں ان کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جائے آخیر میں ایک اور علمی مجلس، مجلس علمی کے نام سے ڈابھیل ضلع سورت میں قائم ہوئی جس نے اپنی بساط بھر بہت سی مفید علمی خدمات انجام دیں غرضیکہ مختلف ادارے قائم ہوئے ۔ کن کن کا نام لیا جائے ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک اسلامیہ مجبور ہوگئے کہ اس ہندوستان کو جس کی تحقیر و تذلیل میں اپنے نہیں شرماتے تھے ۔ صرف خراج عقیدت ہی پیش نہ کریں بلکہ یہ اعتراف کریں کہ فن حدیث صرف علمائے ہند کی بدولت زندہ ہے چنانچہ دنیائے اسلام کی نمائندہ ہستی علامہ سید رشید مصری مرحوم نے جب علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کو خط لکھا تو اس میں بھی تذکرہ کیا کہ

"حدیث و رجال کی کتابیں جس قدر دائرۃ المعارف کے ذریعہ سے شائع ہو رہی ہیں تمام دنیائے اسلام اس کے لئے ہندوستان کی مرہون منت ہے۔"[1]

علامہ مرحوم نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدمہ میں بھی اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ

---

[1] معارف نمبر ۶ ج ۱۵ ص ۴۰۴

سے کیا کہ

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الهند لعلوم الحدیث لقضی علیها بالزوال

بعض مستشرقین کو یہ کام ایک آنکھ نہیں بھایا اور جب بھی ان کو بولنے کا موقع ملا ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ہجو ہی کی چنانچہ مستشرقین کی بین الاقوامی موتمر کے اٹھارہویں اجلاس منعقدہ لائڈن ۷-۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر کرنیکو نے انگریزی زبان میں ایک مقالہ جس کا موضوع "بعض کتب جن کی اشاعت ہندوستان میں زیر تجویز ہے" تھا پڑھا اس میں آپ نے فرمایا کہ

"ہندوستان میں لوگ زیادہ تر تصوف اس سے اتر کر فقہ کی کتابوں کی طرف مائل ہیں باقی علوم و فنون سے دلچسپی بہت کم ہے۔ دائرۃ المعارف والے بغیر اعراب و فہارس کے کتاب چھاپتے ہیں الدرر الکامنہ لابن حجر کی چار جلدیں وہاں چھپ گئی ہیں میں نے ان کا انڈکس تیار کیا تھا مگر دائرہ نے اپنی خوش فہمی سے فیصلہ کیا کہ بجائے انڈکس کے مولوی عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ایک کتاب بطور پانچویں جلد کے شائع کی جائے۔

علی گڈھ میں ایک مدت سے قانون مسعودی کی اشاعت کی تجویز درپیش ہے میں نے وہاں کے ایک صاحب کے ساتھ مل کر اس کام کو ہاتھ لگایا مگر ان کی نااہلیت یعنی انگریزی سے ناواقفیت کے سبب کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"[1]

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ باقی علوم و فنون سے دلچسپی بہت کم ہے اس کا جواب ہندوستان ۱۹۳۱ء کے قبل سے عملاً دے رہا ہے اگر ڈاکٹر صاحب چشم پوشی فرمائیں تو ع

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

باقی رہی "درر کامنہ" والی بات اس بات کا نہایت معقول اور خوبصورت جواب ہندوستان نے یہ دیا کہ اس کی ترتیب حروف تہجی پر ہے اس لئے ایسی کتاب میں انڈکس

---

[1] معارف نمبر ۳ ج ۳۰

کا اضافہ فضول سا تھا اور اس سرمایہ کو کتاب مذکور کے استدراک و تکمیل میں صرف کیا تاکہ ہندوستان کا حصہ بھی اس آٹھویں صدی کی یادگار میں مناسب جگہ پا سکے۔[1]

ڈاکٹر صاحب موصوف کے محولہ بالا مضمون میں ایک کتاب ہیئت و ریاضی و جغرافیہ کی "قانون مسعودی" نامی کا بھی تذکرہ آیا ہے یہ وہ کتاب ہے جس کے متعلق علی گڈھ یونیورسٹی کی دیرینہ آرزو تھی کہ اس کو شائع کرے چنانچہ اس پر یونیورسٹی نے بے دریغ روپیہ صرف کیا اور سالہا سال محنت کی گئی۔ بالآخر بقول مولانا سید سلیمان صاحب ندوی یہ نتیجہ نکلا کہ

آں دفتر را گاؤ خورد آں گاؤ را قصاب برد

یعنی اصل قیمتی نسخہ ایک بوالہوس کی معرفت علی گڈھ سے برلن پہنچ گیا اور وہاں سے اس کا کچھ حصہ چھپ کر شائع ہوا۔[2]

ابھی یکم فروری ۵۳ء کو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند نیشنل لائبریری کلکتہ، کے افتتاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ مولانا موصوف نے حسب دستور دلربا، نشاط انگیز، وجد آفریں خطبہ صدارت پڑھا۔ اسی خطبہ میں مولانا نے یہ کہانی سنائی کہ

"اس وقت میں ۱۶ سالہ نوجوان تھا، اور تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور اپنے روایتی طریق تعلیم کے مطابق مختلف موضوعات پر طلبا کے ایک گروپ کو لیکچر دیا کرتا تھا اسی زمانہ میں سنا کہ بوہر کے جمع کردہ ذخیرۂ کتب میں البیرونی کی مشہور کتاب القانون کا ایک نادر نسخہ بھی شامل ہے۔

آگے چل کر پھر فرماتے ہیں۔

"میں اس مرحلہ پر ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے لائبریری کو گرانقدر عطیے پیش کئے اس سلسلہ میں بوہر کے منشی صدرالدین کا نام سرفہرست ہے، منشی صاحب میر جعفر کے میر منشی

---

[1] معارف نمبر ۳ جلد ۳۰ [2] معارف نمبر ۳ جلد ۲۹

تھے اور شاہ عالم کے دربار میں بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی یاد عہدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے علمی شغف کی بناپر تازہ رہے گی۔

"موصوف نے بوہر میں ایک کتب خانہ قائم کیا اور اس میں ہر طرح کی قیمتی کتابیں جمع کیں ان کے مجموعہ کتب میں البیرونی کی کتاب القانون کا ۱۲ ویں صدی کا ایک نسخہ بھی شامل ہے اس نسخہ پر فاضل خاں کی مہر ثبت ہے جو شاہجہاں کا امیر تھا اور بعد میں اورنگ زیب کا وزیر ہوا، اسی کتاب کے مطالعہ کے لئے مولانا ۱۶ برس کی عمر میں کتب خانہ تشریف لائے تھے لیکن جب مرزا افضل الدین احمد نے مرے واسطے پاس طلب کیا تو لائبریری اسسٹنٹ نے بغور میری طرف دیکھا اور میری عمر پوچھی میں نے کہا ۱۶ سال۔ یہ سن کر اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ۱۸ سال سے کم عمر لوگوں کو مطالعہ کی اجازت نہیں دی جا سکتی"

اسی لئے[1] مولانا نے خطبۂ صدارت کا عنوان ہی یہ قائم کیا کہ "۴۸ سال پہلے اس کتاب خانہ میں" مجھے داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی"

"آج میں سب کے واسطے اس کے دروازے کھول رہا ہوں" (الجمعیۃ ۲ر فروری ۱۹۵۳ء)

کہنا یہ ہے کہ راقم الحروف کی جہاں تک ناقص معلومات ہیں نیز ناظم کتب خانہ بوہر سے معلوم ہوا ان دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ البیرونی کی القانون کبھی بھی نیشنل لائبریری کی زینت نہیں بنی ہے غالباً مولانا کو یہاں اختلاط ہوا اور یہ واقعہ یا تو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا ہے یا پھر کسی دوسری کتاب کے ساتھ ایسا ہوا۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں یہ کتاب تھی اور غالباً وہیں سے علی گڈھ پہنچی تھی۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

---

[1] غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں ٹیونس کے مشہور زعیم عبدالعزیز ثعلبی نامی ہندوستان تشریف لائے تھے ثعلبی صاحب نے زعمائے ہند سے مل کر اپنے تاثر کا اظہار مولانا عبدالمجید الحریری البنارسی سے کیا مولانا بنارسی فرماتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے متعلق ان کا تاثر یہ تھا کہ الفاظ کا بادشاہ۔ لفظوں سے کھیلنے والا انسان کلکتہ کے مشہور پنڈت بھگوانداس نے جب ثعلبی صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو صرف پانچ منٹ وقت دیا لیکن جب ملے تو پھر ۱۸ گھنٹے مسلسل بات چیت ہوتی رہی۔

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

از

(جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب)

(۳)

الفاظ کا منزل من اللہ ہونا، ظاہری و باطنی فوائد کا حامل، الفاظ کی تلاوت سے خدا کی ہم کلامی کا شرف، ان کے حفظ سے قوت حافظہ و کمالِ رسوخ کا حصول، ان کے تذکر و تکرار سے روح کو تسکین، دل کو تسلی اور عبرت و عمل کی تحریک ہوتی ہے۔

اور معانی کا من جانب اللہ ہونا، قرآن مجید کے روحانی اعجاز، معنوی خصائص، اور باطنی تاثیر کے تمام پہلوؤں کو محیط، استنباطِ علوم و حقائق اور استخراج، مسائل و احکام، فہم و تاویل اور ترجمہ و تفسیر کی وسعتوں پر شاہد ہے۔

لفظی اشتراک کے باوجود بعض اصطلاحات مفہوم و مصداق کے اعتبار سے مختلف ہوتی اور ہو سکتی ہیں اس لئے یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس مضمون میں قرآن مبین کی تفسیر و تاویل اور معنی فہمی کے اصول و قوانین کے سلسلہ میں علماء مفسرین و ائمہ تفسیر کی اصطلاحات ذکر کی جائیں گی۔ اور یہ ایسی جامع و حادی ہدایات ہیں جو قرآن مکرم سے ہر قسم کے علوم و حقائق اور مسائل و احکام وغیرہ کے استنباط و استخراج پر منطبق ہو سکتی اور صادق آسکتی ہیں۔ گویا یہ اصطلاحیں قرآن مقدس کی معنی فہمی کے سلسلہ میں اصولِ موضوعہ اور علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔

تھوڑے تھوڑے ظاہری فرق کے ساتھ ائمہ تفسیر و علماء مفسرین نے بھی علم تفسیر کی مختلف تعبیریں اور تعریفیں کی ہیں (جن کا اجمالی بیان ہم نے ایک دوسرے مضمون میں کیا ہے) یہ مضمون بھی انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب برہان میں شائع ہوگا۔ مگر ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ جو ذیل کی

تعریف سے صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

تعریف علم تفسیر:۔ علم تفسیر وہ علم ہے جس میں نظم قرآن مجید کے معانی سے قواعد عربیت کے مقتضا کے مطابق بحسب طاقت بشری بحث کی جائے۔

فوائد قیود:۔ کسی تعریف کے صحیح ہونے کے لئے اس کا اپنے افراد کو جامع ہونا (یعنی ان سب افراد پر صادق آنا جو اس کے تحت میں ہیں) اور دخول غیر سے مانع ہونا (یعنی ان افراد پر جو اس کے تحت میں نہیں ہیں منطبق ہونے سے محفوظ ہونا) ضروری ہے۔ اور جو تعریف ایسی ہوتی ہے وہ تعریف جامع مانع کہلاتی ہے۔ تعریف کا جامع مانع ہونا اس تعریف کے قیود و شرائط کی تشریح و توضیح کا متقاضی ہے۔ اس لئے تعریف پر قوسین میں دیئے ہوئے نمبروں کے مطابق فوائد قیود ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ تعریف کا جامع مانع ہونا درجۂ ثبوت وصحت کو پہنچ جائے۔ تمام امور میں اختصار و جامعیت کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ورنہ صفحوں کے صفحے بھی تشریح سے مستغنی نہیں کر سکتے۔

تفسیر کے لغوی معنے ہیں توضیح و کشف اور ایضاح و تبیین، یہ لفظ ماخوذ ہے "فسر" سے جو کہ باب ضرب سے بیان کرنے اور واضح کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ باب تفعیل میں لاکر کشف و ایضاح کا مبالغہ مقصود ہے۔

قرآن مجید کے معنی و مراد کے اظہار کی تعیین و تشخیص کے لئے دو لفظ اصطلاح میں عام طور پر استعمال میں آتے ہیں۔ اور ان کا اطلاق اصطلاحِ شرعی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ان میں سے ایک لفظ ہے تفسیر اور دوسرا ہے تاویل۔

تفسیر کہتے ہیں خوب کھول کھول کر بیان کرنے کو جو کہ بواسطہ نقل و روایت کے ہو۔ یعنی لفظ کے معنی و مراد کی تعیین و تشخیص (اور اثبات و تقریر) جو مسموعات اور مرویات و منقولات کے ذریعہ سے کی جائے۔ اور وہ نقل و روایت

یا تو (الف) خود قرآن مجید ہی سے ہو۔ جیسا کہ مشہور و معروف مقولہ ہے اور عند الکل مسلم کہ اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا یعنی قرآن مجید کا ایک حصہ خود دوسرے حصہ کی تفسیر و توضیح کرتا ہے۔

اور ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے: اِنَّ الْقُرْآنَ یُصَدِّقُ بَعْضُہٗ بَعْضًا فَلَا تُکَذِّبُوْا بَعْضَہٗ بِبَعْضٍ [۱] یعنی قرآن مجید کا ایک مقام دوسرے مقام کی تصدیق و تائید اور تثبیت و تاکید کرتا ہے، (اس لئے قرآن مجید کو اول سے لے کر آخر ایک مربوط و منضبط اور مسلسل کلام سمجھو۔ اور اس کی معنی فہمی میں) ایسی صورت اختیار نہ کرو کہ بعض حصے سے بعض کی تکذیب و انکار یا ابطال و تردید لازم آئے۔

یا (۲) سنت نبوی اور احادیث رسول سے ہو۔ جیسا کہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ اَلسُّنَّۃُ شَارِحَۃٌ لِلْکِتَابِ یعنی حدیث نبوی متن قرآن کے لئے بمنزلہ شرح کے ہے۔

یا (۳) آثار صحابہ و تابعین سے ہو۔ کیوں کہ بحکم و تصریح کتاب و سنت یہ حضرات خیر القرون میں موجود۔ نزول قرآن اور علوم و اعمال قرآنی کے عینی شاہد۔ ان کا ایمان کامل۔ نور فراست سے منور اور عمل صالح سے مزین ہیں۔ خود قرآن مجید اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی عدل و عدالت اور فضل و کرامت کے ذمہ دار ہیں۔

یا (۴) اصول و قواعد عربیت یعنی ادب و بلاغت عرب اور اسالیب عربیت سے ہو۔ بشرطیکہ وہ (الف) بداہت عقل۔ اور (ب) ضروریات دین۔ ان ہر دو کے خلاف نہ ہو۔

قرآن مجید۔ اوّل سے لے کر آخر تک اپنی ذات میں ایک مستقل کتاب ہے ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ اور کتاب بھی کیسی مرتب و مربوط ، مسلسل و منضبط کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیَاتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ لیکن عام انسانی تصنیفات اور کتابوں کی طرح نہیں کہ اس میں کسی خاص عنوان کے تحت میں خاص ترتیب کے ساتھ چند مضمون جمع کر دئے گئے ہوں۔ بلکہ اس کی ترتیب بھی الٰہی اور قدرتی ہے۔ جس کو ترتیب توقیفی کہتے ہیں۔ اور اگرچہ موجودہ توقیفی ترتیب ، نزولی ترتیب کے خلاف ہے مگر لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق ہے اور یہ سب "توقیف" ہے یعنی شارع علیہ السلام کی بتائی ہوئی اور مقرر کی ہوئی ہے جو منشاء خداوندی کے موافق ہے۔

اس میں سات منزلیں ہیں۔ ایک سو چودہ سورتیں۔ اور مشہور قول کی بنا پر چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ

---

[۱] جمع الفوائد ج صفحہ ۲۶

آیتیں ہیں۔ اور یہ سب توقیفی اور من عند الشارع ہیں قرآن مجید تمام کا تمام محکم و مستحکم اور باحکمت آیات و مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی کل آیات تین قسم کی ہیں۔ مقطعات۔ متشابہات اور محکمات

قرآن شریف کی ہر آیت بھی اپنی ذات میں کلام کی لفظی حیثیت سے بھی اور مضمون و معنی کے اعتبار سے بھی مستقل اور محکم و مستحکم ہے۔ اس کی ہر آیت سے فائدہ تامہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کسی بیرونی امر یا خارجی ضمیمہ اور قصہ و واقعہ پر خواہ وہ امر خارجی قطعی و یقینی ہو یا ظنی و قیاسی موقوف و منحصر نہیں۔ خود اپنی ذات میں تام، کامل، مفید اور غیر ناقص ہے۔ جو کہ ایک کلام موضوع للمعنی اور مساق بالا مراد کی شان ہوتی ہے۔ لیکن قرآن شریف کے معنی و مراد کا صحیح تعین چار طریقوں پر ہوتا ہے۔ عبارت سے۔ اشارت سے۔ دلالت سے۔ اقتضاء سے۔ سب سے پہلے لغت، صرف، نحو، معانی، بیان و بدیع کے اعتبار سے۔ عبارت قرآن، نظم کلام اور نص کتاب کو دیکھا جائے اور اس کی صحت تصحیح کے ساتھ معلوم کر کے۔ پھر خصوص و عموم و اشتراک اور حقیقت و مجاز کی لفظی تحقیق اور صراحت و کنایہ ظہور و خفا کے معنوی استعمال پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اس کے بعد حاصل شدہ معنے و مفہوم اور مطلب و مراد کو دوسری آیات و نصوص اور عبارت و نظم سے تطابق یا تقابل کرنا چاہیئے۔ اس مقابلہ و تقابل میں چار صورتیں پیش آئیں گی۔

(۱) یا تو — ایک آیت دوسری آیت کی کامل موئد و مصدق اور بالکل موافق و مرادف ہوگی تب تو دونوں برابر اور مضمون اپنی قطعیت کے اعتبار سے ثابت و مستحکم ہوگا۔ یا دونوں آیتوں میں کامل طور پر توافق نہ ہوگا بلکہ ایک آیت دوسری آیت کی فی الجملہ (یعنی بعض صورتوں میں) موئد و مصدق یعنی معین ہوگی تو دونوں آیتوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کا تفاوت اس طرح کیا جائے گا کہ اعلیٰ پر حکم کا مدار رکھیں گے اور ادنیٰ سے تائید و شہادت کے معانی حاصل کریں گے۔ اور اگر ایک آیت کا دوسری آیت سے تطابق و توافق نہ ہو بلکہ تعارض و تضاد ہو تو ان میں تعارض و نسخ کے قاعدہ کے مطابق اعلیٰ کو مقبول اور ادنیٰ کو متروک قرار دیں گے۔

آیاتِ محکمات کا درجہ سب سے ملبند ہے۔ اور ان سے ثابت شدہ عقیدہ علم اور علم و عمل واجب القبول اور واجب العمل ہے۔ آیات متشابہات میں تاویلِ مقبول مستحسن ہے ورنہ سکوت مختار و محمود ہے۔ آیات ثانوئہ ظنیات کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کا درجہ قطعیات کے بعد ہے۔ عربی زبان کے محاورہ اور اسلوب کے مطابق قرآن شریف میں بھی کبھی کبھی سکوت کو کلام کا قایم مقام سمجھا گیا ہے حالانکہ سکوت کلام کی ضد ہے اور یہ دونوں آپس میں متضاد ہیں۔ لیکن کبھی کبھی عام بول چال روزمرہ اور محاوراتِ زبان میں سکوت مجازاً کلام بن جاتا ہے اور سکوت سے کلام کا کام لیا جاتا ہے۔ گویا سکوت کو کلام کا قایم مقام اور اس کا تابع، نائب اور خلیفہ بنا دیتے ہیں۔

سکوت اور کلام جب باہم متضاد ہیں تو ان کی وضع اور اغراض میں بھی لامحالہ باہم منافات ہوگی۔

زبان و کلام اس لئے موضوع ہے کہ ہم اپنے مافی الضمیر کو اس کے ذریعہ ظاہر کریں اور اپنے خیالات کو کلام کے واسطہ سے بیان کریں۔ تاکہ سامع ہمارے خیالات اور مافی الضمیر کو سمجھ جائے۔ غرضکہ کلام موضوع ہے اظہار مافی الضمیر اور بیان و تعبیر خیالات کے لئے۔ اور سکوت اس کے خلاف ہے۔ سکوت میں ضروری ہے کہ ہم نہ کچھ ظاہر کرسکیں اور نہ دوسرا (سامع یا مخاطب) کچھ سمجھ سکے۔ لہذا دونوں میں تضاد اور منافات ہوئی۔

مگر خاص خاص اعتبار سے کبھی سکوت کو کلام کا حکم دیتے ہیں۔ اور کلام کا تابع بنا کر سکوت سے اس کی وضع کے خلاف کلام کا کام لیتے ہیں۔ اور ان خاص اعتبارات و وجوہ کی بناپر سکوت مجازاً کلام بن جاتا ہے۔ گویا سکوت سے اس کی حقیقت کے برعکس مجازی اعتبار سے کلام کا کام لیتے ہیں اب گویا کلام اصل اور سکوت اس کی فرع ہوجاتی ہے کلام حقیقت ہے اور سکوت (بعض حالات میں، بعض اعتبارات و وجوہ کی بنا پر) کلام سے مجاز۔ لیکن کلام منطوق کے قبیلے سے ہے نہ کہ مفہوم کے، اور جس حال میں سکوت کو بیان

مانیں گے اور کلام کا نائب مناب اور مجاز قرار دیں گے۔ اس کو منطوق کے خلاف نہ ہونا چاہیے، ورنہ فرع اصل کے مخالف اور مجاز منافی حقیقت ہو جائے گا۔

جن مواقع میں خاص اعتبارات کی بنا پر سکوت کو کلام کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے ان میں سے بعض دل حیائے غالب

(۲) دفع حرج

(۳) اعتبار الفت و عادت

(۴) تحصیل حاصل

(۵) کراہت

(۶) فہم مخاطب

(۷) بیان ضرورت۔ وغیرہ وغیرہ امور ہیں۔

فنِ تاویل:۔ قرآن کریم کے معنے و مراد کے اظہار اور تعیین و تشخیص کے لئے دوسرا لفظ تاویل ہے۔ تاویل کے لغوی معنی ہیں رجوع کرنا۔ یہ ماخوذ ہے اول سے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ مبالغہ کے لئے باب تفصیل اختیار کیا گیا۔

اصطلاح میں تاویل کے معنے اور صورت یہ ہے کہ ایک لفظ جس کے معانی متعدد ہیں یعنی جو لفظ کہ متعدد معانی کا محتمل ہے اس کے ان چند معانی میں سے بعض معانی کی تعیین و تشخیص کرنا جو کہ عقل و درایت کے ذریعہ اور قواعد عقلیہ کے واسطہ سے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کے موضوع احتمالات یا محتملات ہوتے ہیں اور تاویل کی غرض ان احتمالات یا محتملات کے صحیح تعیین و تشخیص ہوتی ہے۔

غرضیکہ قرآن مجید کے معنے و مراد کی تعیین و تشخیص کے دو طریقے ہیں۔ تفسیر و تاویل۔ اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ

(۱) تفسیر میں نقل و روایت۔ اور

(۲) تاویل میں عقل و درایت ۔ کا ذریعہ معتبر و مسلم ہے۔

اور یہ یاد رکھنے اور یقین کرنے کی بات ہے کہ کلامِ الٰہی کی تفسیر و تاویل میں نقل سے نقل صحیح اور عقل سے عقلِ سلیم مراد ہوتی ہے اور صحت نقل بھی وہ معتبر ہے جو جمہور علماء کے نزدیک مسلّم اور امت کی طرف سے تلقی بالقبول کے درجہ پر فائز ہو۔ عقلِ سلیم سے وہ عقل جو ذوقِ قرآنی اور روحِ ایمانی سے تربیت شدہ ہو ۔ بے شائبہ وہم و توہمات و ہوائے نفس

اب یہاں اس علم کی تعریف میں تفسیر سے (بطور اشتراک معنوی یا عموم مجاز) ایسے عام معنے مراد لئے جاتے ہیں جو تفسیر و تاویل دونوں کو جامع اور شامل ہیں ۔ (حواشی جمل علی الجلالین صلہ) تاکہ نقل و عقل اور روایت و درایت دونوں طریقوں سے قرآنِ مجید کے معنی مرادی کی تعیین و تشخیص کی جا سکے ۔ اب جب کبھی بھی علم تفسیر بولا جائے گا تو اس سے محض منقولات و مسموعات اور طریقِ نقل و روایت ہی مراد نہ ہوگا بلکہ وہ عقل و درایت اور معقولات کو بھی شامل ہوگا ۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ فنِ تاویل، علمِ تفسیر کا ایک مستقل حصہ اور جزو ہے اور اس سے علیحدہ نہیں۔

نظمِ قرآنِ پاک :۔ ائمہ تفسیر اور تمام علماء ، قرآن مجید کی عبارات و کلمات اور الفاظ و آیات کو ادب و احترام اور کلامِ خالق و مخلوق میں فرق کرنے کی وجہ سے نظم کتاب ، نظمِ قرآنی ، متن اور نص کہتے ہیں ۔

اور جیسا کہ سابقاً ذکر کیا گیا قرآن مجید کی معنی فہمی اور تعیین و تشخیص مراد کے چار طریقے ہیں ۔ عبارت النص ۔ اشارت النص ۔ دلالت النص اور اقتضاء النص ۔ قرآن مجید کے جو معنے ان طریقوں سے ثابت ہوتے ہیں ۔ وہ قابلِ اعتماد اور لائقِ قبول ہیں ۔ اور ان پر اعتقاد و عمل واجب ہوتا ہے ۔

نص سے مراد قرآن مجید اور عبارت کے معنیٰ ہیں ۔ امر واضح و ظاہر اور بیّن و جلی ۔ تو عبارت النص کے معنیٰ ہیں کہ قرآن مجید کی عبارت سے جو امر واضح طور پر ثابت ہو۔

اشارت کہتے ہیں امر خفی و محتمل کو۔ تو اشارت النص کے معنی ہیں کہ قرآن مجید سے جو امر کہ خفی اور محتمل طریقہ سے ثابت ہو۔

دلالت وہ امر کہ جس کا لفظ اور کلام سے بطریق اولی ثبوت ہو یعنی کہ قرآن مجید سے اس کا بطریق اولی ثبوت ہے مگر اس کے لئے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

اقتضاء یہ ہے کہ شے کا ذاتی یا عارضی تقاضا ہو اور اس کا ثبوت اضطراری اور ضروری ہو۔ یعنی قرآن مجید سے شے کے ذاتی یا عارضی تقاضے کی بناء پر اس معنے و مراد کا ثبوت اضطراری اور ضروری طور پر ہو رہا ہے۔

کتاب اللہ کی تقسیم میں یہی اصطلاحیں فقہائے اصولیین کے یہاں بھی ان ہی معنوں میں مستعمل ہیں۔

نص کے دو معنی آتے ہیں ایک ظاہر، متن اور محکم و مستحکم اس معنے کے لحاظ سے قرآن مجید تمام کا تمام نص ہے اور اس نص سے قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر کلمہ و لفظ مراد ہوتا ہے۔ یہ معنی بھی اصطلاحی ہیں۔ لیکن یہی لفظ دوسرے معنوں میں بھی آتا ہے۔

اور دوسرے معنی بھی اصطلاحی ہیں ۔۔۔ اس بناء پر ہم اول معنے کو عام اصطلاح اور اس دوسرے معنے کو خاص اصطلاح کہہ سکتے ہیں۔ نص کے یہ خاص معنی لفظی تقسیم میں پائے جاتے ہیں

قرآن مجید کے عبارت و متن کے لفظی اعتبار سے یعنی نظم قرآن کے وضوح و ظہور اور خفا و اجمال کے لحاظ سے آٹھ قسمیں کی گئی ہیں۔ ظاہر۔ نص۔ مفسر۔ محکم۔ خفی۔ مشکل۔ مجمل۔ متشابہ۔ یعنی لفظ جس معنی کے لئے موضوع ہے اس معنی پر اس لفظ کی دلالت واضح و ظاہر ہے یا خفی و مجمل۔

کلمہ کے معنی اگر اس قدر واضح ہیں کہ بیان و سیاق کی ضرورت نہیں تو وہ (ظاہر) ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ سیاق اور ارادۂ متکلم بھی معین ہو مگر تاویل کا احتمال باقی ہے تو وہ (نص) ہے۔ (اور یہ نص کے دوسرے خاص اصطلاحی معنی ہیں) اور اگر تاویل کا احتمال

باقی نہیں رہا۔ لیکن کسی صورت سے منسوخ ہونا ممکن ہے تو (مفسر) اور اگر منسوخیت کی قابلیت بھی کسی وجہ سے باقی نہیں تو وہ (محکم) ہے۔ (اور یہ محکم کے دوسرے خاص اصطلاحی معنی ہیں۔ جیسا کہ ایک عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے تمام کا تمام قرآن مجید محکم اور اس کی ہر آیت محکمات کے قبیلے سے ہے) یہ کتاب اللہ کی لفظی تقسیم ہے یعنی لفظ کی اپنے معنی کے ظہور و وضوح کے لحاظ سے یہ چار صورتیں ہیں اسی طرح ان کے مقابلہ میں اجمال واستتار کی بھی چار ہی صورتیں ہیں یعنی یہ خفا بھی یا تو کسی عارضے کی وجہ سے ہے جو نفس صیغہ ولفظ کے علاوہ ہے تب تو (خفی)۔ اور اگر نفس صیغہ کے لحاظ سے خفا واستتار ہے تو اگر اس کا مفہوم بدون بیان متکلم کے حل ہو جائے تو (مشکل) اور اگر متکلم کی جانب سے اس کا بیان پایا جائے تو مجمل ورنہ متشابہ۔

ان چاروں قسموں میں سے ہر قسم ایک دوسرے سے وضوح وظہور اور اجمال و استتار کے اعتبار سے قوی سمجھی جاتی ہے۔ ظاہر سے نص۔ نص سے مفسر۔ مفسر سے محکم وضوح وظہور کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور خفی سے مشکل۔ مشکل سے مجمل اور مجمل سے متشابہ خفا واستتار کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔

تاویل تقسیم واقسام:۔ تفسیر میں نقل وروایت اور تاویل میں عقل ودرایت کے بعد، معنوی حیثیت سے تاویل یا تو بالکل تفسیر کے موافق ہوگی یا بالکل مخالف ہوگی۔ یا نہ موافق ہوگی نہ مخالف، پہلی صورت تاویل بالموافقت کہلاتی ہے اور دوسری تاویل بالمنافات اور یہی تفسیر بالرائے ہے۔ اور تیسری صورت تاویل بالسکوت ہے۔ رہی یہ چوتھی صورت کہ تاویل بعض وجہ سے تفسیر کے موافق ہے اور بعض وجہ سے تفسیر کے مخالف، اس کو کوئی مستقل درجہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ جانب غالب کا لحاظ کرتے ہوئے للاکثر حکم الکل کی بنا پر تاویل بالموافقت یا تاویل بالمنافات ہی میں داخل مانا جائے گا اور دونوں جانب کی مساوات کی شکل میں دونوں کو ساقط اور ایک جانب کے راجح اور دوسری کے مجروح

ہونے کی شکل میں اعلیٰ کو ادنیٰ پر ترجیح دیں گے۔ اور اس اعتبار سے جانبِ اعلیٰ کو ترجیح دے کر تاویل بالموافقت یا تاویل بالمنافات میں داخل مان کر تاویل کو مقبول یا مردود کہیں گے

تاویل بالموافقت جو تفسیر کے موافق ہے صحیح ہے اور مقبول۔ کیونکہ معنیٰ تفسیر کے موافق ہے صرف لفظ اور عنوان و تعبیر بدلی ہوئی ہے۔ تفسیر کے مخالف یا اس کی مبطل یا اس سے متضاد نہیں۔

تاویل بالمنافات غلط اور مردود ہے۔ کیوں کہ یہ تفسیر کے مخالف اس کی مبطل اور اس سے متضاد ہے۔ اس تاویل میں اور تفسیر بالرائے میں جو کہ ممنوع، واجب الترک اور مردود و نامقبول ہے کوئی فرق نہیں۔

تاویل بالسکوت بھی چونکہ مخالف و مبطل و متضاد نہیں ہے اس لئے مقبول ہوگی۔

تاویل بالموافقت کی مثال۔ جیسے ظلم کی تفسیر شرک کے ساتھ نقل صحیح سے ثابت ہے۔ لیکن حدود اللہ سے تجاوز، احکام الٰہیہ میں تعدی۔ اور امورِ دینیہ میں تساہل و مداہنت بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ تاویل بالموافقت ہے۔

تاویل بالمنافات مثلاً صراطِ مستقیم سے جس کی تفسیر نقل صحیح میں قرآن یا اسلام یا سیرت نبویہ و اسوۂ حسنہ یا سنت خلفائے راشدین یا سنت صحابہ وارد ہے اس سے ان سب کے خلاف عقلِ محض یا وجدانِ طبعی یا کشفِ باطنی سے تاویل کی جائے۔ یا "اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ" سے انبیاء و صدیقین اور شہدا و صالحین کی تفسیر کے خلاف، اصحاب دولت و ثروت امراء و اغنیاء، اربابِ جاہ و وقار اور دنیا کے اربابِ سیاست و اقتدار مراد لئے جائیں۔ یا صلوٰۃ سے صرف اس کے لغوی معنی دعا کے لئے جائیں۔ یا صوم سے صرف امساک اور مقہوری نفس مراد لیں۔ یا صحابۂ کرام حضرات مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کو حق کے انعام و غفران اور فلاح و رضوان سے دور سمجھا جائے حالانکہ تعلیم نبوت کے فیضان اور صحبتِ رسالت کی تاثیر سے ان کی طبیعتوں میں صدق متمکن ہو گیا تھا اور عادات و اطوار

میں عدل و عدالت، ملکات و اخلاق میں معرفت و کمال علم، نفوس میں رسوخ سنت کامل طور پر سرایت کر چکا تھا یا آیہ غار "اِذْ قَالَ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ" میں حزن کو جبن و تجریر محمول کریں۔ اس قسم کی سب تاویلات باطل و فاسد، مردود اور نامقبول ہیں۔ ان تاویلات کا عمداً ارتکاب معصیت کا سبب ہے بلکہ کفر و الحاد بے دینی۔ زندقہ اور تحریف و تبدیل مراد ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ قیامہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ تفسیر و تاویل کے وقت تین شرطوں کی پابندی اور رعایت ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ اگر ان تین شرطوں کی پابندی کے بغیر تفسیر و تاویل کی گئی تو وہ صحیح نہ ہوگی بلکہ تفسیر بالرای ہوگی۔

پہلی شرط جس کی رعایت ضروری ہے یہ ہے کہ ہر کلمہ کو اس کے حقیقی معنی پر یا مجاز متعارف پر محمول کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو تفسیر ہوگی اور اگر اس کی رعایت نہ کی جائے گی تو وہ تفسیر نہ ہوگی بلکہ تاویل قریب کہلائے گی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ آیت اور کلام کے سیاق و سباق، اول و آخر، ماقبل و مابعد کو خوب غور و خوض سے دیکھا جائے تاکہ کلام مربوط و مسلسل رہے اور کلام میں بدنظمی، بے ربطی اور بے ترتیبی نہ ہونے پائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو تفسیر ہے ورنہ وہ تاویل بعید ہوگی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں مفسر کی رائے کا مطلب، شاہدانِ نزولِ وحی یعنی نبی و اصحاب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) و رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کی تفسیر کے خلاف نہ ہونے پائے۔ اگر خلاف نہیں ہے تب تو تفسیر ہے ورنہ دیکھا جائے گا۔ کہ اس مفسر کی رائے سے نبی و اصحاب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم) کی تفسیر کے خلاف دین کے کسی امر کا ابطال لازم آتا ہے یا نہیں۔ اگر ابطال لازم نہیں آتا تو وہ تاویل بعید ہوگی اور اگر ابطال لازم آتا ہے تو وہ تحریف ہے جو کہ ممنوع و معصیت واجب الترک اور قابل رد ہے۔

غرضیکہ تاویل کی یہی دو صورتیں ہیں۔ ایک مقبول وغیر مردود۔ دوسرے مردود وغیر مقبول۔

اور تاویل مقبول کبھی تاویل قریب کہلاتی ہے اور کبھی تاویل بعید۔

تاویل مقبول دو حال سے خالی نہیں ہوگی۔ یا قولِ صحابی ہوگا یا قولِ غیر صحابی۔ اگر قولِ صحابی ہے تو اس کی بھی تین صورتیں ہوں گی۔

(۱) یا تو وہ منسوب ہوگا حضرت نبوت سے۔

(۲) یا ایسا امر ہوگا جس کا ادراک عقلاً ممکن ہو۔

(۳) یا ایسا امر ہوگا کہ اس کا ادراک عقلاً ممکن نہ ہو۔

امراول کی بنا پر وہ قول بلا تردد حدیث ہوگا (اور حدیث اپنی صحت و نقل استناد میں علم اصول حدیث اور مصطلحات فن ائمہ کی طرف رجوع کرے گی) اور ثانی شکل میں اگر لغت و بلاغت یا استعارہ و تشبیہ یا مناسب مقام سے کسی مراد کو معین و مشخص کیا گیا ہے۔ یا کسی حکم کو حکم ثابت و منصوص پر قیاس کیا گیا ہے تو یہ قیاس معقول ہوگا اور شکل ثالث میں جبکہ عقلاً اس امر کا ادراک ممکن نہ ہو مثلاً مقادیر کا تعین، جنت و دوزخ کے کوائف، ثواب و عذاب آخرت، ثمراتِ اعمال، وغیرہ تو ان امور میں عقل کے سکوت کی بناء پر اس قول کو جنون یا کذب و افترا یا وہم نہ قرار دیں گے بلکہ ان کو تعلیماتِ نبویہ سے سمجھ کر ملحق بالحدیث مانا جائے گا۔ اور حدیث کا حکم اس پر جاری کیا جائے گا۔

تاویل میں بھی بہر حال صحابی کا قول تمام دوسرے اقوال پر مقدم مانا جائے گا۔ صحابی خود اہل زبان ہیں۔ نزولِ قرآن کے شاہد عینی، اور دربارِ رسالت سے بلا واسطہ فیض یافتہ۔ قرآن مجید کے حقائق و اسرار اور تعلیمات و اعمال سے واقف و ماہر، آیاتِ قرآنی کے محل و مَورِد۔ ان کی طبیعتیں روشن اور صاف، اذہان کجی اور کجروی سے پاک، ان کی رائیں اور خیالات خطا سے خالی اور یہ حضرات تعصب اور ہوائے نفسانی سے کوسوں دور ہیں۔ اتباع رسول اور مطابعت قرآن سے تمام محامد اوصاف و محاسن اخلاق کے پیکر ہیں۔ کتاب و سنت ان کے عدل و عدالت اور تفقہ دینی کی ذمہ دار ہے۔

(باقی آئندہ)

پروفیسر محمد حسین آزاد اور "نیرنگِ خیال"

از

(جناب لکشمی نرائن وششٹ صاحب تابش ایم۔ اے)

یوں تو پروفیسر آزاد نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن 'آبِ حیات' کے بعد اگر کوئی تصنیف انھیں زندۂ جاوید مصنفین کی فہرست میں جگہ دلا سکتی ہے۔ تو وہ ان کی "نیرنگِ خیال" ہے ہم صرف اس کی بنا پر ہی آزاد کو اردوئے معلّی کا ہیرو قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب سراپا ان کے خاص رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انھیں ادب اردو میں غیر فانی رتبہ دلاتی ہیں۔ آزاد نے اس میں استعارات اور تشبیہات کا دریا بہا دیا ہے۔ خیالات کو مطالب پر اس قدر وسعت دینا کہ نثر کی تخیل پردازی شاعرانہ خیال آرائی اور ادبی گل کاری کی سرحد کو ٹکرائے آزاد کا طرۂ امتیاز و افتخار ہے۔ آزاد نے اردو کی جو خدمت کی ہے۔ وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور اس خدمت بیش بہا سے اردو کا سر جھکا ہوا ہے۔ زبان کا چٹخارہ۔ صفائی۔ پاکیزگی۔ شگفتگی اور مضامین کی سادگی اور رعنائی اس کتاب لازوال کے خاص جوہر ہیں۔ آزاد کی زبان میں وہ لوچ۔ لطافت دلفریبی اور دلآویزی ہے۔ جو پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کے سوا اردو ادب کے کسی دوسرے لکھنے والے کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں شہسواروں نے میدانِ اُردو میں سرپٹ گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اس کی عظمت و شہرت میں چار چاند لگائے ہیں۔ اُردو زبان کو دوسری زبانوں کے دوش بدوش لاکھڑا کیا ہے۔ اور اس کو وسعت بخشی ہے۔

آزاد اس دور کی پیداوار ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں زبردست تبدیلی ہو رہی تھی مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور وہ بجھا چاہتا تھا۔ غدر ہوا اور اس سے لوگوں پر جو

مصائب و آلام پڑے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں غدر ایک سیاسی اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ادبی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ ایک عجیب افراتفری، کشمکش، ہنگامہ آرائی۔ تذبذب ذہنی الجھن اور انتشار کا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے ہی نثری ماحول پیدا ہوا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کی تحریک چلی۔ اور ادھر بنگال میں راجہ رام موہن رائے کی تحریک وجود میں آئی۔ لوگوں کو نئے حالات، نئے واقعات اور نئی زندگی کی کشمکشوں سے سابقہ پڑا۔ اس نئے اس زمانہ میں نئے حالات، واقعات اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ایک عام خیال ہو گیا تھا۔ جدید شعر و شاعری کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی۔ اس میں بھی ایک جدّت طرازی برتی گئی۔ نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ اور نثر بھی نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ یہ چیزیں اردو ادب میں بالکل نئی تھیں۔ جن سے اردو ادب ابھی تک محروم تھا۔ لیکن اگر ہم اس سے پہلے دور کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ اس زمانہ میں زیادہ تر مافوق الفطرت قصے یا مذہبی کتابیں لکھنے کا عام دستور تھا۔ جو اکثر مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھی جایا کرتی تھیں۔ آزاد نے پرانی چیزوں کو پس منظر بنا کر نئے رستے نکالے ہیں۔ اور اردو ادب کی کمی کو پورا کر دکھایا ہے۔

آزاد نے مختلف کرداروں کو سامنے رکھ کر زندگی کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کی ہے۔ داروغہ دانش، غفلت، سلطان افلاک، غرور، کاہلی، خوشامد، ملک الکلام، داروغہ خیالی وقت، غصہ، عشق، افواہ یا شہرت، حسن کی پری، خسرو آرام، تحسین، علش، نشاط، ملکہ عمدا قت زمانی اور دروغ دیوزاد وغیرہ ایسے کردار ہیں۔ جو مختلف خوبیوں اور کمزوریوں کے حامل ہیں اور جن سے زندگی کی سچی اور ابدی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔ کرداروں کی کامیابی نے زندگی کے سین اور منظر کے اندر لہر دوڑا دی ہے۔ جس کو پڑھ کر ہم سوچنے لگتے ہیں۔ یہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ جن میں بناوٹ کی بو اور نام کو بھی نہیں ہے ان سے ہر صاحب ذوق لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ہر پڑھنے والے کو ان سے اخلاقی درس بھی ملتا ہے انھوں نے زندگی کے شدید عکس اور روپ کہانیوں کی شکل میں بتائے ہیں۔ زندگی کیا ہے

اور انسان کا نظریۂ زندگی کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہئے۔ انسان اپنی زندگی کیسے بسر کرتا ہے۔ ارمان اور خواہشات میں کیسے کامیابی اور ناکامی ہوتی ہے۔ انسان شہرت کا کیوں طالب ہے اور اس کے راستے میں مشکلات کیوں اور کیسے حائل ہوتی ہیں۔ یہ تمام احساسات زندگی کی بعض بنیادوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی عمل کی طرف گامزن ہے۔ اس میں نئی جان۔ نئے ولولے، نئے ارمان، نیا حوصلہ، نئی ہمت نئی تیزی اور نئی کاوش گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ آزاد کے یہاں زندگی کا ایک ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اور زندگی میں فرض کی تکمیل بھی پائی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں آزاد کا نظریۂ زندگی بھی ترقی پسندانہ ملے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کرنل ہالرائیڈ اور ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد کو اس کتاب کو لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ بھی تیار کر کے انھیں دے دیا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ ان کے بعض مضامین انگریزی نثر نویسوں کے مضمونوں کے ہو بہو ترجمے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دیباچہ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا" اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریز نثر نویسوں سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے لیکن آزاد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ باوجود انگریزی کم جاننے کے وہ اس میں پورے اترے ہیں۔ انھوں نے ان تمام چیزوں کو ایک نئی زندگی بخش کر اپنی چیز بنا لیا ہے۔ اور حقیقت کا رنگ بھر کر بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے اور انسان کے اوصاف و خصائل اور اس کے جذبات و خواہشات کو محسوس صورتوں میں بیان کیا ہے۔ جس سے یہ صحیح معنوں میں طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان نے اس میں بلا کی رعنائی، شگفتگی اور گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن حالات کے تحت۔ انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اس

سوال کا جواب اس زمانے کے ادبی ماحول پر نظر ڈالنے سے ملے گا۔ یہ دور نئی چیزوں کا دور تھا۔ زندگی پر مغربی رنگ چڑھ رہا تھا۔ ہر چیز انگریزی اثر میں ڈوبتی ہوئی نظر آرہی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ادبی ماحول کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا۔ اور اُردو ادب نے انگریزی اُبٹنا لگاکر اپنے چہرے کو سجایا اور اس سے اس کی چمک دمک اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور اس طرح اس نے اس کے گیسو کو سنوارنا شروع کیا انگریزی سے اُردو نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سے لوگوں نے تنقیدی شعور لیا ہے۔ اس انقلابی دور میں آسان اردو لکھنا۔ ادب کو زندگی کا ترجمان بنانا۔ اور زندگی کی حقیقتوں اور رازوں کو منکشف کرنے کی طرف عام رجحان تھا مولانا حالیؔ، نذیر احمد، شبلیؔ اور دوسرے زبردست انشا پرداز انگریزی ادب سے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ اپنی تحریروں میں انگریزی کی سی باریکیاں نہ لاسکے لیکن مخصوص اصنافِ ادب کو لانے کا خیال نہ صرف پیدا ہی ہوا بلکہ اردو ادب کو انگریزی ادب کے سانچے میں اچھی طرح ڈھالنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی۔

انگریزی میں ایک صنفِ ادب allegory ہے جسے اردو میں تمثیل نگاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملٹن کی Paradise Lost، ملاوجہی کی سب رس، ڈانٹے کی Divine comedy جان بنین کی Pilgrims progress مولانا رومی کی فارسی مثنوی، سنسکرت کی ہتوا پدیش، ملک محمد جائسی کی پدماوت (جس کا بعد میں انوار سہیلی کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہوا) اور عربی کی اخوان الصفا، وغیرہ کتابوں کے نمونے پہلے سے دوسری زبانوں میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "نیرنگِ خیال" میں جادو نگار قلم سے حکمت و اخلاق کی تصویر کشی استعارات و تشبیہات کا رنگ چڑھا کر کی ہے۔ انھوں نے رسوم و اخلاق حسنہ سے بزم اُردو کو آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ ان میں وہ اخلاقی خوبیاں نمایاں ہیں جو ہندوستان والوں کو ہمیشہ سے مرغوب اور عزیز رہی ہیں انسانی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع "نیرنگ خیال" میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے

انسانی زندگی کے نشیب و فراز۔ سفید و سیاہ، مسرت و غم، سرد و گرم اور ترقی و تنزل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جس سے انسان اچھی اچھی چیزوں کو بدل و جان پیار کریں۔ نیکی کی طرف مائل ہوں۔ بری چیزوں سے سخت نفرت کریں۔ اور برائی بھلائی میں تمیز کریں۔ اور زندگی کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہو جائیں۔

نیرنگِ خیال مختلف مضامین کا رنگین گلدستہ ہے۔ جس کے ہر مضمون کی شگفتگی، لطافت، دلکشی، طرز دلبری اور شیرینی پر "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" صادق آتا ہے۔ اس کے بارے میں مؤلف سیر المصنفین، یوں رقم طراز ہیں :۔

"نیرنگ خیال کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ رنگین بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک سچا دستور العمل، پند و نصائح کا ایک دفتر ہے۔ استعارے اور تمثیل میں وہ وہ مطالب کی باتیں بتائی ہیں۔ کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قائم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویسی کی جدید طرز کا جربہ اتارا ہے۔"

مولانا حالی فرماتے ہیں :۔

"آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی۔ اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

انسان کو دنیا میں ترقی و پستی، اونچ نیچ، عزت و ذلت، امیری اور غریبی، خوش قسمتی اور بدنصیبی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آدمی کی حالت ہر وقت بدلتی ہے۔ یہ عام بات ہے کہ پرانا نظام ہمیشہ تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، موت سے انسان کو ہرگز نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک دن ضرور آئے گی۔ اس لئے ملک عدم کو خوش ہو کر جانا چاہئے۔ خدا نے دنیا میں انسان کے لئے جو طرح طرح کے ساز و سامان

پیدا کئے ہیں۔ ان کے بھی مقاصد و مطالب ہیں۔ یہ فضول اور بے کار پیدا نہیں کئے گئے۔

زندگی روزمرہ کے مختلف واقعات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس دنیا میں آئے دن طرح طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور انھیں چھوٹے بڑے واقعات سے ہماری زندگی عبادت ہے۔ اور انھیں واقعات سے ہماری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ اور یہی واقعات ہمارے جیون کی عمارت بنانے میں مواد کا کام دیتے ہیں اس زندگی میں ہمیں سینکڑوں اونچ نیچ سے گذرنا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ تجربہ ہوتا جاتا ہے۔ اور تب کہیں جاکر آخری عمر میں انسان پختہ، باراں گرگ دیدہ اور تجربہ کار بنتا ہے۔ چنانچہ آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں کتنی پرمعنی اور نکتہ رس بات کہی ہے۔ کہ یہ دنیائے رنگ و بو امتحان کی جگہ ہے۔ خدا نے ہم سب کو یہاں امتحان دینے کے لئے بھیجا ہے۔ واقعی اس زندگی کے امتحان میں صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے کاموں کو ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں۔ ہر کاروبار کو ایمانداری، ہمت، انہماک، جوش، لگن اور نیک نیتی سے کرتے ہیں۔ اور اس امتحان میں رکاوٹ ڈالنے والی چیزوں کا اخلاقی جرأت اور استقلال سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور ان کے سامنے سپر نہیں ڈالتے۔

آزاد نے "سیر زندگی" میں زندگی کی حقیقی باتیں بتائی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

"زندگی ایک میلہ ہے اور اس عالم میں جو رنگارنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں۔ یہی اس کے تماشے ہیں، لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے۔ اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔ بہت سے گرم سرد زمانے کے دیکھتا ہے۔ نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے۔ بچپن سے لے کر ساری جوانی تجربوں میں گذارتا ہے جب گھس پس کر بڈھا ہولیتا ہے تو آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے سمجھ بھی سکے۔ دنیا مقام امتحان ہے ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔"

"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" بڑا دلکش اور نصیحت آموز مضمون ہے، جس میں اس فلسفے پر بحث کی گئی ہے کہ "اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔" بہ الفاظ دیگر اس بات کو آگے چل کر یوں کہا ہے کہ "اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے ہیں۔ تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔" اس مضمون میں ایک حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ "جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

یہ بات درحقیقت صحیح ہے کہ جب انسان رنج والم سے ہم کنار ہوتا ہے۔ تو اسے غم میں ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ رنج و غم برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مصیبت اور تکلیف، رنج و غم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے لگتا ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو غم ہی انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتا ہے، کیونکہ خوشی اور آرام میں ہم بدمست اور لذت پرست ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ ہم خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ انسان رنج و غم میں کچھ کا کچھ کر کے دکھا دیتا ہے اور آخر کار ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ غم راحت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا فلسفہ ہے۔ جو روزمرہ انسان کی عملی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس لئے غم کو زندگی کا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ غالب نے اس فلسفہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

فانی بدایونی غالب سے ایک قدم اور بڑھتے ہیں ؎

غم بھی گذشتنی ہے، خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

امید پر دنیا قائم ہے، اور اسی واسطے امید وصل پر برسوں گوارا ہو جاتے ہیں۔ اگر

امید نہ ہو۔ تو دنیا کے لوگوں کا زندہ رہنا دوبھر ہو جائے۔ اور وہ زندگی کو عذاب خیال کرنے لگیں۔ سچ کہا ہے کہ "آسا جیئے نرا سا مرے" امید سے ہر مشکل سہہ لی جاتی ہے۔ امید کے دھوکے وصل سے زیادہ لطف انگیز، خوشنما اور ہمت افزا ہوتے ہیں۔ پروفیسر آزاد "گلشن امید کی بہار" میں فرماتے ہیں کہ "امید ایک رفیق ہمدم ہے، کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہی دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے، سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیب دیتا ہے"۔

سچا آدمی اپنی بات پر اٹل ہوتا ہے، دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے لیکن وہ اپنی بات پر ثابت قدم رہتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے۔ کہ اس پر ایک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ ناپائدار مصائب و آلام اس کا امتحان لیتے ہیں آخرکار وہ ان تمام وقتی مشکلوں کو عبور کر جاتا ہے لیکن "بہت کم انسان ایسے ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم رہتے ہیں"۔

جو چیز مشکل سے ملتی ہے اس کی قیمت بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ درحقیقت سچائی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔ راستی کی طاقت مسلم ہے۔ جھوٹا آدمی اپنی فریب کاری چالاکی، شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے کچھ عرصہ کے لئے کامیاب تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی یہ کامیابی مستقل اور پائدار نہیں ہوتی۔ آخر میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جھوٹے آدمی میں شیخی، بڑا پن، بے حیائی، ہٹ دھرمی، دھوکہ بازی، عیب جوئی، نکتہ چینی اور شبہ کاری پائی جاتی ہیں۔ دنیا کے نظام کا دارومدار سچائی پر ہے۔ سچائی نور ہے اور جھوٹ تاریکی "اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہان اندھیرا اور عالم تہ و بالا ہو جائے گا"۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ صاحب جوہر اور اہل کمال ہمیشہ سے جاہلوں اور نالائقوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتے آئے ہیں۔ حضرت آزاد اس کو "علوم کی بدنصیبی" میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "یہ بیہودہ بے کمال اور نکتہ چیں معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی

آنکھوں میں چبھتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفات کو خراب کرتے ہیں یا حقداروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے مگر نہ اس قدر کہ طوفانِ نوح کا مقابلہ کرسکے" اس مضمون میں آگے چل کر بتاتے ہیں۔ کہ حضرت انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں۔ بُروں کو بڑھاتے ہیں۔ ویسے اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں ...... طوفان بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے۔"

محنت کامیابی کی کنجی ہے۔ محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب دنیا کی شہرت اور ناموری کا انعام ہے۔ اس کی بدولت انسان تمام مصیبتوں پر فتح پاکر نیک نامی اور بندگی حاصل کرتا ہے۔ اور کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کام ہی عبادت اور بندگی ہے دنیا کے لوگوں نے اسی کی بدولت کیسے کیسے عہدے اور ممتاز رتبے پائے ہیں۔ آزاد اپنے مضمون "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں دو طرح کے امر جیون بتاتے ہیں۔ "بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح کی فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں۔ اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں"

مندرجہ بالا مضامین پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کو زندگی کی اخلاقی قدریں عزیز ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں زندگی کے پوشیدہ رازوں کا بڑا لطیف انداز میں انکشاف کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ انہوں نے نثر میں بڑی اچھی شاعری کی ہے۔ ان کا طرز ادا بڑا دلچسپ، دل کش اور دل آویز ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز بڑی دور دور کی سیر کرتی ہے۔ اور بات بھی یہ ہے کہ جس کے تخیل میں بلند پروازی ہوتی ہے۔ وہ تمثیلی چیزوں پر خوش اسلوبی سے طبع آزمائی کرسکتا ہے۔ ان کے تخیل کی فراوانی نے "نیرنگ خیال" کو ایسی زندگی بخشی ہے۔ کہ جس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا ہے۔ الفاظ کے طوطا مینا بنانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے وہ اپنے طرز تحریر میں تخیل کی بدولت چار چاند لگا دیتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر تشبیہات اور استعارات استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ڈھنگ فطری ہے۔ ان تمام خوبیوں نے "نیرنگ خیال" کو نہ صرف ایک تمثیلی کتاب بننے میں مدد دی ہے۔ بلکہ اس کے طرز ادا کو بڑا شگفتہ بنا دیا ہے۔ ان کے مضامین کہانیوں سے زیادہ لطف دیتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بعض سنگین اور ٹھوس چیزوں کو روزمرہ کی باتوں کی طرح پیش کیا ہے۔ اور "نیرنگ خیال" اس کا من وعن نمونہ ہے۔

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از

(سعید احمد)

(۳)

ان کے علاوہ قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں اپنے آپ کو کتب سابقہ کے لئے جو مصدق کہا ہے اور دین کی اصل کے ایک ہونے کا بار بار اعلان کیا ہے اور اہل کتاب کو اپنی اپنی کتابوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے ان سب سے کیا پروفیسر صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

(۱) اسلام صرف وہ نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے بلکہ اسلام تو آنحضرتؐ کی بعثت سے بہت پہلے سے موجود ہے۔ ہر پیغمبر جو بھی آیا اور جس زمانہ میں بھی آیا اسلام کی دعوت ہی لے کر آیا۔ اس بنا پر صحیح یہودیت وہ بھی اسلام ہے اور صحیح مجوسیت اور مسیحیت وہ بھی اسلام ہی ہے۔ یہاں تک کہ ویدوں کی تعلیم کے مطابق عمل کرنا جس کو ہندو مت کہہ سکتے ہیں وہ بھی اسلام ہے۔

(۲) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد آتے آتے یہود۔ نصاریٰ۔ مجوسیوں اور ہندوؤں کی آسمانی کتابیں کچھ فنا ہوگئی تھیں۔ اور جو بچیں ان میں تحریف ہوگئی۔ پروہتوں وغیرہم نے دنیا پرستی کی وجہ سے کتابوں کی اصل تعلیمات کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ان تمام مذاہب کی مشترکہ بنیادی تعلیم یعنی خدا پرستی اور عمل صالح اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور ہر اہل کتاب

کو یہ بتائیں۔ کہ تمہاری کتاب کی اصل تعلیم کیا تھی؟ چنانچہ اگر کوئی یہودی یا عیسائی وغیرہ تحریفات سے الگ کر کے اپنی کتاب پر عمل کرتا ہے۔ یعنی عبادات و معاملات معاشرت و اخلاقیات میں صرف اپنے مذہب کا اتباع کرتا ہے۔ نماز اپنے طریقہ پر پڑھتا ہے۔ روزہ اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق رکھتا ہے۔ نکاح اپنی قومی روایات کے ماتحت کرتا ہے تو پروفیسر صاحب کے نزدیک یہ سب اسلام ہی ہے کچھ اور نہیں!!

تمام علماء کا شروع سے آج تک اس پر اتفاق رہا ہے کہ کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے اور آنحضرت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے جو شریعت و منہاج پیش کیا ہے اسی کو حق سمجھے اور اسی کے مطابق عمل کرے اس کے برخلاف جو شخص آنحضرت پر ایمان ہی نہیں لاتا یا ایمان لاتا ہے یعنی آپ کو پیغمبر مانتا ہے لیکن آپ کی شریعت اور آپ کے بتائے ہوئے منہاج کو ہی ضروری نہیں سمجھتا وہ مسلمان نہیں ہے سوال ہو سکتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر وحدت ادیان کا مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید کے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ ہونے کی حقیقت کیا ہے؟ اور قرآن مجید کی متعدد آیات سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی پایا جاتا تھا اور دوسرے پیغمبر جو پیغام لاتے رہے وہ اسلام ہی تھا اس کی کیا توجیہ ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ بے شبہ قرآن پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور توراۃ و انجیل اور دوسری الہامی کتابوں کی تعلیمات بھی وہی تھیں جو قرآن کی ہیں لیکن چونکہ یہ تمام کتابیں دستبرد انسانی سے محفوظ نہیں رہی ہیں اور ان میں بہت کچھ تحریف اور مسخ کی حد تک تبدیلی ہو چکی ہے اس بنا پر اب قرآن سے پہلے کی کسی الہامی کتاب پر اس کی اصلی تعلیمات کی روشنی میں عمل ممکن ہی نہیں ہے اور اب نجات کا ذریعہ قرآن مجید پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ جواب درست اور معقول ہے لیکن اس پر

اشکال یہ پیش آتا ہے کہ اگر بالفرض دنیا میں کہیں کسی جگہ پر انجیل کا وہی نسخہ مل جائے جو حضرت عیسٰی پر نازل ہوا تھا۔ اور جس میں سرمو کہیں تحریف نے راہ نہیں پائی ہے تو کیا ایسی صورت میں اس نسخہ کے مطابق عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہوگا! اور کیا اس کو اسلام کہا جائے گا! یہاں انجیل کا ذکر محض تمثیلاً کیا گیا ہے ورنہ یہی سوال قرآن مجید کے سوا ہر آسمانی کتاب سے متعلق ہو سکتا ہے" مذکورۂ بالا جواب پر چونکہ یہ اشکال پیش آتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک یہ جواب کچھ زیادہ باوزن اور اہم نہیں ہے اور نہ یہ اس اسلوب سے ہم آہنگ ہے جو قرآن مجید نے اسلام کو آخری دین اور سب کے لئے ضروری الاتباع دین ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے! اس سلسلہ میں امور ذیل تنقیح طلب ہیں۔

(۱) قرآن مجید کے بیان کردہ وحدت ادیان کا کیا مطلب ہے؟

(۲) قرآن مجید کے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

(۳) وحدت ادیان کے باوجود ہر پیغمبر کا منسک (طریقۂ عبادت) اور منہاج الگ الگ رہا ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بھی ہر قوم کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے منسک و منہاج کو چھوڑ کر اپنے پیغمبر یا کسی اور پیغمبر کے منسک و منہاج پر عمل کرے خواہ یہ منسک و منہاج کیسا ہی حق ہو اور قرآن نے اس کی صداقت کو تسلیم کیا ہو، اب ہم ترتیب وار ہر ایک تنقیح پر صرف قرآن مجید کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔

وحدتِ ادیان[1] قرآن مجید کے اعلان کے مطابق حضرت نوحؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی پیغمبر آئے ——— اور وہ ہر زمانہ میں اور ہر ملک اور ہر قوم میں آئے ——— وہ بنیادی طور پر ایک ہی پیغام لے کر آئے

[1] یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہم نے وحدت ادیان کی ترکیب صرف عام بول چال کے مطابق استعمال کی ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی بھی یہی ترکیب" استعمال کرتے ہیں ورنہ ہمارے نزدیک بجائے وحدت ادیان کے زیادہ صحیح لفظ وحدت دین ہے۔

اور وہ یہ تھا کہ خدا کو ایک مانو۔ اسی کی عبادت کرو۔ پیغمبر پر ایمان لاؤ۔ اس پر نازل کی ہوئی کتاب کو منزل من اللہ سمجھو۔ یوم آخرت پر ایمان لاؤ۔ اس دن کی جزا و سزا کا عقیدہ رکھو۔ اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کرو۔ برے کاموں اور ناپسندیدہ اعمال و اخلاق سے بچو۔ یہ وہ تعلیم ہے اور یہی وہ پیغام ہے جس کو لے کر تمام پیغمبر اپنے اپنے زمانہ میں آتے رہے۔ اور چونکہ یہ پیغام ایک ہی تھا اس بنا پر ہر متاخر نبی نے اپنے پیشرو نبی کی اور اس کی کتاب کی تصدیق کی یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کی ہدایت نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے آپ کو کی ہے اور جس کی ہدایت ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی تھی۔ یعنی یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اے کتاب والو آؤ تم اس ایک بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں گے اور ہم میں سے ایک دوسرے کو خدا کو چھوڑ کر رب نہیں بنائے گا۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى

کوئی شبہ نہیں کہ یہی پیغام اگلے صحیفوں یعنی ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے صحیفوں میں تھا۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ

بے شبہ یہی پیغام پہلے والوں کی کتابوں میں تھا۔

قرآن کا مصدق ہونا وحدت ادیان کی جو حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے مصدق ہونے کا مطلب کیا ہے؟ یعنی قرآن کتب سابقہ میں سے کسی

کتاب کی۔ گذشتہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کی نہ تکذیب کرتا ہے، نہ تغلیط۔ وہ ان میں کسی کو نہ باطل قرار دیتا ہے اور نہ اس کی تردید کرتا ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ سب کتابیں منزل من اللہ تھیں اور سب پیغمبر خدا کے بھیجے ہوئے نبی تھے۔ ان کی تعلیمات الٰہی تعلیمات تھیں جنہوں نے ان پر عمل کیا ان کے لئے فوز و فلاح اور نجات و کامرانی ہے اور جنہوں نے اس کو کلاً یا جزءً نہیں مانا ان کے لئے عذاب و ادبار ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جو لوگ دین میں تفریق کرتے ہیں اور پیغمبروں میں خط امتیاز کھینچتے ہیں قرآن نہایت شدید لب ولہجہ میں ان کی مذمت کرتا اور ان کو عذاب و غضب خداوندی کا مستحق بتاتا ہے۔

منسک و منہاج کا اختلاف لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وحدت ادیان اور مصدقیت قرآن کی مذکورۂ بالا حقیقت کے باوجود قرآن صاف طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ دین کی روح اور اس کی اصولی تعلیمات کے یکساں ہونے کے ساتھ ساتھ ہر پیغمبر کا منسک اور منہاج الگ الگ رہا ہے مثلاً ہر پیغمبر کا یہ پیغام تو یکساں ہے کہ خدا کی ہی عبادت کرو لیکن عبادت کے طریقوں میں جزئی طور پر اختلاف ہے۔ اعمال صالحہ کرنا اور فتنہ و فساد کا انسداد کرو یہ تعلیم سب میں مشترک ہے لیکن زمان و مکان کے اور سوسائٹی کے احوال کے اختلاف کی بنا پر فتنہ و فساد کا انسداد کرنے کے طریقے مختلف ہو سکتے تھے اس بنا پر اس بارہ میں پیغمبروں کی تعلیمات میں اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہی ایک چیز جو ایک پیغمبر کے زمانہ میں حرام ہے وہ دوسرے پیغمبر کے عہد میں حلال ہو جاتی ہے۔ تحریم و تحلیل اشیاء میں متعلقہ قوموں کے مزاج اور ان کے قومی میلان و رجحان کی رعایت کہاں تک کی گئی ہے اس پر قرآن مجید کی یہ آیت روشنی ڈالتی ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ	سب کھانے بنو اسرائیل کے لئے حلال تھے مگر وہ کھانے حلال نہیں تھے جن کو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

بہر حال وحدتِ دین کے باوصف ہر پیغمبر کا منہاج اور شرعۃ ومنسک جدا جدا رہا ہے اور اس مرحلہ پر قرآن بتاتا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی کسی قوم کو یہ آزادی کبھی نہیں دی گئی کہ وہ اپنے پیغمبر کے منہاج کو چھوڑ کر کسی دوسرے پیغمبر کے منہاج پر عمل کرے مثلاً جب تک حضرت عیسیٰؑ نہیں آئے تھے۔ یہودیوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ منہاج ومنسکِ موسوی پر عمل کریں لیکن جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لے آئے تو اب منسک ومنہاج کے بارہ میں حضرت عیسیٰؑ کا اتباع ضروری ہو گیا۔ اور وہ ہی مدارِ نجات بن گیا چنانچہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ بنو اسرائیل کو خطاب کر کے فرماتے ہیں

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ	مجھ سے پہلے توراۃ جو آچکی ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں میں ان کو تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

غور کیجئے! اس آیت سے کس قدر واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے پیشرو حضرت موسیٰؑ کی کتاب توراۃ کے مصدق ہو کر آتے تھے مگر ساتھ ہی حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں کچھ ایسی چیزیں حلال بھی تھیں جو شریعتِ موسوی میں حرام تھیں۔ جب تک حضرت عیسیٰؑ نہیں آئے تھے بنو اسرائیل کے لئے شریعتِ موسوی پر ہی عمل کرنا ضروری تھا۔ لیکن آپ کے آجانے کے بعد اب ان کو شریعتِ عیسوی پر ہی عمل کرنا ہوگا اور جو چیزیں پہلے حرام تھیں ان کو اب حلال ہی ماننا ہوگا۔ چنانچہ آیت کے ختم پر صاف صاف فرماتے ہیں کہ "تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"

اپنے پیشرو پیغمبر کی تصدیق اور ساتھ ہی احکام شریعت میں کچھ ترمیم وتنسیخ اور خود

اپنی اطاعت واتباع کی دعوت کا یہ معاملہ جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہے یہی معاملہ تمام پیغمبروں میں ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ جب نوبت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آئی تو آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ آپ کتبِ سابقہ کے اور گذشتہ انبیاء ورسل کے مصدق ہیں مگر ساتھ ہی آپ کی شریعت اور منہاج جزئی اعتبار سے دوسرے پیغمبروں کے منہاج و شریعت سے مختلف ہے اور جب تک آنحضرتؐ کی بعثت نہیں ہوئی تھی دوسرے پیغمبروں کے مناہج پر (بشرطیکہ کسی کا نسخ نہ ہوا ہو) عمل کرنا موجب نجات تھا۔ لیکن آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد اب صرف منہاج و شریعتِ محمدیؐ پر عمل کرنا ہی موجب نجات ہو سکتا ہے اور اسی کا اتباع واجب ہے چنانچہ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو متعدد مواقع پر بڑی خوبی اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ

اور میری رحمت ہر شے کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے پس میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لیے مقدر کردوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو رسول نبی امی جس کا ذکر وہ خود اپنے یہاں توراۃ و انجیل میں پاتے ہیں اور جو ان کو بھلائیوں کا امر کرتا اور بری باتوں سے روکتا ہے اور جو ان کے لیے پسندیدہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور جو ان کا بوجھ ہلکا کرتا اور ان کی بیڑیوں کو جن میں وہ بندھے ہوئے تھے توڑتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں تو یہاں یہی لوگ فلاح یاب ہوں گے جو اس پیغمبر پر ایمان لاتے اس کی تائید

أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اور مدد پہنچائی اور جنہوں نے اس نور کی پیروی کی جو اس پیغمبر کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر۔ یا ایک ہی مقام پر یکے بعد دیگرے پیغمبر آتے تھے لیکن چونکہ ہر پیغمبر کی شریعت خاص اس کے زمانہ کے اور اس کی قوم کے احوال وظروف کے تقاضوں کے مطابق ہوتی تھی اس بنا پر ایک قوم کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کی شریعت کو چھوڑ کر دوسری قوم کے پیغمبر کی شریعت پر عمل کرے لیکن آنحضرتؐ کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ آپ کسی خاص ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں آپ کی رسالت عام ہے "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ" وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ اس لئے اب ہر قوم کے لئے خواہ وہ کسی پیغمبر کی ماننے والی ہو اس کے سوا چارہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے یعنی آپ کے منسک ومنہاج پر عمل کرے۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہی عبادت کرے اور تمام اخلاقی سماجی اور معاشرتی معاملات میں آپ کے احکام کو بجالائے چنانچہ ارشاد گرامی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ میں اللہ کا تم سب کی طرف رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے پس تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے اس رسول نبی امی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

ایک اور آیت میں قرآن مجید کی ان دونوں حیثیتوں کو یعنی ایک طرف یہ کہ وہ کتب سابقہ

کا مصدق ہے اور دوسری طرف یہ کہ اب اس کے نزول کے بعد صرف اسی پر عمل کرنا ہوگا ایک ساتھ بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

اور ہم نے آپ پر سچائی کے ساتھ کتاب اتاری ہے جو اپنے سے پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر غالب بھی ہے۔

مہیمن کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ کسی کے نزدیک اس سے مراد شاہد ہے اور کسی کے نزدیک اس کے معنی "حاوی" ہیں حالانکہ ایک سیدھی سی بات ہے مہیمن کے اصل معنی ہیں غالب اور مقتدر جو اپنے سامنے کسی اور کی چلنے نہ دے۔ چنانچہ اس معنی میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں ہم نے مہیمن کے جو معنی بیان کئے ہیں اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

بے شبہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے باطل نہ اس کے سامنے سے آتا ہے اور نہ پیچھے سے یہ خدائے حکیم حمید کی طرف سے اتری ہے

غور کیجئے۔ قرآن کو "مُهَيْمِن" اور "عزیز" اسی امر پر متنبہ کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ ہاں بے شک قرآن کتب سابقہ کا مصدق ہے لیکن اب اسی قرآن پر اور صاحب قرآن کی لائی ہوئی شریعت پر ہی عمل کرنا ضروری ہوگا ؎

"نیست ممکن جز بقرآں زیستن"

(باقی آئندہ)

ادبیات

چلا

از

(جناب الم مظفر نگری)

لے کے جب جوشِ جنوں اپنے بیاباں سے چلا
بچ کے میں شورشِ ہر جادۂ طوفاں سے چلا

لب پہ ہر ذرۂ صحرا کے ہے شورِ لبیک
کون یہ اٹھ کے بہاروں میں گلستاں سے چلا

حرمِ حسن کے جلووں پہ ہے مستی کا ورود
نغمۂ عشق کہیں سازِ رگِ جاں سے چلا

میرے جلووں نے عیاں ہو کے مجھے گھیر لیا
میں جو کچھ آگے حدِ منزلِ امکاں سے چلا

ضبطِ غم! خالقِ طوفاں نہ کہیں ہو جائے
روک اس قطرہ کو جو دیدۂ گریاں سے چلا

دور تاریکیٔ بزمِ جہاں ہو جاتی
لے کے مشعل نہ کوئی میرے شبستاں سے چلا

روکتا کون مجھے فصلِ بہار آنے پر
اپنی نظروں سے بھی بچ بچ کے میں زنداں سے چلا

پھاڑ لیتے ہیں جو دامن کو بہاروں میں گل
یہ بھی دستور مرے چاکِ گریباں سے چلا

اڑ کے کہتی ہے یہ خاکِ سرِ وادیٔ جنوں
سلسلہ دہر کا ذراتِ پریشاں سے چلا

کیا ہے انجامِ خزاں اس کو نہیں تھا معلوم
ہو کے بے دل جو شکستِ گلِ خنداں سے چلا

بن گیا فیضِ خودی سے وہ حریفِ خورشید
اڑ کے ذرہ جو کوئی صحنِ بیاباں سے چلا

ہے خوشی غم کا نتیجہ مجھے معلوم ہوا
جب نشیمن کا پتہ تنگیٔ زنداں سے چلا

لے لیا بڑھ کے الم شانِ کریمی نے مجھے
ہو کے مایوس جو میں حشر کے میداں سے چلا

رُباعیات

از

(جناب شارقؔ میرٹھی ایم۔ اے)

ٹکر

ہنس ہنس کے شرابِ درد میں نے پی ہے
افلاس میں بادشاہی میں نے کی ہے
اے گردشِ روزگار مجھ کو دیکھ!
میں نے غمِ دو جہاں سے ٹکر لی ہے

مسکرانا ہے ابھی

ہر چوٹ پہ دل کی گنگنانا ہے ابھی
ہر سازِ ستم پہ گیت گانا ہے ابھی
مغموم منظر نہ ہو کہ مجھ کو شارقؔ
ہر زخمِ جگر پہ مسکرانا ہے ابھی

بے رُخی

غنچے بھی چمن میں مسکراتے ہی رہے
پودے بھی خوشی سے لہلہاتے ہی رہے
پھولوں کی فسردگی پہ ڈالی نہ نگاہ
مرغانِ بہار گیت گاتے ہی رہے

کوئی نہیں

موتی مرے آنسوؤں کے چننے والا
افسانۂ غم پہ سر کو دھننے والا
ہو کوئی، تو دل کا حال آ کر سن لے
کیا ہے کوئی دل کا حال سننے والا؟

تبصرے

تذکرہ مشائخ بنارس

از جناب مولانا ابو الاثر عبد السلام صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۰۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ایک روپیہ

پتہ:- ندوۃ المعارف بنارس (کچی باغ)۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی اصل تاریخ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ درحقیقت ان صوفیا و اولیائے کرام کی تاریخ ہے جنہوں نے اس وسیع و عریض ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر رشد و ہدایت اور روحانی فیض و افادہ کی درسگاہیں قائم کیں اور جنہوں نے اس مرز بوم کے چپہ چپہ پر اپنے انفاس قدسیہ سے معرفت ربانی کی شمعیں روشن کیں مسرت کا مقام ہے کہ ایک عرصہ دراز کے جمود اور غفلت و بے حسی کے بعد مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے اس اصل سرمایہ کی طرف توجہ ہوئی ہے اور ان نفوس قدسیہ کے حالات و سوانح پر کتابوں کی اشاعت کا ایک مبارک سلسلہ شروع ہو گیا ہے چنانچہ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں چھٹی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی تک کے تقریباً نوے مشائخ بنارس کا تذکرہ ہے ان میں سے بعض مشائخ تو کافی مشہور ہیں جن کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے ہیں اکثر کا تذکرہ بہت مختصر ہے تاہم تاریخ کے طالب علم کے لئے افادہ سے وہ بھی خالی نہیں ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں آئندہ مزید معلومات حاصل ہو سکیں بہرحال لائق مرتب کی یہ سعی لائق تحسین ہے اور امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔

تاریخ دیوبند

از جناب سید محبوب صاحب رضوی تقطیع متوسط ضخامت ۸۰۰ صفحات،

طباعت وکتابت بہتر قیمت مجلد دو روپیہ پتہ:- ادارہ تاریخ دیوبند۔

دیوبند اتر پردیش میں ضلع سہارنپور کا ایک معمولی سا قصبہ ہے لیکن دارالعلوم کی وجہ سے اسے عالمگیر شہرت حاصل ہے اس بنا پر اس کی بڑی ضرورت تھی کہ اس قصبہ کی قدیم وجدید تاریخ لکھی جائے خوشی کی بات ہے کہ سید محبوب صاحب رضوی نے جن کو ایک معمولی دفتری ملازمت کے باوجود کسی موضوع سے متعلق مواد فراہم کرنے اور اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ شستہ وشگفتہ زبان میں مرتب کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے اس طرف توجہ کی اور بڑی محنت وجستجو کے بعد یہ کتاب لکھ کر پیش کی۔ اس میں دیوبند کا جغرافیہ، قدیم سیاسی تاریخ، اس کے شہری اور سماجی حالات۔ وجہ تسمیہ وغیرہ پر گفتگو کرنے کے بعد دارالعلوم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ لائق مؤلف کی تحقیق میں دیوبند کا تذکرہ فارسی تاریخوں میں سب سے پہلے ابوالفضل کے آئین اکبری میں آیا ہے لیکن ہمیں اگرچہ اب ٹھیک یاد نہیں تاہم خیال پڑتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کی تاریخ میں ہم نے کسی موقعہ پر دیبی بن کا کہیں تذکرہ پڑھا ہے علاوہ بریں ہمارا خیال ہے کہ ہند قدیم کی تاریخ کے سنسکرت مآخذ کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کچھ اور معلومات حاصل ہو سکیں۔ بہرحال لائق مؤلف نے جتنا کچھ بھی مواد فراہم کر کے مرتب کر دیا ہے بہت غنیمت ہے اور اس بنا پر ان کی یہ کوشش لائق تحسین وآفریں ہے اور یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ہر طالب علم اس کا مطالعہ کرے اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ایک مورخ کو بہرحال ایک مورخ ہی رہنا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ تاریخ دیوبند کے مؤلف کا دامن تاریخ نگاری بعض مواقع پر بیجا مداحی اور نازیبا منقبت سرائی کے عیب سے بے داغ نہیں رہ سکا ہے اور انھوں نے ایک جماعت کے کارناموں کو بعض خاص اشخاص وافراد کے کارناموں کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔!!

حضرت مشکل آسان ثانیؒ

از سید مراد علی صاحب طالع تنقطیع خورد ضخامت

۹۴ صفحات قیمت قسم اول ایک روپیہ قسم دوم ۱۲ ؍ پتہ: منشی محمد حسن الدین صاحب کی کمان کاروان ساہو حیدر آباد دکن۔

مولانا ابو البرکات شاہ سید غلام محمد صاحب زعم القادری حیدر آباد کے ایک مشہور صاحب حال و قال بزرگ تھے ۱۳۶۱ھ میں آپ نے وفات پائی۔ اس کتاب میں مختلف اصحاب کے قلم سے نظم و نثر کے متعدد چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں شاہ صاحب کے حالات و سوانح اور آپ کے دینی و روحانی کمالات و اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کے گنبد اور خانقاہ اور تقاریب عرس و صندل سے متعلق کتبے اور تحریریں جمع کی گئی ہیں شجرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابو البرکات صاحب کا باطنی سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے منسلک ہے اور آپ اس واسطہ سے چشتیہ نظام کے ایک گوہر آبدار تھے۔ اس سلسلہ کے وابستہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادہ کا باعث ہوگا۔

خزینۃ الاسرار | از جناب قاری محمد حنیف صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ ادارہ تاج کمپنی محلہ اسلام پورہ مظفر نگر (یوپی)

اس کتاب میں جناب مولف نے حروف تہجی کی ترتیب کے ماتحت ان نقوش و عملیات کو بیان کیا ہے جو خود ان کے بیان کے مطابق پندرہ سال سے خود ان کے یا ان کے احباب کے مختلف بیماریوں اور ضرورتوں کے لئے آزمودہ اور مجرب ہیں جن اصحاب کو ان چیزوں کا ذوق ہو ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔ یہاں اپنا حال تو یہ ہے

رہین منت سحر و عمل ہرگز نخواہیم شد   مگر از جذب الفت باشد آں کار فرمائی

رسول مقبول | از جناب منظر علیبسری تقطیع خورد ضخامت تقریباً سو صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ (۱) سنگم کتاب گھر اردو بازار۔ دہلی

(۲) یونین بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

یہ چند نظموں رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے جن کا موضوع حمد و نعت۔ درود و سلام۔ منقبت شہادت کبریٰ کا بیان اور تاریخ اسلام کے بعض واقعات ہیں۔ اشعار پراثر اور ولولہ انگیز ہیں جن سے لائق مصنف کی گہری عقیدت و ارادت کا اظہار ہوتا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کر کے ثواب دارین حاصل کریں گے۔

ترجمان القرآن پارۂ اول ضخامت ۴۴ صفحات
ترجمان القرآن پارۂ عم ضخامت ۱۷۶ صفحات
} از جناب عبد الحق عباسی صاحب تقطیع خورد کتابت [illegible] بہتر قیمت علی الترتیب عہ ۴ر و عہ

پتہ :- المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور۔

قرآن مجید کے اردو ترجمے کثرت سے شائع ہو چکے ہیں مگر اس کتاب کے فاضل مصنف نے جدت یہ کی ہے کہ ہر آیت کا ترجمہ پہلے ہر ہر لفظ کے لئے الگ الگ خانہ بنا کر اس طرح کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کون سا لفظ قرآن مجید کے کس لفظ کا ترجمہ ہے اس کے بعد عام سہولت کے لئے دوسری سطر میں بامحاورہ اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے اگرچہ ہمارے نزدیک اس جدت سے بھی خاطر خواہ فائدہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ترجمہ پڑھنے والا تھوڑی بہت عربی سے واقف نہ ہو۔ تاہم اس ترجمہ کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ یہ ترجمہ بھی ہے اور لغت القرآن بھی! اور اس حیثیت سے اس کا افادہ ان تراجم سے زیادہ ہے جو محض ترجمہ ہیں۔

(۱) **بچوں کا حساب** قیمت ۵ر
(۲) **آسان ریاضی** حصہ اول قیمت ۶ر
(۳) **آسان ریاضی** حصہ دوم قیمت ۱۰ر
} از جناب شوکت علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور (یوپی)

رام پور کی جماعت اسلامی نے مسلمان

۹۶ صفحات قیمت قسم اول ایک روپیہ و قسم دوم ۱۲ پتہ :- منشی محمد حسن الدین صاحب کی کمان کاروان ساہو حیدر آباد دکن۔

مولانا ابوالبرکات شاہ سید غلام محمد صاحب زعم القادری حیدر آباد کے ایک مشہور صاحب حال و قال بزرگ تھے ۱۳۶۱ھ میں آپ نے وفات پائی۔ اس کتاب میں مختلف اصحاب کے قلم سے نظم و نثر کے متعدد چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں شاہ صاحب کے حالات و سوانح اور آپ کے دینی و روحانی کمالات و اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کے گنبد اور خانقاہ اور تقاریب عرس وصندل سے متعلق کتبے اور تحریریں جمع کی گئی ہیں شجرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالبرکات صاحب کا باطنی سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے منسلک ہے اور آپ اس واسطہ سے چشتیہ نظام کے ایک گوہر آبدار تھے۔ اس سلسلہ کے وابستہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادہ کا باعث ہوگا۔

خزینۃ الاسرار | از جناب قاری محمد حنیف صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- ادارہ تاج کمپنی محلہ اسلام پورہ مظفر نگر (یوپی)

اس کتاب میں جناب مؤلف نے حروف تہجی کی ترتیب کے ماتحت ان نقوش و عملیات کو بیان کیا ہے جو خود ان کے بیان کے مطابق پندرہ سال سے خود ان کے یا ان کے احباب کے مختلف بیماریوں اور ضرورتوں کے لئے آزمودہ اور مجرب ہیں جن اصحاب کو ان چیزوں کا ذوق ہو ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔ یہاں اپنا حال تو یہ ہے

رہین منت سحر و عمل ہرگز نخواہم شد ۔ مگر از جذب الفت باشد آں کافر مطیع من

رسول مقبول | از جناب منظر علیسری تقطیع خورد ضخامت تقریباً سو صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ (۱) سنگم کتاب گھر اردو بازار۔ دہلی

(۲) یونین بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

یہ چند نظموں رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے جن کا موضوع حمد و نعت۔ درود و سلام۔ منقبت شہادت کبریٰ کا بیان اور تاریخ اسلام کے بعض واقعات ہیں۔ اشعار پراثر اور ولولہ انگیز ہیں جن سے لائق مصنف کی گہری عقیدت و ارادت کا اظہار ہوتا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کر کے ثواب دارین حاصل کریں گے۔

ترجمان القرآن پارۂ اول ضخامت ۴۴ صفحات
ترجمان القرآن پارۂ عم ضخامت ۱۷۶ صفحات

از جناب عبد الحق عباسی صاحب تقطیع خورد کتابت و طباعت بہتر قیمت علی الترتیب ۸؍ و ۴؍

پتہ:- المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور۔

قرآن مجید کے اردو ترجمے کثرت سے شائع ہو چکے ہیں مگر اس کتاب کے فاضل مصنف نے جدت یہ کی ہے کہ ہر آیت کا ترجمہ پہلے ہر ہر لفظ کے لئے الگ الگ خانہ بنا کر اس طرح کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کون سا لفظ قرآن مجید کے کس لفظ کا ترجمہ ہے اس کے بعد عام سہولت کے لئے دوسری سطر میں بامحاورہ اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے اگرچہ ہمارے نزدیک اس جدت سے بھی خاطر خواہ فائدہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ترجمہ پڑھنے والا تھوڑی بہت عربی سے واقف نہ ہو۔ تاہم اس ترجمہ کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ یہ ترجمہ بھی ہے اور لغت القرآن بھی! اور اس حیثیت سے اس کا افادہ ان تراجم سے زیادہ ہے جو محض ترجمہ ہیں۔

---

(۱) بچوں کا حساب قیمت ۵؍
(۲) آسان ریاضی حصہ اول قیمت ۶؍
(۳) آسان ریاضی حصہ دوم قیمت ۱۰؍

از جناب شوکت علی صاحب بی۔ اے ایل۔ ٹی۔ پتہ:- مکتبۂ جماعت اسلامی ہند رام پور (یوپی)

رام پور کی جماعت اسلامی نے مسلمان

بچوں کے لئے ایک مفید تعلیم گاہ قایم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے مختلف مضامین پر نصاب کی کتابیں لکھنے کا جو پروگرام بنایا ہے یہ تینوں رسالے اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ ان میں بالکل شروع سے لے کر کسری پہاڑوں تک جماعت دوم کے واسطے ریاضی کے اسباق لکھے گئے ہیں اور آخر میں اقلیدس پر ایک باب ہے جس میں اس فن کی چند ابتدائی باتیں بیان کی گئی ہیں لائق مؤلف کا طریق تفہیم اور سوالات کا انداز بچوں اور خاص طور پر مسلمان بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے اس بنا پر امید ہے کہ مسلمان بچوں کو عام طور پر ریاضی سے جو وحشت ہوتی ہے وہ ان کتابوں کے پڑھنے سے نہیں ہوگی ہم نے خود اپنے بچوں پر بعض اسباق کا تجربہ کیا ہے اور ان کو مفید پایا۔ اسلامی مکاتب و مدارس کو یہ رسالے اپنے نصاب میں شامل کرنے چاہئیں۔

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے مترجم کتاب مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلت علم کے بیان اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھیئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع۔

قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

برہان

جلد ۳۱ شمارہ نمبر ۳

ستمبر ۵۳ء مطابق محرم ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اس اشاعت میں ہمارے فاضل دوست لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کا ایک مقالہ دربارِ جہانگیری کے ملک الشعرا طالب آملی پر شائع ہو رہا ہے اس مقالہ کی تقریب یہ ہے کہ موصوف کو اتفاق سے دیوان طالب آملی کا ایک قدیم ترین نسخہ بصرف زر کثیر ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا مطالعہ کی تیز رفتاری کا یہ عالم کہ بیس دن میں پورا دیوان از اول تا آخر پڑھ کر اس کا انتخاب بھی کر لیا اب انھوں نے اس دیوان کو اڈٹ کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس سلسلہ میں دیوان کے مزید نسخوں اور ان کی نسبت معلومات فراہم کرنے کی غرض سے انھوں نے ہند و پاکستان کے اپنے متعدد دوستوں اور ارباب علم کو خطوط لکھے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس میں سے اکثر اصحاب نے موصوف کو جواب تک لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اس کے برخلاف بت کدہ میں برہمن کی پختہ زناری دیکھیے۔ موصوف نے ایک خط عہد حاضر کے مشہور مستشرق اور ہفت زبان فاضل پروفیسر اے۔ جے۔ آربیری کو بھی لکھا تھا انھوں نے چند روز کے بعد خط کا تسلی بخش جواب دیا اور ہمارے فاضل دوست کو اس یافت پر مبارکباد پیش کی انھوں نے لکھا:

"آپ کو بلاشبہ ایک بہت دلچسپ اور قیمتی مخطوطہ ملا ہے۔ میں نے کیٹالاگس دیکھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ دیوان طالب آملی نادر نہیں ہے لیکن آپ کا مخطوطہ بے شبہ سب سے زیادہ پرانا یا کم از کم ایک قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ موجود ہے اس پر ۱۰۴۲ھ کی تاریخ ہے۔ اس لحاظ سے یہ مخطوطہ بھی آپ کے مخطوطہ سے دس سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری اور آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں بھی اس دیوان کے چند مخطوطے ہیں لیکن یہ سب بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں آپ کی اس خوش قسمتی پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور مجھ کو یقین ہے کہ آپ ایسی عمدہ خطاطی سے

لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔"

بہرحال برہان میں جو مقالہ شائع ہو رہا ہے اس کا مقصد صرف دیوان سے متعارف کرانا ہے ورنہ خواجہ صاحب موصوف نے اس کو باقاعدہ اڈٹ کرنے اور اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھ کر شائع کرنے کا عزم کر لیا ہے اور ہمت مردانہ سے کام لے کر اس کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں خواجہ صاحب کو کچھ مفید معلومات پہنچا سکیں تو برہان کی معرفت وہ موصوف کو لکھیں خواجہ صاحب شکر گذار ہوں گے۔

برہان کی گذشتہ دو اشاعتوں میں جس رسم کی قباحت و شناعت اور اس کے غیر اسلامی ہونے کی نسبت ہم نے لکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا انسداد کیوں کر کیا جائے؟ اس کو ختم کرنے کی آسان اور عملی صورت یہ بھی ہے کہ مقامی علما و مشائخ کرام اس مسئلہ کی نزاکت اور اس کے دور رس اثرات کا احساس کریں اور تقریراً و تحریراً انھیں روزمرہ کی صحبتوں میں اور مواعظ و مجالس میں اس کے مضر اثرات و نقصانات کو بار بار شد و مد کے ساتھ بیان فرمائیں اور جو حضرات ان کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں شامل ہوں ان سے عہد لیں کہ وہ نہ صرف اس رسم سے بلکہ تمام غیر اسلامی رسوم سے خود کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے اور اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو بھی ان سے واسطہ نہیں رکھنے دیں گے۔ اس کے علاوہ مقامی مسلم جماعتوں اور سوشل اداروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ برابر اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے دائرۂ اثر و عمل میں کہیں کسی جگہ اس رسم پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اگر عمل ہو رہا ہے تو انھیں چاہیے کہ اسلام کے نمایندہ بن کر ان لوگوں کو سمجھائیں اور اس سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی ان مسلم اداروں کو اس سے بھی باخبر رہنا چاہیے کہ ان کے شہر یا قصبہ میں کوئی مسلمان گھرانہ ایسا تو نہیں ہے جہاں اس رواج کے باعث کوئی لڑکی جوان ہو کر بھی بغیر بیاہ کے بیٹھی ہوئی ہو۔ اگر ہو تو ان جماعتوں کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر کے والدین کو آمادہ کریں کہ وہ اس کی شادی کر دیں۔ پہلے یہ کام وہ [illegible] کرتے تھے جن کی جگہ جگہ شاخیں ہیں

بعض عوام سے یہ حضرات ربط و ضبط رکھتے تھے۔ مشائخ طریقت ہونے کے علاوہ مسلمانوں کی بجی اور گھریلو زندگی میں ان کے معتبر کارہمدرد اور رہنما ہوتے تھے یا وہ علما کرتے تھے جو اپنا فرض صرف مدرسہ میں پڑھا دینا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ عوام کی زندگی میں دخیل ہو کر ان کے روزمرہ کے معاملات میں اسلامی طریقے پر ان کی رہنمائی کرتے تھے اب یہ چیزیں رفتہ رفتہ قوم سے مفقود ہوتی جا رہی ہیں سیاسی یا نیم سیاسی معاملات و مسائل نے ہمارے علما کی توجہات کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ اب ان کو مسلمانوں کے معاشرتی امور و مسائل کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے مسلمانوں میں پنجابی اور میمن دو ایسی جماعتیں ہیں جنھوں نے معاشرتی امور سے متعلق اپنی اپنی برادریوں کی تنظیم ایسے اعلیٰ طریقہ پر کرلی ہے کہ دوسرے مسلمان ان سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں میمن برادری مسلمانوں کا ایک نہایت متمول اور خوش حال طبقہ ہے لیکن اس کے باوجود ان حضرات کے ہاں کوئی غریب ہو یا امیر اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکی کی تقریب شادی پر بارہ سو روپیہ سے زیادہ خرچ کرے۔ اسی میں لڑکی کا زیور اور جہیز تیار کرنا ہوگا اور اسی میں برادری کی ضیافت وغیرہ کا انتظام کرنا ہوگا۔ پنجابی اور میمن حضرات کی اپنی اس تنظیم کا ہی نتیجہ ہے کہ جو معاشرتی مفاسد دوسرے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں وہ انکے یہاں نہیں ہیں۔ سب آپس میں ایکدوسرے کی امداد باہمی کے اصول پر مل جلکر رہتے ہیں اور برادری کی پنچایت کا اثر و اقتدار اس درجہ قوی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا اگر عام مسلمان بھی اپنے اپنے حلقوں میں اسطرح کی پنچایتیں بنالیں تو بہت سے معاشرتی اور سماجی مفاسد سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

حال ہی میں ہفتہ وار "جد و جہد" کے نام سے اردو صحافیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اسرار احمد صاحب آزاد اور عبدالمعین صاحب زبیری ایسے تجربہ کار و سنجیدہ جریدہ نگاروں کی ادارت میں دلی سے شائع ہوتا ہے اب تک اس کے نو نمبر نکل چکے ہیں اور ہر نمبر ظاہری و معنوی ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنجیدہ اداریے۔ پرمغز شذرات حالات حاضرہ سے متعلق معلومات افزا مقالات۔ ملکی و قومی معاملات و مسائل پر بے لاگ مگر مدلل تبصرے، تاریخی ادبی اور سیاسی موضوعات پر مختصر مگر بصیرت افروز مضامین۔ معیاری غزلیں اور نظمیں، غرضکہ ایک جریدہ اسبوعیہ کے باذوق قاری کو اپنے ذوق کی تسکین کے لئے جو کچھ چاہئے وہ سب اس میں موجود ہوتا ہے۔ الہلال سائز کے اٹھارہ صفحات ضخامت۔ کاغذ اور کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت فی کاپی ۴ر پتہ:۔ ہفتہ وار "جد و جہد" گلی قاسم جان دہلی

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت اگست

(۲) واقعہ یہ ہے کہ خالق سے کنارہ کش ہو کر مخلوقات ہی میں استغراق، عرض کر چکا ہوں، یہی بے دینی کی روح ہے، امریکہ اور یورپ والوں کی لادینی زندگی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ خالق سے بے گانہ ہو کر مخلوقات ہی کے ساتھ وہ چمٹے اور چپٹے ہوئے ہیں، میں کہہ چکا ہوں کہ بت پرستی کا مسلک اپنی معنویت کے لحاظ سے دین نہیں، بلکہ بے دینی کی روح کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ یورپ و امریکہ کی جدید مادی مشرکانہ ذہنیت ہی کا "افتادیت" یا "بت پرستی" ایک پرانا جھوٹا چولا ہے، یعنی خالق سے بے گانگی اختیار کر کے مخلوقات کے ساتھ عقلی رشتہ کے ساتھ ساتھ "مذہبی جذبہ" کے رخ کو بھی مخلوقات کی طرف پھیر دیا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود بے دینی کے ہر بت پرست اپنے آپ کو پکا دین دار یقین کرتا رہا ہے آج تک اسی یقین پر اس طبقہ کا اصرار اس وقت تک قائم اور پوری قوت کے ساتھ قائم ہے، مغالطہ کا منشا یہی ہے کہ مذہبی جذبہ کے سارے عملی مظاہر عبادت دعا، ذکر و فکر، پوجا پاٹ، پراتھنا اور پرستش، جب تب یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کے لازمی عناصر بنے ہوئے ہیں اس لحاظ سے ان کا "مذہبی جذبہ" بجائے تعطل اور بیکاری کے قطعاً زندہ اور بیدار رہتا ہے، فخر کے ساتھ سینے تان کر مذہب اور دین کے نمائندوں میں اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں، اور دوسرے جن کو ان کے طرز عمل سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو لیکن بہرحال وہ بھی تسلیم ہی کرتے ہیں کہ بت پرست یورپ و امریکہ کی مادی ذہنیت رکھنے والوں کی طرح

لامذہب اور بے دین تو نہیں ہیں، بلکہ مذہبی طبقات ہی میں شمار ہونے کا وہ جائز حق رکھتے ہیں۔
یہی ایک ایسا ذہنی الجھاؤ اور فکری سرسام ہے جس کی وجہ سے بے دینی نظر آتی ہے کہ دینداری کی
واقعہ یہ ہے، کہ بھوک اور پیاس کی کیفیت آدمی میں اس لئے رکھی گئی ہے کہ حرارت غریزی سے
بدن کے جو اجزا تحلیل ہوتے ہیں، ان کا بدل نئی غذا اور نئے پانی سے فراہم کیا جائے۔ اس لئے
آدمی کھانا بھی کھاتا ہے اور پانی بھی پیتا ہے، لیکن بجائے روٹی کے جو سنکھیا کی ڈلی اپنے منہ میں چھوڑ
رہا ہو۔ اور پانی کی جگہ ہلاہل کا پیالہ چڑھا رہا ہو۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کے فطری تقاضوں
کی تکمیل وہ بھی کر رہا ہے لیکن نتیجہ ہی بتائے گا کہ ان فطری تقاضوں کے غلط استعمال کا انجام کیا ہوا؟
بدن کے تحلیل یافتہ اجزا کا بدل مہیا ہوا! یا تحلیل پانے کے بعد بچے کچھے عناصر بھی بدن کے خشک ہو کر
ختم ہو گئے، یقیناً سنکھیا کھانے اور زہر ہلاہل کے شربت کے پینے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ بھوک
اور پیاس کے تقاضوں ہی سے ایسا آدمی بہرا گونگا بن جاتا۔ جو نہیں کھا رہا ہے، نہیں پی رہا ہے
اس کے متعلق تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ آخر کب تک؟ فطرت کے تقاضوں کو کب تک جھٹلائے گا
بھوک اور پیاس کے اندرونی مطالبے بہرحال اسے بے چین کرتے رہیں گے، ہر پھر کر اسے کھانا بھی
پڑے گا اور پینا بھی پڑے گا، لیکن جو کھا ہی رہا ہو خواہ سنکھیا ہی کیوں نہ کھا رہا ہو، جو پی ہی رہا ہو خواہ
زہر ہی کا پیالہ ہی کیوں نہ پی رہا ہو۔ بھلا اس کو کھانے اور پینے کا مشورہ کیسے دیا جائے اور کیا دیا جائے
بہت ہستیاں ہیں مذہبی جذبہ تو امیدہ نہیں بلکہ بیدار اور قطعاً بیدار زندہ، جیتا جاگتا رہتا ہے۔ مگر اس جذبہ
کے استعمال کا جو قدرتی طریقہ ہے اور جس کام کے لئے یہ جذبہ آدمی میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس پیدائشی مقصد
سے ہٹا کر اس جذبہ کے استعمال کو غلط کر دیا گیا ہے۔
(۴) غلط ہی نہیں بلکہ بجائے خالق کے الٹا "مخلوق" کے ساتھ اس جذبہ کا رشتہ قائم کر کے ایک
ایسی صورت حال پیدا کر دی جاتی ہے کہ اونچا کرنا اور اوپر چڑھانا یہی کام جس جذبہ کا تھا۔
اسی کی بدولت یہ آدمی اپنے خالق و مالک کے قدموں تک پہونچ سکتا تھا۔ جب مخلوقات ہی
کے ساتھ اسی جذبہ کو الجھا دیا جاتا ہے، تو بجائے چڑھانے کے انسانی فطرت کی یہی قوت محرکہ یا اس کا

یہی اندرونی رجحان آدمی کو گھیسٹتے ہوئے گرائی ہی چلی جاتی ہے، خالق جو ایک ہے اس سے ڈر کر مخلوقات ہی کے ساتھ مذہبی جذبہ اور دینی میلان کے رشتہ کے جوڑنے کی راہ جب کھول دی گئی تو مخلوقات کی بھلا کوئی حد ہے یا انتہا؟

مذہبی جذبہ کے استعمال کا یہ تجربہ، ناکام تجربہ چند مخلوقات ہی تک پہنچکر کیسے ختم ہو سکتا تھا؟ اس مخلوق سے نہیں تو شاید اُس مخلوق سے یہاں نہیں تو وہاں کی مخلوق سے شاید کام نکل جائے اس گھن چکر میں پھنس جانے کے بعد جن بھول بھلیوں میں آدمی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اسے کھانا ہی چاہئے

بت پرستی کی تاریخی روداد تو یہی ہے کہ اس راہ میں آدمی پھسلتا اور بھٹکتا ہی چلا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خالق" سے ہٹا کر جب کبھی مذہبی جذبہ کو "مخلوقات" کے ساتھ وابستہ کیا گیا تو پھر قدرت نے کسی نقطہ پر ان ہٹنے والوں کو شاید ٹکنے نہ دیا۔ ٹھوکروں پر ٹھوکریں تھیں جو مسلسل لگتی ہی چلی جاتی تھیں اس کا متعین کرنا تو دشوار ہے کہ پوجنے والوں نے سب سے پہلے خالق کو چھوڑ کر کس "مخلوق" کو پوجا، کس مخلوق کے آگے آدمی نے اپنا سر نیاز پہلی دفعہ خم کیا، لیکن تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے اور آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ ملائکہ، شیاطین، جن، انس، حیوانات، نباتات، جمادات، عناصر، سیارے اور ستارے الغرض سارے علویات و سفلیات کو آدمی کے معبود بننے کا فخر حاصل ہو چکا ہے واقعہ جس شکل میں پیش آیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تک بڑھ کر لگاتے ہوئے قدرت کا انتقامی قدم ایک درجہ سے گرا کر دوسرے درجہ پر اور دوسرے سے تیسرے درجہ پر مخلوق پرستوں کو ٹپکتا ہی چلا گیا ہے

اللہ اللہ آنکھوں نے اس راہ میں کیا کیا نہیں دیکھا؟ آدمی نے آدمی کو پوجا، وہاں سے بھی دھکہ پاکر نیچے گرا دیکھا گیا کہ جانوروں کی ٹانگوں کے آگے ہی منہ کے بل وہی آدمی پڑا ہے گھوڑوں، گدھوں، بیلوں اور ہاتھیوں، بندروں اور بچھوں، لنگوروں اور بھیڑیوں، سانپوں اور بکروں کے سامنے آدم کی اولاد سر بسجود ہے۔ بات اسی نقطہ پر پہنچ کر ختم نہیں ہوگئی لڑھکنے والے اور بھی لڑھکتے پایا گیا کہ نباتات کی جڑوں کے نیچے بھی وہی غریب آدمی [illegible] شاید

نہ ٹھیرایا گیا، پھر جو نہ سنتے تھے اور نہ دیکھتے تھے نہ ان میں کسی قسم کا احساس تھا ان کے آگے یہی سننے والا دیکھنے والا سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان کیسی عجیب بات اور کتنا حیرت انگیز، دردناک نظارہ تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جوڑے بھیک مانگتے ہوئے کھڑا ہوا ہے دریاؤں کے آگے پہاڑوں کے آگے پہاڑوں کی چٹانوں کے آگے سورج کے آگے چاند کے آگے اور میں کیا کیا بتاؤں کن کن کے آگے دستِ سوال دراز کئے ہوئے اسی اشرف المخلوقات کو دیکھنے والوں نے کیا نہیں دیکھا ہے۔ یا آج بھی کیا نہیں دیکھ رہے ہیں؟

خالق سے کٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے "انسانیت" لٹ گئی اس کی آبرو لٹ گئی اس کا مقام ڈھ گیا، اپنے پیدا کرنے والے سے ان کٹ جانے والوں کی قسمت میں ٹھوکروں پر ٹھوکروں دھکوں پر دھکوں کے سوا شاید اور کچھ باقی نہیں رہتا، جو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم دیکھتے ہیں اسی طرح سنتے ہیں جیسے ہم سنتے ہیں، اسی طرح سوچتے ہیں، جیسے ہم سوچتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان میں دور دور کی کوڑیوں تک کے لانے والوں کو پایا اور دیکھا گیا ہے اسی سے تو سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مکافات و مجازات کے حقیقی مظاہر کے ظہور سے پہلے قدرتی انتقاموں کی یہ پرچھائیاں ہیں جو خاکی زندگی کے اسی عبوری دور میں ان انسانیت سوز رسوائیوں کے بھیس میں ان لوگوں کے آگے آتی رہی ہیں جو اپنے پیدا کرنے والے کے آستانے کو چھوڑ کر وہی جس کا سب کچھ ہے ان "مخلوقات" کی طرف دوڑ پڑے جن کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا،

اس میں شک نہیں کہ اس حد تک یعنی خالق سے بے گانگی اور مخلوق میں استغراق کی حد تک [illegible] ہیں کہ شرک کے پرانے اور نئے مجرم دونوں ہی برابر ہیں، بلکہ کائنات کی آفرینش و پیدائش [illegible] "کی طرف منسوب کر کے زندگی کی عام ضرورتوں اور حاجتوں میں خود اپنے آپ کو اپنی بیرونی اور اندرونی صلاحیتوں کو کافی ٹھہراتے ہوئے حق سبحانہ وتعالیٰ سے بے نیازی کے خیال خام خیال کو جو اپنے اندر پکاتا ہے اس حد تک تو شرک ہی کے جرم کا مجرم وہ بھی ہے۔ آخر خود وہ بھی تو خالق نہیں مخلوق ہی ہے، بتایا جا چکا ہے کہ اس مشرکانہ ذہنیت کے تسلط ہی کے ساتھ ہی آدمی کا

وجود زمین کی پشت کا ایک ایسا لایعنی "لاحاصل" ناکارہ بوجھ بن کر رہ جاتا ہے کہ اس فکری آفت میں مبتلا ہونے والے لاکھ سوچیں کچھ بھی کر گذریں لیکن یہ بات کہ ان کا وجود ان کے عدم سے بہتر ہے۔ دنیا کی کوئی منطق اس دعوی کے ثابت کرنے میں ان کی مدد نہیں کر سکتی۔

جس نصب العین کی تکمیل کے لئے پیدا کرنے والے نے آدمی کو پیدا کیا ہے، جب تک وہی نصب العین سامنے نہ آ جائے، اس سوال کا یعنی آدمی کس لئے پیدا کیا گیا ہے، اس کا جواب نہ اب تک کسی کو ملا ہے اور نہ آئندہ مل سکتا ہے، میں نے کہا تھا کہ اپنے وجود کے اس قدرتی نصب العین کو گم کر دینے کے ساتھ ہی یہ واقعہ ہے کہ عفونتوں اور غلاظتوں کے مقابلہ میں بھی آدم کی اولاد بے قیمت ہو کر رہ جاتی ہے، جن سے اور کچھ نہیں تو کھیتوں میں ڈال کر کھاد ہی کا کام لیا جا سکتا ہے اور لیا جاتا ہے کھاد ہی کی شکل میں سہی اپنے وجود کا فائدہ اپنی قدر و قیمت کو وہ بھی ثابت کر کے تو رہتی ہیں، پہلے بھی اس پر کافی بحث کر چکا ہوں،

بہر حال حق یہی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسوائیوں اور خواریوں کی شکار انسانیت جیسے پرانی مشرکانہ ذہنیت یعنی مخلوق پرستی کے دور میں ہو گئی تھی آج بھی جدید مادی تہذیب میں ذلت و پستی بے قدری ولاحاصلی کا یہ داغ، سیاہ داغ اس کی پیشانی سے نہیں مٹا ہے، آخر کائنات کی صفوں میں سب سے زیادہ بے قیمت، بے نتیجہ لاحاصل بن کر رہ جانا حقارت و ذلت، خواری اور رسوائی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے؟ کوئی شبہ نہیں اور اسے ماننا ہی چاہیئے کہ اس حد تک شرک قدیم ہو یا جدید، دونوں ہی کا حال کچھ ایک ہی سا ہے، لیکن اسی ہمہ اشتراک و یک رنگی۔ معاذ اللہ انسانی شرافت و کرامت کے چہرے کی وہ سیاہیاں جو "مخلوق پرستی" کے ہاتھوں بھری گئیں، وہی جس کی بدولت گویا ساری مخلوقات اور ساری کائنات ہی کو حق حاصل ہو گیا کہ آدمی کے معبود اور "الٰہ" بن جائیں اور بن جائیں کیا معنی؟ ان میں کون سی چیز ایسی باقی رہ گئی ہے، جس کی بندگی کا پٹہ آدم کے بچوں کے گلے میں نہیں بندھ چکا ہے، یا اس وقت تک نہیں بندھا ہوا ہے،

اُف! جو ان سب میں اونچا، سب سے بڑا، سب سے گرم، سب سے زیادہ محترم و گرامی عزت

والا تھا وہی سب کے نیچے جا پڑا، ساری کائنات ہی گویا اس پر چڑھ بیٹھی سب ہی آقا ہی کیا باضابطہ رب اور معبود بن گئے اور انسانیت کے نیچے جھکی ہوئی، پسی ہوئی "انسانیت" کراہتی رہی اس وقت تک کراہ رہی ہے۔ قرآن کی سورہ "التین" کی آیتوں یعنی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ	یہ واقعہ ہے کہ پیدا کیا ہم نے آدمی کو سب سے اچھے قالب میں، پھر پلٹا دیا ہم نے اسی آدمی کو اس طور پر کہ سارے نیچوں میں سب سے زیادہ نیچے وہی ہو گیا

کا مطلب لوگ کیا سمجھتے ہیں، لیکن آگے جو خبر دی گئی کہ ایمان اور عمل صالح والوں کے سوا سب ہی اس حال میں گرفتار ہوئے یعنی سارے نیچوں کے نیچے ہو گئے، اپنا خیال تو اس کی روشنی میں اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جو واقعہ پیش آ چکا ہے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا جا رہا ہے یہ اسی کی تصویر ہے۔ شرک کے دور قدیم میں بھی اس کا تماشا کیا گیا تھا، اور نئے مادی چولے میں شرک کی اسی "ذہنیت" نے آج یورپ و امریکہ سے جو سر نکالا ہے وہ بھی "انسانیت" کو اسی دردناک انجام تک تقریباً پہنچا چکی ہے، کم از کم آدمی کا وجود سب سے زیادہ بے قیمت بن کر تو رہ ہی گیا ہے، بلکہ دوسری جگہ یعنی سورہ الحج میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ

من یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق ۝	اللہ کے ساتھ جو بھی کسی کو شریک بناتا ہے ایسا سمجھو کہ گویا وہ آسمان سے چکرا کر گر پڑا پھر (بیچ ہی میں) کسی پرندہ باز بحری وغیرہ) نے اس کو اچک لیا یا گرتے ہوئے آندھی اسے دور دراز جگہ میں لئے چلی جاتی ہو،

آپ دیکھ چکے کہ مادیت کے جدید مشرکانہ رجحان میں آدمی کا وجود کیا عدم کے برابر نہیں ہو جاتا یقیناً ایسی ہستی کی شکل وہ اختیار کر لیتا ہے جس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی مفاد کسی کا وابستہ نہیں ہے، اپنے پیدا کرنے والے خالق کے لئے ہے نہیں اور مخلوقات میں کسی کو انسانی وجود کی ضرورت نہیں ایسی

صورت میں نظامِ کائنات کے اندر ایک ایسی حیثیت [illegible] ہو جاتی ہے کہ رہے تو کیا اور نہ رہے تو کیا ہمارے زمانہ کی جدید نئی "مشرکانہ ذہنیت" کا یہ قدرتی منطقی نتیجہ ہے مطلب جس کا یہی ہوا کہ وہ کچھ باقی نہ رہا اس کا بود نابود کے ہم معنی ہو کر رہ گیا' بار بار اس مسئلہ کو دہرا چکا ہوں کہ دوسرے تو دوسرے آدمی کے حافظے سے خود اپنی یاد کا چراغ اس ذہنیت کے شکار ہونے کے ساتھ ہی بجھ جاتا ہے گویا اپنے آپ ہی کو آدمی کا حافظہ اس طور پہ نگل جاتا ہے کہ اگلوانے کی لاکھ کوشش کی جائے تو وہ اس کو اگل ہی نہیں سکتا' جب تک کہ وہی یاد نہ آجائے جس کی یاد کے لئے آدمی پیدا کیا گیا ہے۔ الغرض بے معنی اور بے مقصد ہو کر "انسان" اس زمانہ میں جو کھو یا گیا ہے سمجھا جائے تو فتخطفہ الطیر (اچک لیا اس کو پرندوں نے) کے الفاظ میں "شرک جدید" کے اس منطقی نتیجہ کا اشارہ شاید ہم پا سکتے ہیں شکاری پرندے باز بحری [illegible] یہی تو کرتے ہیں۔ اڑتی ہوئی چڑیوں کو ہوا سے اچک لیتے ہیں ان کے پنجوں میں پہنچ کر چڑیوں کا وجود عدم کی شکل اختیار کر کے گم ہی تو ہو جاتا ہے' سوچئے شرک کی جدید مادی رجحان میں اس کے سوا "انسانیت" کا انجام اور کیا ہوتا ہے؟ باقی "مشرکانہ ذہنیت" کا دوسرا نتیجہ کہ آندھی گراتے ہوئے دور دراز مقام کی طرف لئے اڑائے لئے چلی جاتی ہے یعنی "او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق" مخلوق پرستی میں مبتلا ہونے کے بعد جو بپتا آدم کی اولاد پر پڑی آپ دیکھ چکے کہ اس کی یہ کتنی سچی تصویر ہے "خالق کی بندگی" اور عبادت سے اکتانے کے بعد اسی کی مخلوق" کو جاہلیت والے قدیم شرک میں معبود اور الٰہ جب بنا لیا گیا تو آدمی کی پیشانی کے لئے ٹھوکریں "قرارگاہ میسر آئی خالق سے آدمی کٹا' اور پھٹا پھر دیکھتے دیکھتے سے اکھڑ جانے والے "پتنگ کی طرح" انسانیت کے لئے غوطوں کے بعد غوطوں کے سوا اور بھی کچھ دیکھا گیا؟

بتا چکا ہوں کہ کس طرح ایک زینہ سے لڑھک کر دوسرے پر دوسرے سے تیسرے پر یوں ہی نہ ختم ہونے والے سیڑھیوں کے "ڈنڈوں" پر قلابازیاں کھاتے ہوئے وہ لڑھکتی ہی چلی گئی؟

سچ ہے کہ مشرک آسمان سے چکرا کر گرتا ہے۔ پھر بیچ ہی میں بے چارا کھو کر گم ہو جاتا ہے یا مخلوق پرستی کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ٹھنیاں کھاتے ہوئے گرتا ہے، گرتا چلا جاتا ہے، اور گرتا ہی چلا جاتا ہے اسی کے اندر سے "شرک" کی آندھی اٹھتی ہے، وہ اسے اڑانے لئے چلی جاتی ہے، بس "شرک" کا خواہ پرانا رنگ ہو یا نیا، ہر حال میں تباہی و بربادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہ پہلے سامنے آیا اور نہ آج آیا نہ آئندہ آئے گا۔

مگر بایں ہمہ اپنے دل کی ایک بات کو بھی کیسے چھپاؤں، میرا یہ ایک ذاتی احساس ہے آپ بھی سن لیجئے۔ مطلب یہ ہے، کہ شرک کا باطنی وسوسہ دلوں میں جب کبھی پیدا ہوا تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ عموماً اس ذہنی وسوسہ اور دماغی دغدغہ کے بعد "مخلوق پرستی" کہئے، یا "بت پرستی" کو لوگوں نے اپنا خوش گوار قومی مشغلہ بنا لیا۔

لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، "نزول قرآن" کے بعد شاید یہ پہلا موقعہ ہے کہ سرزمین یورپ کے باشندوں کے اندر درحقیقت شرک ہی کی خارشت کا تقاضا پیدا ہوا، جس میں مبتلا ہونے کے بعد خالق سے بے اعتنائی کا رجحان یقیناً ان میں بڑھا اور بہت زیادہ بڑھا، بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے، کہ "عقلیت" اور "آزاد تنقید" کا ذوق اور سلیقہ بھی غیر معمولی طور پر ان میں نشو و نما پاتا رہا، اور اب تک پا رہا ہے گویا "ملکہ راسخہ" کی شکل اختیار کر چکا ہے ان کے اس عقلی اور تنقیدی مشق و ممارست کو دیکھتے ہوئے بظاہر اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ "مخلوق پرستی" کے پرانے سبق کو وہ بھی اسی طرح دہرانے لگیں گے، جیسے "نزول قرآن" اور "ظہور اسلام" سے پہلے "خالق" کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے قوموں نے خدا ہی کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو پوجا ہے۔ آخر کچھ بھی سوچا جائے لیکن کیا یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کے باشندے، سانپوں، بچھوؤں، کتوں، اور بلیوں، بندروں اور لنگوروں کو پوجنے لگیں گے ان کے آگے سر نیاز و عبودیت کو جھکائیں گے، پتھر کی تراشیدہ مورتیوں پر طیبہ اور ریوڑیاں نہ سہی، چاکلیٹ اور لیمن جوس کیک اور بسکٹ یاں چڑھائیں گے خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو عقل انسانی کی رسوائیوں کی تاریخ کا شاید سب سے بڑا حادثہ ہوگا، اور حد سے زیادہ دانش سوز یہ حادثہ ہوگا اور گویا یہ ماننا پڑے گا کہ بدیہی مشاہدات کے نتائج بھی جھٹلا دئیے گئے لیکن جب تک

مشاہدات سے پیدا کئے ہوئے نتائج غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں، اس وقت تک بھلا یہ کون سوچ سکتا ہے کہ اپنی موجودہ عقلی اور تنقیدی مہارتوں کے ساتھ "مخلوق پرستی" کے عارضہ کے یورپ وامریکہ کے باشندے سے اسی طرح شکار ہو جائیں گے، جیسے قبل الاسلام "نزول قرآن" سے پہلے قومیں شکار ہوتی رہی ہیں،

سوال یہ بھی ہے، کہ فطرت کا یہ "جبلی تقاضا" جس کا نام مذہبی جذبہ ہے، اس کا انجام آخر کیا ہونے والا ہے؟

اس وقت تک تو نام نہاد عیسائیت (کہ سچنٹی کلیسائی ہو، یا غیر کلیسائی) اسی کی دریدہ و بریدہ کرم خوردہ جھول ان ممالک کے باشندوں پر پڑی ہوئی ہے اسی طرح کچھ "تھیوسوفزم یا اسپریچولزم وغیرہ جیسی کچی، ادھوری، ناقص راہوں سے بھی بری بھلی کچھ خوراک "جبلت" کے اس تقاضے کو مل رہی ہے اگر مجازی خوراکوں کا یہ سلسلہ بھی ان ممالک میں بند ہو گیا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان ہی لوگوں کی "بے درد اور آزاد عقلی تنقید" فریب کے اس ساز و سامان کو زیادہ دن تک لادے ہی چلی جائیگی جیسے بہ مشکل اس گٹھری کو اب تک وہ اٹھائے ہوئے ہے، بس دیکھنے کا وقت وہی ہوگا جب فطرت کا مذہبی تقاضا قطعی تعطل اور حقیقی مفلوجیت کے جال میں آجائے گا۔ باہر کی یہ ساری جھولیں اتر جائیں گی اور ادہر ادھر سے طفل تسلیوں کی جو صورتیں کبھی کبھی نکل آتی ہیں، جب ختم ہو جائیں گی اور وہ بہرحال ختم ہی ہو کر رہیں گی، مذہب یا دین کے نام سے جو چیز ان کے ہاں پائی جاتی ہے، یعنی عیسائیت باطن سے اس کا بہت کم تعلق باقی رہا ہے، رسم و رواج روایات اور ٹریڈیشن کلچر وغیرہ جیسے الفاظ کے لفافوں میں اس کے بھرم کو چھپانے اور دبانے کی کوشش ظاہر ہے کہ کب تک کامیاب ہوگی۔ بس جب یہ سب کچھ نہ رہے گا، یہ لفافے پھٹ جائیں گے مصنوعی ٹٹیاں ٹوٹ جائیں گی تو بظاہر دو ہی صورتوں کا امکان ہے یعنی تعطل و مفلوجیت کے بعد درحقیقت تدینت کا یہ جذبہ واقعی بے جان اور قطعاً مردہ ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم اور فنا ہو جائے گا۔ لیکن اس مذہب کے اس رجحان اور دین کے اس میلان کو پیدا کرنے والے ہی نے آدمی کی جبلت اور فطرت کے خمیر میں اگر گوندھا ہے اسی سرشت

کو لے کر آدمی پیدا ہوا ہے جس کے خمیر ہی میں دینی جذبہ کا عنصر گھولا گیا ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ انسانیت باقی رہ جائے اور اس کے فطری تقاضے مردہ ہمیشہ کے لئے مردہ بے جان ہو کر رہ جائیں، حیلوں، حوالوں دوسرے وقتی خوش کن مشاغل اور رنگینیوں میں منہمک رکھ کر یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لئے بھوک اور پیاس جیسے تقاضوں سے بھی غافل ہو جائے، لیکن اندر کے کسی تقاضے اور مطالبے سے غفلت یا تغافل دوام و ثبات کی شکل اختیار کر لے یہ ناممکن ہے،

ان تقاضوں کے کلیتہً ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ہی باقی نہ رہے حرارت اور روشنی آگ کی فطرت کا خلقی تقاضا ہے، ان دونوں جوہری خصوصیتوں کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ظاہر ہے کہ کوئلہ رہ جائے گا، چراغ کی بتی تو باقی رہ سکتی ہے، لیکن آگ کا وجود یقیناً ختم ہو گیا۔

بس ان قوموں میں مذہب کا یہ فطری تقاضا جب کبھی پیدا ہوا تو اس کا خطرہ یعنی "خالق" کی جگہ مخلوقات ہی کی گریبان میں اسی طرح لپٹ پڑے، جیسے پہلے لپٹا رہا ہے اور گھسیٹتے ہوئے پھر ان ہی کنوؤں کو جھکوا لے جن کی تہ میں بھی کنوؤں اور گندے حد سے زیادہ گندے سڑے چہ بچوں ہی کا ناپیداکنار سلسلہ ہے، کھائیاں اتھاہ کھائیاں جن کا نہ اور ہے نہ چھور، ایڑیوں پر پھر "انسانیت" واپس ہو گی، انسانی نفسیات کے نبض شناسوں کے نزدیک آج یہ مسئلہ ناممکن قرار پا چکا ہے۔

پھر کیا ہوگا؟

اس کے سوا اور کیا کہا جائے جو کہنے والا کہہ کے جا چکا ہے رحمۃ اللہ علیہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زمین کے کس خوش قسمت حصہ میں یہ واقعہ پیش آئے گا، اگرچہ کچھ زیادہ دور نہیں ہے اب وہ زمانہ کہ "انسانی جبلت" کا یہ فطری میلان اپنے پیدا کرنے والے خالق کو بھی ڈھونڈھیگا اس کو ڈھونڈے گا اس کی مرضی کو ڈھونڈھے گا، اس کی مرضی اور یہ کہ اپنے بندوں سے واقعی وہ کیا چاہتا ہے، اس کی آگاہی، غیر مشتبہ آگاہی کی جو قدرتی راہ ہے، اسی راہ کو پا کر رہے گا، اسی راہ پر چڑھیگا

چلے گا، اور آدمی کو جو کچھ ہونا چاہیے، وہی ہو کر وہ رہے گا، اسی منزل تک پہنچ کر دم لے گا،

لیکن خدانخواستہ اگر "تعطل تام" کے بعد یعنی کسی قسم کی مجازی ہو یا غیر مجازی خوراک کے میسر آنے کے تمام ذرائع جب ختم ہو جائیں گے، اس کے بعد مذہب کا یہ رجحان اور دین کا یہ جذبہ یورپ و امریکہ کے باشندوں میں مردہ ہو کر رہ گیا، تو پھر یہی حادثہ دلیل ہوگا اس بات پر کہ جذبہ آدمی کا فطری اور جبلی جذبہ نہ تھا، بلکہ بیرونی مؤثرات کے زیر اثر کسی وجہ سے اتفاقاً مذہب کا یہ تقاضا دلوں میں پیدا ہو گیا یا کر دیا گیا تھا، لیکن ایسا ہوگا بھی کم از کم "مذہبی جذبہ" کی چیرہ دستیوں کا جو تماشا انسانی تاریخ دیکھ چکی ہے اس کا صحیح استعمال ہو یا غلط، لیکن ہلچل غیر معمولی ہلچل اسی جذبہ کی بدولت ہی آدم کے گھرانوں میں جواب تک برپا ہے یا اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں یہ ہنگامہ آج بھی جس طریقے سے گرم ہے گرفت کی غیر معمولی طاقت سے دلوں پر جس رنگ میں یہ مسلط ہے دماغوں پر چھایا ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ زور اندر سے نہیں، بلکہ باہر سے پیدا ہوا یا پیدا کر دیا گیا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

اللہ کی فطرت جس فطرت پر پیدا کیا ہے اللہ نے آدمی کو

قرآن کی آیت ہے کم از کم ایک مسلمان تو اس میں شک کرنے کے ساتھ ہی کچھ اور باقی رہ یا نہ رہے لیکن مسلمان تو باقی نہیں رہ سکتا۔

بہرحال ہے تو یہ کچھ عجیب بات یعنی الحاد اور بے دینی کی "انسانیت سوز" آگ آج یورپ و امریکہ سے جو اٹھی ہے، بنی آدم کے ہی خرمنوں میں جس سے کھلبلی مچی ہوئی ہے اس آتشیں سیلاب کے آئندہ عواقب و انجام کو سوچ سوچ کر سوچنے والے سہمے سہمے جا رہے ہیں لیکن اسی آگ کے پیچھے دیدہ دلیری سمجھئے یا ایمانی فراست کہ دین ہی کے ہرے بھرے سرسبز و شاداب باغوں کا خواب دیکھ رہا ہوں، اور طرفہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک طرف خالص بے دینی کے اس مخرب غالب میں تو صالح اور صادق دین کی تڑپتی ہوئی روح مجھے محسوس ہو رہی ہے اور دوسری طرف اسی کے

مقابلہ میں مذہب اور دین کا وہ مانا ہوا پرانا ڈھانچہ جس کا نام "مخلوق پرستی" اور "صنامیت" ہے، اس کے متعلق یہ خیال کہ باہر سے دیکھنے والوں کو دین کا مستقل نظام ہی کیوں نہ نظر آتا ہو، لیکن روح اس کی بھی وہی بے دینی ہے جس میں موجودہ مادی تہذیب نے آدمی کو مبتلا کر دیا ہے۔ حالانکہ عام احساس یہی ہے کہ "بت پرستی" "مذہب" کی چاہے جتنی بگڑی ہوئی مسخ شدہ شکل ہو، مگر ہے تو وہ دینداری ہی کا ایک چولا اور رنگ مغربی الحاد اور دہریت کے سامنے سمجھنے والے جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ اس رنگ کو بھی غنیمت ہی خیال کرتے ہیں، سمجھا یہی جاتا ہے کہ عبادت اور دعا، ذکر و فکر، نماز روزہ وغیرہ جیسے مذہبی لوازم و آثار کے مضحکہ اڑانے والوں سے بہرحال وہ بہتر ہیں، جو مذہبی کاروبار کی ان شکلوں کو اب بھی احترام و عظمت ہی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کی قدر و قیمت کے معترف بھی ہیں اور عملاً جو اس کاروبار میں مشغول ہیں ان کی اب بھی عزت اور کافی عزت ان کے قلوب میں پائی جاتی ہے۔ خواہ یہ سارے مذہبی کاروبار "خالق" نہیں بلکہ "مخلوق" ہی کے تعلق سے ان میں انجام دئے جاتے ہوں، کہا جاتا ہے کہ نام تو جپتے ہیں،

خالقِ کائنات کے "اسماء حسنیٰ" نہ سہی اس کی کسی مخلوق، مثلاً آفتاب و ماہتاب وغیرہ کے ہمسر نام ہی سہی، بہرحال ان سے تو بہتر ہیں جو "نام جپنے" یا "ذکر" کے اس طریقہ ہی کو سرے سے مہمل اور احمقانہ فعل قرار دئے ہوئے ہیں،

کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ بجائے خوابیدہ اور معطل و مفلوج بنا کر چھوڑ رکھنے کے، مذہب اور دین کے فطری تقاضے ان میں بیدار اور برسرِ کار تو ہیں، "خالق" نہ سہی "مخلوق" ہی کے ساتھ اپنے ذہنی میلان، اور رجحان کا رشتہ قائم کر کے اس کو وہ جگاتے اور ترو تازہ تو کرتے رہتے ہیں،

باقی آئندہ

طالب آملی

ملک الشعرار ۔ شہنشاہ جہانگیر

(از لیفٹننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب بی اے ۔ ایم ۔ ایس)

تمہید

ہمارے پاس اس وقت تک جو کچھ بھی معلومات طالب آملی سے متعلق پہونچی ہیں ہم ان کے لئے مولانا شبلی نعمانی کے مرہون منت ہیں کہ انھوں نے شعرالعجم جلد سوئم میں اپنی معلومات کو پہلی مرتبہ یکجا کیا۔ ایڈورڈ براؤن جو کچھ لکھ گیا ہے اس نے بھی شعرالعجم ہی سے اپنا مواد مستعار لیا ہے اور ارمغان پاک کے دیباچہ میں شیخ محمد اکرام نے جو کچھ جمع کیا ہے اس کے لئے ان کی نگاہ بھی شعرالعجم ہی کی طرف اٹھی ہے' البتہ کتاب کے اوراق میں جو انتخاب درج ہے اس کے لئے وہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے مرہونِ منت ہیں جیسا کہ دیباچہ میں انھوں نے خود لکھا ہے۔ ارمغان پاک میں صوفی تبسم کا یہ انتخاب شبلی کے انتخاب سے مختلف ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان طالب آملی نہ تو شبلی مرحوم کے ہاتھ لگا اور نہ ہی براؤن کے اور نہ ہی شیخ اکرام اسے دیکھ پائے۔ کہ کہیں اس کے متعلق ذکر نہیں ملتا۔ البتہ شیخ اکرام کا ایک خط ہے جو انھوں نے ہمیں لکھا ہے اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ صوفی تبسم کے پاس طالب کا دیوان موجود ہے اور اسی میں سے انھوں نے وہ انتخاب کر کے انھیں روانہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر تعجب کی یہ بات ہے کہ صاحب تنقید شعرالعجم بھی اس امر کو نظرانداز کر گئے ہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ انھیں بھی دیوان طالب آملی دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ وہ اس انتخاب کی اصلیت سے ضرور آگاہ کرتے۔ صوفی تبسم والے انتخاب میں شبلی کا ایک شعر بھی دہرایا نہیں گیا۔ اس تفاوت انتخاب کی وجہ ہم ذیل میں

عرض کرتے ہیں۔

دیوان طالب آملی

ہمیں حال ہی میں طالب آملی کے دیوان کا ایک خطی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کہ مکمل اور نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ جب شبلی کے انتخاب کا مقابلہ ہم نے اس دیوان سے کیا تو سوائے چند اشعار کے جو شبلی نے نقل کئے ہیں باقی اس میں ناپید تھے۔ البتہ ارمغان پاک میں صوفی تبسم کا تمامتر انتخاب اس نسخہ سے لیا ہوا معلوم ہوتا ہے! ہمارا یہ نسخہ بڑا مستند ہے جیساکہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ جہانگیر کا انتخاب جو شبلی نے تزک جہانگیری سے پیش کیا ہے، وہ بھی اس دیوان سے ہی لیا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ تمام اشعار من وعن اس میں موجود ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنف تذکرہ میخانہ نے جس سے شبلی نے اپنا انتخاب کیا ہے یہ اشعار کہاں سے نقل کر لئے ہیں۔

طالب آملی کا دیوان ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے نسخے کہاں کہاں اور کس حالت میں موجود ہیں اگر یہ پتہ چل جائے تو ان سب کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اصل حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے کہ کونسا انتخاب اصل ہے کون سا جعلی! ممکن ہے اس دیوان کے علاوہ کوئی کلیات بھی ہو۔ کیونکہ میخانہ کے حوالہ سے شبلی نے ایک مقام پر اپنے مقالے میں کلیات کا ذکر کیا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کا انتخاب تو درست ہے ہمارے نسخہ کے مطابق لیکن میخانہ والا سوائے چند اشعار کے اس دیوان میں موجود نہیں۔ اب ذرا ہمارے اس نسخہ کی تفصیلات ملاحظہ ہوں تاکہ اس کی اہمیت کھل جائے۔

اس دیوان کا حجم ۱۶×۶×۲ ہے اور ضخامت ۷۰۹ (سات سو نو) صفحات ہے نسخہ نہایت خوشخط اور مُطلا ہے اور مشہور کاتب محمد حسین مروارید رقم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو کہ اس زمانے کا مشہور خطاط تھا دیوان کے آخر میں تاریخ یوں درج ہے

"نوشتہ مطابق فرمائش حضرت بادشاہ عالم تاب تحریر فی التاریخ سیم

ماہ محرم الحرام ۱۰۴۲ھ"

بادشاہ عالم تاب سے مراد شاہجہاں ہے کہ جہانگیر کی وفات پہلے ہوچکی تھی۔

اس نسخہ میں تعداد اشعار تقریباً پندرہ ہزار ہے۔

دیوان تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا حصہ مثنوی پر مبنی ہے دوسرا غزلیات پر اور آخری حصہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ مثنویاں پہلے تریسٹھ (۶۳) صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور غزلیات نے ۵۵۲ صفحے لے رکھے ہیں۔ آخیر میں رباعیات کا مجموعہ ہے جو ۹۳ صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔ مثنوی میں اشعار کی تعداد ۱۳۶۰ ہے۔ کل رباعیات ۴۴۶ ہیں اور غزلیات میں اشعار کی تعداد بارہ ہزار کے قریب ہے۔

شبلی جن قصائد کا ذکر کرتے ہیں . . . . وہ اس دیوان میں موجود نہیں۔ البتہ جستہ جستہ مدحیہ اشعار شہنشاہ جہانگیر کی تعریف میں غزلیات کے اندر نظر پڑتے ہیں۔

پیدائش و تاریخ وفات

ہمارے پاس طالب کی پیدائش معلوم کرنے کے ذرائع مسدود ہیں البتہ کچھ واقعات سے سالِ وفات کا ضرور استنباط کیا جا سکتا ہے اور ان واقعات سے تخمیناً یہی پتہ چلتا ہے کہ سالِ پیدائش ۱۰۰۰ھ ہوگا۔ وہ واقعات ہم ذیل میں اختصاراً درج کرتے ہیں:

۱۔ شبلی شعر العجم جلد سوم ص ۱۷۹ پر رقم طراز ہیں "طالب نے ۱۰۳۶ھ میں یعنی جہانگیر کے مرنے سے ایک برس پہلے عین شباب میں وفات پائی" گویا جہانگیر کی وفات ۱۰۳۷ھ میں واقع ہوئی۔ ہمارے اس نسخہ کے آخیر میں کاتب کے ہاتھ کا ایک قطعہ تاریخ وفات طالب آملی موجود ہے۔ جو ملا صبوری مشہدی نے شاعر کی وفات پر کہا اس کے مطابق تاریخ وفات ۱۰۳۵ھ بنتی ہے نہ کہ ۱۰۳۶ھ جیسا کہ شبلی نے لکھا ہے۔ قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

از چرخ بگوئے زرفتن طالب داد کام روز نوائے نظم از پا افتاد

تاریخ وفاتش از خرد جستم گفت حشرش بہ علی ابن ابی طالب باد
۱۰۳۵

۲۔ شبلی تزک سے نقل کرکے لکھتے ہیں کہ جب طالب کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تو اس وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔

۳۔ اور طالب کو ملک الشعراء کا خطاب تزک کے مطابق ۱۰۲۸ھ میں ملا۔ گویا ۱۰۲۸ھ میں طالب کی عمر بیس برس کی تھی۔ خطاب حاصل کرنے کے تقریباً سات آٹھ برس بعد ان کی وفات ہوئی جیسا کہ قطع وفات سے ظاہر ہے۔ اس لئے وفات کے وقت ان کی عمر ۱۰۳۵ھ میں ۲۷/۲۸ برس کی ہوگی۔

۴۔ اس حساب سے طالب کی پیدائش ضروری ہے ۱۰۰۷ھ میں ہوئی ہو اور وفات "عین شباب" میں کہ عمر ۲۸۔۲۷ برس کی ہوگی۔

ایک رباعی ہمیں اس دیوان میں ملتی ہے جو بیس برس کی عمر میں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے اس وقت طالب ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہو گیا ہو، کہ اس میں ایک ایسے احساس کی جھلک محسوس ہوتی ہے ؎

در جہل گذشت سال عمرم از بیست
با بیہدہ گذشت و بر من نگریست

آن تخم نہ کشتم کہ پس از مرگ توان
بر تربت من نوشت کین شہد کیست

تعلیم شعر العجم حصہ سوم ص ۱۶۵ و ۱۶۶ پر شبلی، طالب کے ہمہ گیر علم کا تذکرہ کرتے ہیں اور خود طالب کے ہی ایک قصیدے سے اس بات کا جواز نکالتے ہیں کہ اس نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں منطق ہندسہ و فلسفہ وغیرہ پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ یہ قصیدہ ہمارے والے نسخہ میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کہیں اور کوئی شعر ہے جس سے طالب کی ابتدائی تعلیم کا پتہ چل سکے البتہ ایک غزل میں طالب اپنے علم کے متعلق بڑی انکساری ظاہر کرتا ہے اور یہی سب سے بڑی

دلیں اس کی طبیعت کی ہو سکتی ہے۔ یہ اشعار قابل غور ہیں کہ ان سے اس کے مذہبی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ع

زفیض شکرستانِ سخن یارب نصیبم دہ
بیانِ طوطی وادی، زبانِ عندلیبم دہ

غریبانِ راہم ربطیست یاز در جہاں من ہم
غریبم در صف اہل سخن معنی غریبم دہ

چوں طفلاں شوخ چشم و بے ادب بودم دریں مکتب
ادیبم دادہ فیضے راز آدابِ ادیبم دہ

بجز راہِ سخن با دوست کافی نیست عاشق را
خدایا با حبیب خویش تن قربِ قریبم دہ

خدایا نعمت دیدار می خواہم منیگویم
کہ از باغ بہشتِ خود، ترنج و نار و سیبم دہ

چوں طالب بج معنی آفرینم دادۂ یارب
یکے در حرب گفتاری زبانِ دلفریبم دہ

مذہبی اعتقادات طالب مذہبی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ صوفیانہ طبیعت اس پر غالب نظر آتی ہے وحدت وجود کا قائل نظر آتا ہے ایک غزل سے اس کا یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے ع

شریک درد جہانیم اگر چہ بیدردیم
بلے بہ مذہب ما صوفیاں وجود یکیست

وجود کے متکثر شود بکثرتِ خلق!
اگر بہ بحر در آید ہزار رود یکیست

ہنر ز قبلہ نما کسب کردہ ام طالبؔ

بہ سمت دوست مرا سر یکی و سجود یکیست

طالب شرع کا پابند اگر نہیں تو کم از کم شرع کا حامی ضرور ہے کہ خود ایک جگہ کہتا ہے

کم فروغ خود گیرد نور شرع پذیرد　　کہ آفتاب شریعت بہ از ستارۂ عقل

گہی بہ مشورتِ شرع نیز میکن کار　　بتمام عمر مدہ باستخارۂ عقل

ہیچ گوشِ ارادت ز حکم نافذ شرع　　کہ در اجارۂ شرعی نہ در اجارۂ عقل

عروجِ پایۂ معراج مصطفےٰ ابنگر　　یکے بقدر فرود آی ازیں منارۂ عقل

بہ بزم شرع چو ایمانیاں درآ طالبؔ　　مکن ز دور چو یونانیاں نظارۂ عقل

البتہ طالب ملا کے مذہب سے کچھ بیزار سی نظر آتا ہے، ممکن ہے یہ اس لئے ہو کہ فرائض کی پابندی گراں گذرتی ہو۔ ایک شعر میں کہتا ہے ۔۔

طالبؔ از اسلام زاہد کس رخ فیضی ندید

زیں سبب یک عمر با کیشِ برہمن ساختیم

تعلقات و روابط شبلی نے شعر العجم میں کئی ایک لوگوں سے طالب کے تعلقات واضح طور پہ بیان کئے ہیں اور جگہ جگہ قصائد سے اپنے بیانوں کی تائید بھی کی ہے ہمیں افسوس ہے کہ موجودہ نسخے سے ہم بیشتر ایسے بیانوں کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ مثلاً ص ۱۶۶ پر میر ابو القاسم کی مدح میں جس قصیدہ کا ذکر اور حوالہ دیا گیا ہے وہ ہمارے نسخہ میں ناپید ہے۔ اس کی اور دوسرے آنے والے تفاوت کی تفصیل ہم آگے مناسب عنوان کے تحت درج کرینگے، ص ۱۶۷ پر پھر ایک قصیدے کی تفصیل منقول ہے، یہ بھی ہمارے اس نسخے میں موجود نہیں۔

۲۔ شاہ ابو المعالی کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ بھی اس دیوان میں کہیں نہیں ملتا اور نہ ہی قلم خان نمازی والا قصیدہ اس نسخے میں موجود ہے۔ البتہ عبداللہ خاں فیروز جنگ جس کا ذکر شبلی ص ۱۷۲ پر کرتے ہیں اس دیوان میں اس کا ذکر ایک جگہ ملتا ہے اور وہ ان اشعار میں ہے۔

برزبان خامۂ وصف عالی داشتم

ناگہاں خورشید لوحے سادہ از تحریر شد

صاحب سیف و قلم فرزانۂ عبداللہ خاں

کز کفش ہم کلک عالی رتبہ ہم شمشیر شد

اور شاید مندرجہ ذیل شعر میں اس خط کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر شبلی کرتے ہیں۔

آں بلند اقبال صاحب طالع فیروز جنگ

کاتب فتح و ظفر در عہد او تغییر شد

(۴) عرفی کا ذکر طالب نے صرف دو جگہوں پر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اول

کسر نفسیت مرا یا د ز عرفی طالب

ورنہ وصف گہر قطرہ ز دریا دور است

اور دوسرا یوں لکھا ہے

بہ خاک عرفی اگر طالب ایں غزل خواند

ز تربتش ہمہ گلہائے آفریں روید

(۵) شاہ پور طہرانی کا ذکر شبلی نے ص ۱۷۴ پر کیا ہے اور جو شعر انھوں نے نقل کیا اس کے سوا اس نسخے میں بھی اور کوئی دوسرا شعر نہیں ملتا یعنی

بخسرو داشتم روی نیازی در سخن طالب

از و وا سوختم چوں صنعت شاہ پور را دیدم

(۶) اعتماد الدولہ والد نور جہاں بیگم کا ذکر بھی صرف ایک جگہ اس نسخے میں وارد ہوا ہے وھو ھذا

خاکپائے اعتماد الدولہ ام کز روی قدر

برگ سبز آسمان از باغ دولت خیزاد ست

ص ۱۷۵ پر شبلی پھر ایک معذرتی قصیدے کا ذکر کرتے ہیں یہ بھی ہمارے اس نسخے میں

ناپید ہے۔ اور یہ تمام اقتباس بھی شبلی نے تذکرہ میخانہ ہی سے لیا ہے۔ وہ اشعار جو ایک قصیدے کے ص ۱۷۱ پر نقل ہوئے وہ بھی نہیں ملتے۔

(۷) جہانگیر کی ناراضگی والا قصہ اور طالب کی ہمشیرہ ستی النساء والا معاملہ بھی اس نسخہ سے ظاہر نہیں ہوتا ان کے ساتھ ہی ص ۱۸۲ و ۱۸۳ والا انتخاب بھی ہمارے ہاں اس دیوان میں نہیں ملتا اور نہ ہی داڑھی ترشوانے والا واقعہ نظر آتا ہے۔ لیکن ص ۱۸۴ و ۱۸۵ پر جو انتخاب منشی فیروزین سے متعلق درج ہے وہ بعینہ ہمارے والے نسخے میں بھی موجود ہے۔

ہندوستان میں ورود طالب کی ایک رباعی سے پتہ چلتا ہے کہ ایران چھوڑنے پر وہ توران چلا گیا جہاں کچھ عرصہ اس نے خامہ فرسائی کی۔ اس کے بعد وہ قندہار اور ہندوستان کا چکر لگاتا ہے، لیکن یہ بھی واضح نہیں کہ وہ قندہار پہلے گیا یا ہندوستان سے ہو کر آیا۔ پہلے توران جانے کے متعلق رباعی ملاحظہ فرمایئے۔

طالب ببرانہ یاد پریشانی را
طی کن ورق بی سروسامانی را

بگشا زبان کہ اہل توران بینند
دستان زنی بلبل ایرانی را

(۲) قندہار کا ذکر ایک غزل میں آیا ہے اور یہ شعر غزل سے چھوٹ گیا ہے، کاتب نے دوبارہ اپنے ہاتھ سے اسے حاشیے پر لکھ دیا ہے۔

دلا مزاج ترا قندھار در خور نیست
بیا کہ دیدہ ام از اتنک ملک پنجاب است

اس غزل کا مطلع اور مقطع بھی ملاحظہ فرمایئے۔

مگو سرشت من از جنس آتش و آب است
کہ این گہر خلف دودمان سیماب است!

برون ز محفلِ عیش حسد ایگان طالب
مئی کہ در قدح نیست رشک خونابست[1]

ایک قصیدہ کے کچھ اشعار جن میں لاہور، دلی وغیرہ کا ذکر ہے وہ بھی ہمارے اس نسخے میں نہیں ملتا۔ البتہ ایک دو اور غزل کے شعروں میں ایک ایک بار لاہور اور دلی کا ذکر ضرور آیا ہے اور یہ اشعار خود شبلی نے بھی نقل کئے ہیں: تکرار نامناسب نہ ہوگی۔

(۳) چہ خوش حالیم کہ بعد از مدت یک سالہ مہجوری
خوش وخوش وقت اورا دیدم ولاہور را دیدم

---

[1] ہندوستان سے طالب بڑا متاثر نظر آتا ہے ایک تو فرداً فرداً اس کے مقامات کا ذکر کرکے اپنی دلچسپی ظاہر کرتا ہے اور دوسرے مجموعی طور پر بھی ہندوستان کی تعریف کرتا نظر آتا ہے چنانچہ ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ع

مرو بدین بلبل سوئے چمن طالب — بیا کہ بلبل مست غزل سرا اینجاست
در آبہ ہند بہ بین رتبۂ سخاوسخن — کہ منبع سخن ومعدن سخا اینجاست
بہ ہند جوہریان قدر فضل نشناس — رواج گوہر دانش بہ دعا اینجاست
تو فاضلی نظر از قبلۂ افاضل جوی — پناہ فضل جہانگیر بادشاہ اینجاست

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ چونکہ اسے یہاں اس کے کلام کے قدر دان مل گئے اور صلہ ملتا رہا اس لئے اسے یہ ملک پسند تھا۔ چنانچہ یہ جہانگیر کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ وطن چھوڑنے کی وجہ صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ غربت تھی۔ ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ طالب اپنے وطن آمل سے بیزار ہو گیا تھا لیکن ورود ہندوستان کے بعد اکثر آمل کو اچھی زبان سے یاد کرتا ہے اور اس کی خوبیاں بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتا غالباً مالی مشکلات ہی تھیں جنہوں نے اسے تلاش معاش کی خاطر ہندوستان دھکیل دیا۔ شاید اسے کوئی اپنے شہر کا دردمند نہیں ملا۔ وطن بیزاری والا یہ شعر ملاحظہ ہو ع

بہ غربت بستہ ام دل تا قیامت باز نگشایم
وطن بیزارم آما باکسی دل ایں راز نگشایم

طالب ز بان طوطی وصلی نثراد را

(۴) خود دو بان بلبل آملی ندیده ام!

ہندوستان میں ایک مہم کا ذکر بڑے زور شور سے طالب نے کیا ہے جس میں ندی نربدا اور ملک دکن کا ذکر ہے، یہ اشعار شبلی نے نقل نہیں کئے۔ قرائن کے ملاحظہ کے لئے اس غزل کے کچھ اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں یہ کوئی مہم گراں تھی جس میں طالب خود شامل تھا ع

چوں موج زد سپاہ شہنشہ بہ نربدا

ملک دکن باہل دکن گشت غم کدہ

باخویش گفت حاکم آں عرصہ کیں زماں

نے مکر و حیلہ فائدہ دارد نہ شعبدہ

ایں بادشاہ خطہ دلہیت بی خلاف

بایک جہاں سپاہ بایں کشور آمدہ

ویں شاہ خرم است کہ در بزم بادشاہ

تسلیم کردہ ضامن فتح دکن شدہ

گجرات (مالوہ) کی طرف بھی طالب کا گذر ہوا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں جا سکا۔ غالباً برسات کا موسم ہوگا کہ یہی ادھر پرلطف موسم ہے۔ ایک شعر میں کہتا ہے ع

در حسرت لعل تو ز ہند تر طالب

چنداں یمنی ریخت کہ گجرات یمن شد

کشمیر سے دلچسپی

طالب کشمیر کا بڑا دلدادہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے آمل سے بھی کسی قدر لگاؤ تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ وطن مادری ہر ایک کو پیارا ہوتا ہے، تاہم کشمیر کا حسن اور اس کے دلنشین مناظر طالب کے دل میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ چنانچہ کہتا ہے ع

بیا کہ مجمع خوباں دلربا اینجاست

کرشمہا ہمہ اینجا و نازہا اینجاست

قدم ز نقطۂ کشمیر برنمی گیرم!

مقیم مرکز عیشم و جای ما اینجاست

کجا بہشت کجا بزم بادہ ای زاہد

تو دل بجائے نگہ بستہ و جا اینجاست

بکنج گلشن خویشم ہوائے گلشن نیست

کجا روم کہ مرا باغ دلکشا اینجاست

کلام مولانا شبلی کے بیشتر اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نسخہ کے علاوہ اس کا کوئی اور بھی مجموعہ ہوگا، جس کو دیکھ کر مصنف "تذکرہ میخانہ" نے طالب کا حال قلمبند کیا اور چونکہ وہ طالب کا ہم عصر تھا اس لئے اس بات کا اور بھی زیادہ امکان ہے کہ اس کا انتخاب کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اس سے دو باتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ طالب کا کچھ مجموعہ کلام ایران میں لکھا گیا جو کہ غالباً کلیات کی شکل میں ہوگا۔ اس کلیات کا ذکر شبلی نے بھی ایک جگہ میخانہ کے حوالے سے اپنے مقالہ میں کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ طالب نے اپنا پورا ایک دیوان ہندوستان میں آنے کے بعد بادشاہ جہانگیر کے حکم سے بھی ضرور ترتیب دیا ہوگا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کہ اس نے ملک الشعرا کے خطاب سے اُسے سرفراز ا۔

ان دو وجوہات کے علاوہ اور کوئی تیسری بات نظر نہیں آتی جو اس بات کی شاید ہو کہ شبلی کا بیشتر انتخاب ہمارے والے نسخہ میں کیوں موجود نہیں۔ ایسا بھی یقیناً ہے کہ بعض اشعار جو شبلی نے میخانہ سے نقل کئے ہیں وہ ہمارے والے نسخہ میں بھی موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طالب کا ایران کے زمانہ کا کلام کچھ اس دیوان میں بھی شامل ہوگیا ہے۔ یہاں [illegible] کہ واقعی طالب کا کچھ کلام ایسا ہے جو ایران میں لکھا گیا و یہ چلا ہوا تعریف میں اشعار [illegible] ہندوستان میں تو وارد نہیں ہوا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ اشعار واقعی طالب نے کہے

ہیں تو پھر ہندوستان میں کچھ لکھا ہوا کلام اس کا ایسا ہے جو اس دیوان میں شامل نہیں کیا گیا اور اس کی وجہ بھی معلوم نہیں ہو رہی یا پھر یہ اشعار بعد کے ہیں اور طالب کے لکھے ہوئے نہیں ہیں!

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہر دو قسم کا کلام چار طرح سے ترتیب دیا جا سکتا ہے اول قصائد دوم مثنویاں سوم غزلیات اور چہارم رباعیات - ایرانی دور کا کلام زیادہ تر قصائد اور رباعیات پر مشتمل معلوم ہوتا ہے کہ جن قصائد کا اقتباس شبلی دیتے ہیں میخانہ کے حوالے سے وہ اس ہندوستانی مجموعہ میں ناپید ہیں - گویا ترتیب کلام یوں ہوئی - ایرانی کلام میں قصائد اور رباعیات اور ہندوستانی مجموعہ میں مثنویاں غزلیں اور رباعیات - اگر یہ ترتیب درست ہو تو یقیناً طالب کا ایرانی مجموعۂ کلام جو مصنف میخانہ کے وقت موجود تھا اب بھی کہیں کسی گوشہ میں محفوظ ہوگا -

مصنف تذکرہ میخانہ کے بیان کے مطابق طالب کا ورود ہندوستان میں ۱۰۲۰ھ میں ہوا جب اس کی عمر پندرہ برس کی تھی لیکن یہ غلط ہے - ہمیں اس بیان پر یقین کرنے میں اس لئے تردد ہے کہ اگر ۱۰۲۰ھ میں طالب کی عمر پندرہ برس کی تھی تو ۱۰۳۵ھ میں جب کہ وہ فوت ہوا اس کی عمر تیس (۳۰) برس کی ہونی چاہیئے لیکن ہم نے ابھی بالا ثابت کیا ہے کہ طالب کی عمر وفات کے وقت ۲۰ برس کی تھی -

یہ نسخہ جس کا ہم بار بار ذکر کر رہے ہیں یہ ۱۰۳۵ھ میں بادشاہ عالمتاب کے حکم سے لکھا گیا یہ بادشاہ عالمتاب بادشاہ شاہجہاں ہوں گے کیونکہ جہانگیر طالب کے دو سال بعد وفات پا گیا تھا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کاتب نے طالب کا ایرانی کلام بھی جو اس کے وقت رائج ہوگا کچھ نہ کچھ ضرور اس میں شامل کر لیا ہوگا - لیکن اس سے یہ کشمکش دور نہیں ہو جاتی - بلکہ اشکال اور بڑھ جاتا ہے -

کیا وجہ ہے کہ شبلی نے جو انتخاب تزک جہانگیری کے حوالے سے دیا ہے وہ تو ہمارے اس مجموعہ میں موجود لیکن صاحب میخانہ سے اس نے انتخاب نہ لیا ہو - ممکن ہے جہانگیر نے وہی کلام پسند کیا ہو جو اس کے دربار میں رہ کر طالب نے تخلیق کیا تھا اب ہم دیوان کے الجھاؤ کو بدستور چھوڑ کر

کچھ طالب کی شاعری کے متعلق عرض کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ موضوع ہمارے دائرہ مطالعہ سے خارج ہے اور ہم اس میدان کے شہسوار نہیں۔ یہاں نہ تو تنقید و تبصرہ مقصود ہے اور نہ ہی لوازمات شاعری کی موشگافیاں۔ چونکہ طبیعت کو تحقیق سے ایک گونہ لگاؤ ہے اس لئے یہ بات مدِنظر رکھ کر کہ عوام کو طالب کے دیوان سے آگاہ کر دیا جائے، یہ چند اوراق بے ترتیبی سے مرتب کر دئے گئے ہیں۔

موجودہ مجموعہ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر موتی اگل گیا ہے اور طالب کا ہر شعر ایک پری پیکر کی طرح جھومتا نظر آتا ہے زبان سلیس اور شیریں کہ مجھ جیسا ہیچمدان بھی سمجھ جائے ترکیبیں نہایت سادہ اور پُر لطف کہ کیفیت پر وجد آجائے نہ تو کہیں زبان کے کپڑے اتار کر اُسے ننگا کیا گیا اور نہ ہی اس پر بھاری بھرکم دوشالے اوڑھے گئے۔ بلکہ ہر ہر بات کو ایسے لطیف نازک انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ سبحان اللہ! اسلوب بیان تمامتر نازک خیالی کے رنگ میں رنگا ہوا، تخیل اس قدر سہل اور سیدھا سادھا کہ شعر پڑھتے ہی مطالب دل میں اتر جائیں اور شاعر کے اصل مقصد کو روشن کر دیں نہ کوئی لمبی چوڑی تمہید ہے اور نہ تکلف۔

ہر بات بے ساختہ نوکِ قلم سے اترتی چلی جاتی ہے۔ ہماری نگاہ میں شاعری کا سب سے بڑا وصف اس میں موجود ہے طالب اپنے کلام میں فصاحت کا مکمل شعور رکھتا ہے چنانچہ ایک شعر میں لکھتا ہے

قسم بہ نشأ طالب کہ ایں کلام فصیح　　　نہ از مقولہ سحر است بلکہ اعجاز است

البتہ طالب کا کلام خمریات سے پر ہے۔ اس میں سرور بھی ہے اور سرود و رقص بھی اس میں مسرت اور شادمانی کی جھلک بھی نمایاں ہے اور مستی اور خمار بھی ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شبلی بالکل درست کہہ گئے ہیں کہ طالب فطرتاً شاعر تھا یعنی بہت کم سن تھا جب اس نے شعر کہنے شروع کر دئے تھے اور کہتا بھی کیا خوب تھا۔

اس سے پیشتر کہ ہم طالب کے کلام کے کچھ نمونے پیش کریں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ ہم نے طالب آملی کے اس دیوان کے پندرہ ہزار اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ دورانِ مطالعہ میں ہم نے ۷۶۳ اشعار منتخب کئے تھے۔ بوقت انتخاب شعر چھانٹنے میں بڑی دقت پیش آئی کہ کونسا شعر لیا جائے اور کونسا رد کیا جائے۔ ہر شعر دوسرے سے بڑھ کر تھا۔ کلام اس قدر فصیح اور سہل کہ سمجھنے میں مطلقاً دقت نہیں ہوئی۔ تمام دیوان میں شاید بیس پچیس اشعار ایسے تھے جو کاغذ کی خستگی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئے۔ جب یہ انتخاب ہم نے ختم کیا تو پھر ایک بار اس پر نظر ثانی کی اور دوسری مرتبہ اشعار منتخب کئے کہ پہلا انتخاب تیس فل سکیپ صفحوں پر پھیل گیا تھا۔ دوسری مرتبہ انتخاب ہوا [illegible] ۱۷۱ اشعار ہم نے چنے۔ اب جو انتخاب ہم ذیل میں پیش کریں گے وہ درحقیقت انتخاب در انتخاب کا انتخاب ہے۔ گویا ایک سہ آتشہ ہے جو مفت لٹایا جا رہا ہے۔ ہم اشعار کو اسی ترتیب سے نقل کریں گے جس طرح کہ دیوان سے ہم نے خود نقل کئے ہیں۔ اشعار کے ساتھ ساتھ صفحوں کے نمبر بھی دے دئے گئے ہیں تاکہ پتہ چل جائے دیوان کے کون سے صفحے سے متعلق یہ شعر ہے۔ اوّل مثنوی سے کچھ اشعار نقل کریں گے اور بعدہٗ غزلیات سے شعر نقل کریں گے اور آخرا چند ایک رباعیات نقل کر کے اس مقالے کو لپیٹ دیں گے۔

فارسی ادب کے شائقین کے لئے یہ ایک نئی چیز ہے جس میں مزید تحقیق اور جستجو کی بہت گنجائش ہے۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ جب یہ مقالہ چھپ جائے تو قارئین سے اس سے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے ابھی سے ہندوپاکستان اور انگلستان کے مستشرقین سے اس معاملہ میں خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ ان کی معلومات سے استفادہ حاصل کر کے اس مقالے کو از سرِ نو دو آتشہ انتخاب کے ساتھ ترتیب دیا جائیگا۔ اگر معلومات اہم اور بکثرت حاصل ہو گئے تو اصل انتخاب جو ۷۶۳ اشعار پر مشتمل ہے اس کے ساتھ ایک رسالے کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

اصل بات طالب آملی کے دیوان کے مختلف نسخوں کا پتہ چلانا ہے اور پھر ان سے اپنے دیوان کا مقابلہ کرنا۔ موجودہ تحقیق کے وقت نہ تو اتنی فرصت تھی اور نہ ہی ذرائع۔ یہ بھی محض جو لکھا گیا ہے

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہی ہے۔ دفتر کے اوقات کے بعد روزانہ چار گھنٹے مسلسل بیس دن اس دیوان کے مطالعہ میں صرف ہوئے اور ساتھ ساتھ انتخاب بھی کرتا گیا۔ پھر تین روز میرے سہ آتشہ انتخاب میں صرف ہوئے اور ایک دن اس مقالے کو ترتیب دیئے ہیں۔ گویا تقریباً ایک مہینہ اس ایک مقالے کے لکھنے میں صرف ہو گیا! اس عرصہ میں ساتھ ساتھ متعدد خطوط بھی لکھے گئے جن میں سے چند ایک کے جواب بھی آچکے ہیں لیکن معلومات میں اضافہ نہیں ہوا۔ بہت سے صاحبِ علم اصحاب جن سے میں آشنا نہیں اور جن تک میری رسائی نہیں ان سے میری یہی استدعا ہے کہ وہ مہربانی فرما کر جس قدر بھی معلومات بہم پہنچا سکیں اس موضوع سے متعلق وہ مجھے کیمبل پور میں لکھ کر مشکور ہونے کا موقع دیں۔ اب سہ آتشہ انتخاب ملاحظہ فرمائیے ع

سیر کردم نسخۂ اشعار طالب را تمام
دفترش از حشو خالی لفظش از معنا پُر است

انتخاب از مثنوی

(۱) الٰہی شعلہ شوقم فزوں ساز — مرا آتش کن و در عالم انداز
دلم را چشمۂ نور یقیں ساز — درین تاریکیم باریک بیں ساز

(۲) لباس باطنم را شست و شو دہ — گلے بے رنگیم را رنگ و بو دہ

(۳) دو لب دارم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہی ہائے مستی

یہ شعر جہانگیر نے تزک میں نقل کیا ہے۔ یہ شعر دو بار دیوان میں وارد ہوا ہے، ایک تو یہاں مثنوی میں اور دوسرے ایک غزل میں مطلع کی صورت میں بھی آیا ہے، جہاں اس کے بعد کا شعر یہ ہے،

(۵۱۹) درازی ہائے دامانِ وصالش — کند جان در تن کوتاہ دستی
اور مقطع ہے جہاں کم دہ زبون چرخ طالب — کہ در طبع بلندم نیست پستی

(۸) بیا طالب خموشی پیشہ سازیم — خرد را رہبر اندیشہ سازیم

---

(۲۲) زنی دارم از دودانِ اصیل — باندام نازک بصورت جمیل
نگارے ز سر تا قدم رنگ و بوی — بہ حسن گل و سنبلش روی و موی
چو بر فرش مخمل نماید گذار — بہ پایش نماید خواب مخمل چو خار

---

(۴۵) نہ کنم آرزوے ہم نفسی — نہ نمایم مراد خود بکسی
جز خدا با کسی نگویم راز — نکنم ہیچ کار غیر نماز
ہر کہ را رحم نیست ایمان نیست — گرچہ سلمان بود مسلمان نیست

انتخاب از غزلیات

(۶۳) صفحے تک مثنویاں ہیں اس کے بعد پھر صفحات کا شمار از سر نو کیا گیا ہے)

(۳) آن ترک مست کیست درآماجگاہ حسن — کز تیر غمزہ کردہ مشبک نشانہ را

---

(۴) شعلہ مزاج مطربہ سخت فسردہ خاطرم — آتش نغمہ تیز کن ساز تمام سوز را

---

(۷) شہد است تکلم لب دوست — زخم است تبسم دل ما
بلبل کند آرزو کہ باشد — پروانۂ شمع محفل ما !!!

---

(۲۰) بود عجب ز آتش دل بعد مرگ نیز — گر خشت خام پختہ شود بر مزار ما

---

(۳۰) اگر مراد تو آزردن رگ دل است — اشارۂ مژہ کافیست نیشتر مطلب

---

(۳۷) لالہ دشت و غزل ختن و نرگس باغ — ہمہ مستند ولے چشم تو مست دگر است
ناوک شست بلا را بود چندیں زور — طالب ایں برق ستانندہ را دگر شست است

---

(۴۲) تکیہ بر سنگ خارہ زد طالب — ز آتش عشق تکیہ گاہ بسوخت

---

(۴۸) چہ می پرسی ز راہ و رسم طالب — شورش مستی و مستی جنون است

---

(۵۷) نیستم طالب ندارم چشم بہ خم خانہ — نیستم جامی بہر ترتیب [illegible] آمدہ است

---

(۸۱) بہار آمد کہ گردد جسم و جاں مست — شود دل مست چوں بلبل زباں مست

بہار آمد کہ از بوی گل و می ! زمین بے ہوش گردد آسمان مست
چرا مستانہ می غلطد بہر سو ! بجز دل نیست گر آبِ روان مست
چوں بہ بستان نباشد ہیچ تکلیف چرا طالب نباشم جاودان مست
زبان مستی بلبل بہار است تو چوں طالب شدی فصل خزان مست

---

(۸۴) ہم چوں آں ماہی کہ در آتش فتد ناگہ ز آب میطپم در خاک آں ساعت کہ مے در جام نیست

---

(۹۲) بہر زمین کہ سرو قدم من قدم نہاد زاں خاک دستہ دستہ گل و یاسمن شگفت
بہ زلف و عارضش نظر از بس کہ دوختم سنبل ز دیدہ ام بدمید و سمن شگفت
(۹۳) در نو بہار عدل جہانگیر بادشاہ گلزار طبع طالب رنگین سخن شگفت

---

(۱۱۴) چشمِ مخمور تو پیمانہ صد نرگس مست از می ناز تہی کرد و خمارش نشکست

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع این شراب است کہ ہم پختہ و ہم خام خوشست
طالب از آتشِ دل تافتہ گر یا بہ چشم کو قدم رنجہ نما دوست کہ حمام خوشست

(پوری غزل کے پندرہ شعر ہیں)

(۱۲۶) گفتم دمے بگوشۂ بالین من نشین بنشست و نالۂ دو سہ از من شنید و رفت

نیم ز دیدن کشمیر شاد چوں طالب کہ سیر سازی و گل گشتِ آلم ہوس ماست

---

(۱۳۱) بس تنگ ظرفست طالب قیا کم دہ کہ باز مست خواہد گشت و صد جام و سبو خواہد شکست

(۱۴۱) در آتشِ دلِ خود زنم نرم می سوزم   بزن بہ تیغ و تغافل مزن کہ تابم نیست

---

(۱۴۵) گفتی آیم بہ عزمِ سوختنت   دیر کردی و انتظارم سوخت

---

(۱۵۲) آنجا کہ از لبِ تو سخن میگذشت دوش   در جوش بود نوش دے غلغلے نہ بود !

---

(۱۵۶) فصل گل است و در جہانگیر بادشاہ   امروز روز عشرت اگر نیست پس کیست

---

(۱۶۵) اے کاتبِ اعمال عمل نامۂ طالب   ہر نوع کہ خواہی رقمی کن قلم از تست

کجا بہشت کجا بزمِ بادہ ای زاہد   تو دل بجائے دگر بستہ و جا اینجاست
مرو بہ دیدنِ بلبل سوئے چمن طالب   بیا کہ بلبلِ مست غزل سرا اینجاست
درآ بہ ہند و ببیں رتبۂ سخا و سخن !   کہ منبعِ سخن و معدنِ سخا اینجاست
بہ ہند جوہر یابند قدرِ فضل شناس !   رواج گوہرِ دانش بہ مدعا اینجاست
تو فاضلی نظر از قبلۂ افاضل جوی !   پناہ فضل جہانگیر بادشاہ اینجاست

---

(۱۷۲) من خود از شوق ملاقات تو در پروازم   اے اجل این ہمہ تعجیل و تقاضائے تو چیست
کاش عمہائے تو از رخ بکشا نید نقاب   تا شود فاش کہ حالِ دلِ شیدائے تو چیست

---

(۱۸۰) گفتم چہ گناہ باعثِ بیزاری یار است   آزردہ دلی گفت کہ آزار دو گر ہیچ
طالب ز متاع دو جہاں حسرت یار است   حیفی کہ توان نبود بیاز ار و دگر ہیچ !

(۲۴۲) چوں بادہ نوش کنی در قدح مبین زنہار — مبادا چشم تو زہری بہ ساغر اندازد

(۳۲۱) اے غم بپادۂ نفس خویش را مسوز — آہستہ تر خرام کہ دوراست خانہ ام

(۳۲۲) بالا نرود گوشۂ ابروئے من از ضعف — مغرور نیم قوت تعظیم ندارم!

(۳۲۴) چوں بدین تن خاکی بہ زم از تپ عشق — زمانہ زلزلہ بر خلق فرض گردانم!

(۳۴۳) من اگر ساقی مجلس شوم از بہر شگون — اولین جام بآں نرگس مخمور دہم!

(۳۶۶) ز بوی زلف تو مستم بہار را چہ کنم! — ہلاک روئے توام لالہ زار را چہ کنم

(۳۶۷) گہے در گوشۂ میخانہ گاہے در چمن مستم — ندارم وضع ہشیاراں بسر مستم بتن مستم
ز ہوشم می برد عطر لباس او نمیدانم — کہ از بے ہوش دارد یا ز بوئے پیرہن مستم
عبیر و مشک را ایں پایہ بے ہوشی نمی باشد — منہ بر پیرہن تہمت کہ از عطر بدن مستم

(۳۸۵) چوں آدمی نبود ساقیا بہ عالم خاک — ببر بہ عالم آب ام کہ آدمی بینم

(۴۱۱) اے بوالہوس مگو کہ لذیذ است شہد عشق — من بارہا چشیدم و لذت نیافتم

(۴۵۴) در بزم شعلہ طاقت سیماب دیدۂ! — در سینہ ام قرار دل بے قرار بیں

(۴۷۸) فقیہ بے خود و واعظ خراب و مفتی مست — تو از کدام مسلمان تری کہ مست نۂ؟

---

(۵۳۵) ساقی مدار طبع مرا در خمارِ می — جامے بدہ کہ سوختم از انتظارِ مے
از بس قدح کشیدم و فیضے نیافتم — مے شرمسارِ من شد و من شرمسارِ مے
امروز دہ پیالہ کہ دارم دلے جوان — فردا چو پیر گشت نیاید بکار مے
روزِ ازل کہ چشمِ من و مے بہم نشاد — ہم مے شکارِ من شد و ہم من شکارِ مے

---

(۵۳۸) چندان منوش مے کہ شود بر تو مے سوار — چندان بنوش مے کہ تو باشی سوارِ مے

انتخاب از رباعیات

براؤن نے اپنی تیسری جلد میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ طالب کی کچھ رباعیات کو خیام کی رباعیات کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ ہمارے پاس رباعیات عمر خیام کا ایک طہرانی نسخہ پڑا ہے جس میں ساڑھے چار سو کے قریب رباعیات ہیں۔ اور طالب آملی کے اس دیوان میں رباعیات کا کل مجموعہ ۴۴۴ ہے۔ ان میں ایک رباعی بھی عمر خیام کے نسخہ میں موجود نہیں۔ ہم اپنے دیوان سے اب کچھ رباعیوں کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔

۵۶۳ من گفتم آخر ز کجا می آیم! — کاشفتہ چو طرۂ صبا می آیم
ما ناگہ بخواب دیدہ باشم خود را — خوش در نظرِ خود آشنا می آیم

---

(۵۶۴) من تازہ بہارِ بوستانِ سخنم — افروختہ شمعِ دودمانِ سخنم
عنقائے فصاحت آشیانِ سخنم — [illegible] گندہ جانِ تو کہ جانِ سخنم

۵۹۳ آن کیست شراب معرفت را ساقی — مسموماں را کردہ دمش تریاقی
زیں دست بزرگی بہ جہاں نیست مگر — فخر السادات میر عبد الباقی !!

(میر عبد الباقی کا ذکر نہ شبلی نے کیا ہے اور نہ ہی براؤن وغیرہ نے ۔ یہ رباعی محض اس لئے درج کر دی کہ طالب کے سلسلہ تعلقات کی ایک اور کڑی سامنے آجائے)

۶۰۰ در بزم جہانگیر شہ آن نور الٰہ ! — کردم ز دریچۂ ادب روش نگاہ !
در گوش صراحی مرصع گفتم ! — بزم افروزی تو لیکن از پرتو شاہ

---

۶۰۵ اے صبح تبسم ترا حلقہ بگوش — گوہر بلباس سخنت جلوہ فروش
خود گو کہ چگونہ سر نساید بسپہر — خورشید کہ با تو میرود دوش بدوش

---

۶۰۶ مندرجہ ذیل رباعی سے شاعر ہستی کے کلام کی بو آرہی ہے اس وقت ہستی کے کلام کا کوئی بھی نسخہ سامنے نہیں ورنہ مقابلہ کر کے دیکھ لیا ہوتا۔ بہر حال بخوبی یاد پڑتا ہے کہ ایک رباعی اس کی بھی بعینہ ہے قصاب اور فصاد کا ذکر اکثر اس کی رباعیات میں ملتا ہے! رباعی ملاحظہ کیجئے ع

فصاد بہ نشتر از رگت خون آورد — یا آب رخ بادۂ گلگون آورد !
در بحر گفت چو نیش غواصی کرد — گوہر بلباس لعل بیرون آورد

---

۶۲۹ اب آخری رباعی ہمارے انتخاب کی نقل کی جاتی ہے ع

ما عہد بہ زلف پر شکست تو کنیم — از زہد و ریا توبہ بدست تو کنیم
ہر صبح کنیم نیت روزہ و شام ! — افطار بزہر چشم مست تو کنیم

"ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات"

از

(مولانا ابو سلمہ شفیع احمد البہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

(۲)

بہر حال میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ موجودہ دور میں مستشرقین کا علوم اسلامیہ کے ساتھ شغف وانہماک اور ان کی خدمات کو کسی حال میں نہیں بھلایا جا سکتا۔ زندگی وقف کی، مال و دولت صرف کیا اور فن کی اہم اہم سیکڑوں کتابیں جس کا تصور بھی بعض وقت نہیں کیا جا سکتا تھا غایت صحت واہتمام کے ساتھ شائع کیا اور اہل علم تک پہنچایا۔ طبقات ابن سعد جیسی قدیم ومفید اور پُراز معلومات کتاب ہمارے ہاتھوں یورپ ہی کے ذریعہ اولاً پہنچی ہے (اس کتاب کے متعلق مولانا شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سیرۃ النبی کے مقدمہ میں دیکھا جاتے) لیکن ہمارے بعض روشن خیال علماء نے نہ صرف طبقات ابن سعد بلکہ مستشرقین کی شائع کردہ کتابوں کے متعلق اصولی سوال کھڑا کر دیا اور وہ یہ کہ

طبقات ابن سعد بہت مشہور اور بہت مقبول کتاب ہے صحابہ کے حالات میں اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ طبقات ابن سعد عرصہ سے مفقود تھی۔ مسلمانوں کے پاس اس کا مکمل نسخہ کہیں بھی موجود نہیں تھا۔ یورپ کے عیسائیوں نے اس کو چھپوایا ہے اور وہی میرے پیشِ نظر ہے مگر اس کی کوئی سند نہیں ہے کہ یہ نسخہ اصل تصنیف کے موافق ہے۔ وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور امہات المومنین کے متعلق بعض ایسی روایتیں اس میں موجود ہیں جن کا اسلامی تصنیفات میں باوجود تلاش کے مجھ کو پتہ نہ ملا۔ ابن سعد کی اکثر روایتوں کو متاخرین نے نقل کیا ہے مگر ان مہملات کو کسی نے نہیں لکھا میں یقین کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ یورپ کا الحاق ہے اس لئے کہ (طبقات ابن سعد) خود ایسی کتاب نہیں جس کی ساری روایتیں قابلِ قبول ہوں چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطے سے ملی ہے اس کے بھروسہ پر ابن سعد کا حوالہ بھی جائز نہیں ہو سکتا جب تک اس کی سند متداول

کتابوں سے نہ مل جائے۔ حدیث، تفسیر اور سیرۃ کی وہ کتابیں عیسائیوں نے چھاپی ہیں ان کتابوں کی بھی کوئی سند نہیں ہے اور نہ ان پر اعتماد ہے ان میں سے صرف وہی باتیں قابل قبول ہوں گی جن کی سند متداول کتابوں میں مل جائے۔

پھر حاشیہ میں فرماتے ہیں

تعجب یہ ہے کہ بعض علماء محمد بن اسحاق کو اس بناء پر مجروح قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے بعض یہود و نصاریٰ سے روایت لی ہے مگر خود اپنی تصنیف کا مدار عیسائیوں کی تصنیفات پر رکھتے ہیں یا ان کتابوں پر جو اگرچہ اندرونی کی تصنیفات ہیں مگر اس وقت وہ صرف عیسائیوں کے ذریعے سے ملی ہیں ان کتابوں میں بہت سی روایتیں متداول اسلامی کتابوں کے خلاف ہیں اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ روایتیں اصل کتاب کی ہیں یا الحاق ہیں۔

(اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری ص ۵)

بہرحال یہ اصولی سوال ہے اور علماء کرام کو سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا اور فیصلہ دینا ہے لیکن مستشرقین تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ؎

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بات کہاں کی کہاں جا پہنچی اور ناظرین "برہان" کی سمع خراشی ہوگئی جس کا مجھے افسوس ہے اب اصل مقصد کی طرف عود کرتا ہوں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد کی بعض حدیثی تصنیفات کا ذکر چھیڑتا ہوں۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ نواب صدیق حسن خاں[۲] و نیز مولانا عبدالحی[۳] فرنگی محلی وغیرہما کی تالیفات

---

[۱] نا ہموار روئے سخن علامہ شبلی نعمانی رح کی طرف ہے [۲] نواب صاحب بقول مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی ہندوستان کے ان عالموں میں ہیں جن کی کتابیں ہند کے سوا مصر و قسطنطنیہ میں بھی طبع ہوئی ہیں خدا نے ان کو ایک موقع دیا تھا جس سے علم دین کی خدمت میں انھوں نے پورا پورا نفع اٹھایا۔ اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی فن ہو جس میں نواب صاحب کی کتاب نہ ہو (نظام تعلیم و تربیت ص ۱۲) نواب صاحب کی کل تالیفات و تصنیفات ۲۲۲ ہیں اس کے لیے تذکرہ علمائے ہند، نیل الاوطار مصری۔ تراجم علمائے حدیث ہند و نیز مآثر صدیقی کی طرف رجوع کیا جائے۔ [۳] خود مولانا عبدالحی مرحوم کی پوری عمر ہی کیا ہوئی چالیس کے قریب میں انتقال

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کا شمار نہیں ہوگا۔ اور جیسا کہ کہیں اوپر عرض کیا کہ احادیث[1] کے ترجمہ کا کام بھی ہوا ہے اس لیے اس کو بھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ نیز آپس کے تنازع و مناقشات (حنفی وہابی) اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوگیا لیکن اس عرصہ میں ستر سے اوپر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں جن میں بعض کافی ضخیم ہیں بعض ہندوستان کے سوا مصر میں بھی طبع ہوئیں۔ اس وقت تک بیسیوں کتابیں نظامی نصاب میں آپ ہی کی کی داخل ہیں (نظام تعلیم و تربیت ص ۲۵) مولانا کی بعض اہم تالیفات یہ ہیں التعلیق الممجد علی الموطا محمد الفوائد البہیۃ فی طبقات الحنفیہ امام الکلام فی القراۃ خلف الامام ظفر الامانی السعی المشکور تذکرۃ الراشد تراجم علماء ہند ستاء وغیرہ

[1] مثلاً ترجمہ جامع ترمذی مولوی فضل احمد انصاری۔ شمیم الریاض ترجمہ شفاء قاضی عیاض۔ ترجمہ صحیح بخاری مرزا حیرت دہلوی۔ ترجمہ تیسیر الوصول الی جامع الرسول۔ ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح خیر الکلام ترجمہ قراۃ خلف الامام للبخاری کشف المغطا ترجمہ موطا و ترجمہ جامع ترمذی مترجمہ مولوی محمد بدیع الزماں مرحوم لکھنوی م ۱۳۰۴ھ و نیز قریب قریب تمام صحاح ستہ کا ترجمہ مولوی محمد وحید الزماں بن مسیح الزماں حیدرآبادی نے کیا ہے۔ خصائل النبی ترجمہ شمائل ترمذی مترجمہ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ۔ کشف الملہم ترجمہ مقدمہ صحیح مسلم مولوی عبد السلام بستوی۔ سلیقہ ترجمہ ادب المفرد للامام البخاریؒ۔ ترجمہ صحاح مولوی قاری عبد العزیز م ۱۹۲۳ء مولوی ابو یحییٰ خاں صاحب نے اسے شرح صحاح ستہ کہہ کر بیان کیا ہے۔ غالباً ترجمہ کے قسم کی چیز ہوگی۔ اسی لئے میں نے یہاں لکھا غرضیکہ بہت ساری کتابیں ہیں جن کا ترجمہ ہوا ہے۔ نمونۃً چند کتابوں کا نام دے دیا گیا ہے۔

[2] مثلاً امکانات المعتدی فی قرأۃ المقتدی للشبلی نعمانی۔ عدد رکعات تراویح۔ قراۃ خلف الامام حضرۃ مولانا گنگوہیؒ الدلیل القوی در مسئلہ قرأۃ خلف الامام مولانا احمد علی سہارنپوریؒ۔ ارشاد الامام فی فرضیۃ الفاتحۃ خلف الامام۔ تبصرۃ الامام فی فرضیۃ الحجیۃ و الفاتحۃ خلف الامام حافظ عبد الجبار عمرپوری م ۱۳۳۴ھ البرہان العجاب فی فرضیۃ ام الکتاب مولانا بشیر احمد سہسوانی۔ کشف الحجاب عمانی البرہان العجاب یہ اسی کا ترجمہ ہے۔ حل مشکلات البخاری مولانا ابو القاسم سیف بنارسی یہ اصل میں مولانا عمر کریم الحنفی کے الجرح علی البخاری کا جواب ہے فاتحۃ الصواب فی قراۃ فاتحۃ الکتاب اور اسی کا خلاصہ زبدۃ الالباب (اردو) مولانا سید جلال الدین احمد جعفری ہاشمی م ۱۸۶۳ء جوابات سوالات نسخ یہ مولوی شیخ محمد مچھلی شہری کے ۹ سوالوں کا جواب ہے قلتین اور ماء کثیر کی لطیف بحث ہے۔ مولانا سخاوت علی جونپوری م ۱۲۷۴ھ خیر الماعون مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی۔

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

قادیانی فتنہ کے سلسلہ میں بعض رسائل تالیف ہوئے جو ہمارے دائرہ کے اندر ہیں مگر اسے بھی نظر انداز کر رہا ہوں اور چونکہ مضمون کافی طویل ہو گیا ہے اور مصنفین و مؤلفین کی اکثریت سے ناظرین واقف ہیں اس لئے ان بزرگوں کے تراجم بھی نہیں دئے جائیں گے الا ماشاء اللہ و قلیل ما ھم - اور کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار تو موضوع ہی سے خارج ہے - ممکن ہے کہیں فرطِ انبساط و جوشِ مسرت میں کسی کتاب کے متعلق کچھ جملے نکل جائیں تو معذور سمجھا جاؤں -

ہاں سیرۃ کا معاملہ تو رہا ہی جاتا ہے اس کے متعلق بھی دو تین جملے گذارش کرتے ہیں، اس موضوع پر اس کثرت سے کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ اگر کسی دوسرے موضوع پر اس کا عشر عشیر بھی لکھا جاتا تو اس میں کوئی نیا پہلو پیش کرنا مشکل تھا لیکن ع نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں - اس لئے اس کا احاطہ مجھ جیسے سے ناممکن ہے اور عنوان ہی کو حذف کر دیا ہے - البتہ چند کتابیں تبرکاً اپنے ذوق کے اعتبار سے جو مجھے پسند ہیں پیش کرتا ہوں -

(۱) سیرۃ النبی - شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی -

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ اصل میں مولوی محمد سلیم بہریاوی م ۱۹۰۶ء کے خیال کی تردید ہے کیونکہ مولوی صاحب موصوف کہتے تھے کہ حدیث واذا وقع بارض وانتم فیھا فلا تخرجوا فرارا منھا میں جو ارض کا لفظ ہے اس سے مراد اقلیم ہے نہ کہ وہ بستی جس میں طاعون ہے اور ہر وقت اس مسئلہ پر بحث کے لئے آمادہ رہتے اسی کی تردید میں مولانا مبارک پوری نے یہ رسالہ لکھا جس کا جواب مولوی صاحب نے بھی دیا مگر عبداللہ مقری کے نام سے شائع کرایا واللہ اعلم (تراجم علمائے حدیث ہند) تحقیق الکلام فی وجوب القراۃ خلف الامام تحفۃ الصواب فی قراۃ فاتحۃ الکتاب مولانا جلال الدین احمد بہاری - جواز قراۃ فاتحہ خلف الامام مولانا حسین احمد ملیح آبادی م ۱۲۷۵ھ - فتح المبین (فارسی) مولوی حیدر علی رامپوری آمین رفع یدین مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری - ہدایۃ المعتدی فی القراۃ للمقتدی مولانا عبد العزیز رحیم آبادی خیر الکلام فی فرضیۃ الفاتحہ خلف الامام - اتباع سید الانام فی عدم وجوب القراۃ خلف الامام اور احسن القری حضرت مولانا شیخ الہندؒ اور اس کا جواب سرمن یری - اس کے علاوہ بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں کہاں تک لکھا جائے - لیکن بعض چیزیں فنی اعتبار سے بہت اہم اور ان کی حیثیت شاہکار کی ہے جیسے کشف الستر عن صلوۃ الوتر نیل الفرقدین مولانا انور شاہ کشمیریؒ وغیرہا حاشیہ صحیح بخاری ضمنیات التصریح بما تواتر عن نزول المسیح حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیریؒ

(۲) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب — حکیم الامت مولٰنا تھانوی رح

(۳) رحمۃ للعالمین — قاضی سلیمان صاحب منصورپوری

(۴) النبی الخاتم — مولٰنا مناظر احسن صاحب گیلانی

(۵) مردوں کی مسیحائی — مولٰنا عبدالماجد دریابادی

(۶) اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم صرف ج اول مطبوع ہے۔ مولٰنا ابو البرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری مرحوم

(۷) خطبات مدراس — سید سلیمان ندوی

(۸) قصیدہ عظمی — مولوی امین اللہ نگر نہسوی بہاری مرحوم۔ یہ قصیدہ ایک ہزار آٹھ سو اسی اشعار پر مشتمل ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی — چہ دلبر اند کہ دل می برند بہ پنہانی[1]

---

[1] بعد کے اشعار ملاحظہ ہوں

ہفت پردہ درخشاں چو دیدہ ہائے نجوم — بنور حق ہمہ بر ہفت کردہ پیشانی!

بصورت ہمہ آیات صنع یزداں ہست — بمعنی ہمہ تصدیق ہائے ایمانی

بدو دہاں قدم جملہ ثابت التنسیب اند — بہ پاکی و امنی از اہتمام حسن ثانی

بتعلیم آنکہ ز بالائے عرش می نازند — گرفتہ تربیت اندر کنار ربانی!

چنیں جمال نخیزد میاں انس و ملک — نہ در میان پریزادگان و خوبانی!

یکان دو کان ہمہ یکجا بجلوہ و فروزی — چو نجمہائے ثواقب برجم شیطانی

حلیہ مبارک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

بگفت ہست درخشندہ روئے نیکو خوئے — تمام تر بہ جمال و کمال انسانی

برنگ سرخ و سفید و بآب و تاب ملیح — بہ چہرہ بدر منیر و کشادہ پیشانی

سرش بزرگ و کشیدہ سیاہ گیسو — قدش بلند و تن و شکم بہ یکسانی

میاں صاحب دہلوی مرحوم ۱۳۰۲ھ کو یہ قصیدہ پورا یاد تھا۔ درسِ حدیث کے وقت مناسب حال پڑھا کرتے تھے حدیث افک میں کنٹھے کے گم ہونے پر یہ شعر پڑھتے تھے

کز نظم آں ہمہ اندیشۂ یمانی بود	جواہرے کہ بود نام آں سلیمانی[۱]

اب ناظرین اور اصل موضوع کے درمیان میں زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا۔ علیحدہ ہو رہا ہوں اور ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی قسم شروح و متعلقاتِ بخاری پر، کتابیں (۱) فیض الباری شرح صحیح بخاری املائی (عربی) ۴ جلد مطبوعہ مصر۔ مرتبہ مولانا محمد بدرِ عالم۔ مولفہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ۔ یہ وہ مقدس کتاب ہے جس کی ہر سطر بلکہ ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ع وانی لآتٍ بما لم تستطعہ الاوائل۔

فتح الباری کے بعد شوافع نے بھڑک کر کہنا شروع کیا تھا کہ لا ھجرۃ بعد الفتح[۲]، لا ھجرۃ بعد الفتح، لیکن فیض الباری کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ زبان پر فوق کل ذی علم علیم آجاتا ہے۔

(۲) حاشیہ صحیح بخاری۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ م ۱۲۹۷ھ گویا مختصر اور جامع پُر مغز شرح ہے ۱۴ سال کی مسلسل جانفشانی و جانکاہی سے مرتب ہوا ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے بھی اپنے شیخ کے ایما سے پانچ اجزا کی تکمیل فرمائی۔ کچھ لوگ معترض بھی ہوئے مگر جب مولانا احمد علیؒ نے ان کے کام کو آشکارا فرمایا تو خاموش ہو گئے۔

بقیہ حاشیہ ص ۱۷۴:۔

دو ابروانش دراز و دقیق و پیوستہ	فراخ چشم و بانبوہ موی مژگانی!
بسی صفاست سواد و بیاض چشمش را	شظیطہا بہ سپیدیش احمر قانی
نکردہ سرمہ و چشمانش سرمہ آگیں بود	چو نیز راست نمایاں فزہ سبطلانی
دراز بینی و باریک و درمیان حسنم او	دو استخوان خد شش با عذارہ یکسانی

(مولانا عبد الرحمٰن جامی)

[۱] ... ۵۲ یہ ایک حدیث ہے جس کی تلمیح کی گئی ہے۔

(۳) شرح تراجم ابواب بخاری۔ حضرت شیخ الہندؒ م ۱۳۳۹ھ

(۴) عظمت وحی۔ شرح حدیث بدء الوحی۔ حضرت شیخ الہندؒ

(۵) شرح ثلاثیات بخاری۔ مولانا ملتانی۔

(۶) الدراری النا شرات فی ترجمہ مانی البخاری من الثلاثیات۔ قاضی شیخ محمد مچھلی شہری م ۱۹۰۲ء

(۷) تخریج آیات۔ آیات مندرجہ صحیح بخاری کی جمع و تدوین۔ مولانا ابو سعید شرف الدین صاحب

دوسری قسم شروح و متعلقات مسلم پر ۳ کتابیں

(۱) النجم الوہاج فی شرح مقدمہ صحیح مسلم بن الحجاج[1]۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی

(۲) شرح مقدمہ صحیح مسلم (عربی) حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری م ۱۹۱۸ء

(۳) فتح الملہم شرح صحیح مسلم، ۳ جلد۔ ناقص۔ ج ۱ کتاب الایمان کتاب الطہارۃ والحیض ج ۲ کتاب الصلوٰۃ تا کتاب الجنائز۔ ج ۳ کتاب الزکوٰۃ۔ الصیام معہ الاعتکاف، الحج والنکاح پر مشتمل ہے۔ ۱۰۰ صفحات کا بڑی تقطیع پر مقدمہ ہے۔ مقدمہ عالمانہ بلکہ مجتہدانہ اور بالکل نرالا ہے۔ نواب نظام الدولہ میر عثمان علی خاں والئی دکن کے نام اہداء کیا گیا ہے۔

یہ اس شخص کے رشحات قلم اور فیوض و برکات میں سے ہے جو نہ صرف میدانِ علم کا شہسوار ہے بلکہ سیاست و تدبر میں بھی بے مثیل ملکی و ملی تمام گتھیوں کو ناخنِ تدبیر سے سلجھانے والا یعنی حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ بعد از تقسیم پاکستان ہی کے ہو رہے اور ملک و ملت

بقیہ حاشیہ صہ ۱۴۴

خدا پناہ دہر در غضب اگر آید | شود سطبر رگ ابرو چہرہ زرانی
دہن فراخ کہ در غرف عرب ممدوح است | لبان او ہمہ رنگین برنگ مرجانی
کلاں چو دانہ در سمین دندانش | کشادہ گاہ تبسم چو برق تابانی

[1] مولانا اور ان کے کتب خانہ پر راقم کا ایک مضمون برہان میں آچکا ہے اس لئے میں مولانا کی تصنیفات کے متعلق تفصیلی گفتگو نہ کروں گا۔

کے لیے مفید وعظیم الشان خدمات انجام دیں ۔ اپنے اثر ورسوخ اور حکمتِ عملی سے پاکستان دستورساز اسمبلی سے قرار داد مقاصد پاس کرا کر ایک طرف اپنے تدبر کا ثبوت و نیز پاکستان کے لئے سارے عالمِ اسلام کی اخلاقی ہمدردی حاصل کر لی تو دوسری جانب پبلک وحکومت کے مابین جو اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی اس کو ختم کر دیا ۔ مولانا مودودی کو کمیونزم کے لئے اللہ کی ننگی تلوار فرماتے ہندوستان کا ایک گوشہ مدت سے چیخ چیخ کر اور گلے پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا تھا علماء نہ لکھنا جانیں اور نہ بولنا مولانا اس کی عملی تردید تھے ۔ مجامع ومحافل میں کھڑے ہوئے ۔ گرچہ ماحول سخت مخالف ہو ۔ من موہ لیبا ریاض کے علماء کی مجلس میں جب مولانا کا ذکر آیا تو

> شیخ بولے ان کی شرح مسلم میں نے دیکھی ہے ۔ انھوں نے سلطان (ابن سعود) کو بھیجی تھی اس سے وہ کٹر حنفی اور اشعری معلوم ہوتے ہیں ۔ احادیث نزول کی عجیب غریب تاویل کی ہے مگر اندازِ بیان سے علم کی بو باس معلوم ہوتی ہے[۵۱] ۔

خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں ۔:

(۱) ایمانیات میں جو مسائل اہل السنۃ والجماعت کے درمیان اختلافی سمجھے گئے ہیں ان کی

بقیہ حاشیہ ص ۴۵

ہم او نسیم و بسیم و سیم در خوبی — ہم او فصیح و بلیغ و بدیع بینائی

بر از وقار نماید اگر خمش ماند — بہ از بہا سخن گر کند در افشانی

ندید چشم ہنر بین چو او بخوش خوئی — ممیز است بحقیت او ز بطلانی

شنیدہ ایں ہمہ اوصاف گفت ابو سعید — بحق کہ اوست نبی قریش افغانی

جنگ حنین

کنوں شنو کہ حدیث حنین می گوئیم — کہ اوست جنگ ہوازن بحرف انسانی

[۵۱] دیار عرب میں چند ماہ ص ۲۰۷ ۔

مستوعب تحقیق اور ایسی نقول پیش کرنا جو بجز امکان اختلاف کو کم کرنے والی ہوں۔

(۲) رواۃ کے تراجم میں ان کے ممتاز اور اہم احوال کا تذکرہ غیر معروف اسماء کا ضبط بقدر ضرورت وکفایت جرح وتعدیل۔

(۳) اسنادی مباحث خاص خاص مواضع میں جہاں کوئی اشکال یا خلجان تھا۔

(۴) الفاظ حدیث کا حل۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶)

شنیدہ ام پئے این جنگ آنچنان تمہید — کہ فتح مکہ نبی کرد چون ز آسانی

کثیر اہل عرب آمدند در اسلام! — مگر ثقیف وہوازن براہ طغیانی

ہم شدہ شرفائے دو قوم رای زدند — شدا ز غبار حسد راہ صلح پنہانی

فساد عزم از آن رای یافتہ تصمیم — بنا ر جنگ ازین کرد یافت اتفاقی

بحکم مالک بن عوف نصری آوردند — عوام ہم سرخود را بطوع فرمانی

شدند مجتمع اندر حنین ہر دو گروہ — نمود جہت پئے جنگ سازوسامانی

بنی ششنبہ و ششم روز از مہ شوال — روانہ شد بدو از دہ ہزار شجعانی

دران میان ہمہ ہشتاد مشرکان قریش — بدند ہمرہ سرور برسم اعوانی!

مرض وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

بچار شنبہ ای از عشرۂ اخیر صفر! — ز سال یازدہم موسم زمستانی

ز درد سر مرض الموت ابتدا کردش — بعارض تپ مطبق کہ داشت پنہانی

بہ ازدیاد مرض اشتداد ہمی شد! — کہ ز احتراق ہمی کرد آب پاشانی!

بانتہا شدہ غشی وافاقہ مستبدل — روارۂ مرض آورد سوز ہجرانی

در ابتداء مرض روز جمعہ بر منبر — ستادہ سرور دین زد مثل باعلائی

(۵) جس فن کا مسئلہ ہو اس فن کی مشہور اور معرکتہ الآراء کتابوں کے اقتباس پیش کیے گئے ہیں تاکہ مسئلہ کے سب اطراف و جوانب پوری طرح واضح ہو جائیں اور دلائل بھی اسی قدر سامنے آجائیں کہ ایک طالب علم کو اس مسئلہ کے لیے دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی چنداں ضرورت نہ رہے اور مسئلہ کی پوری منقح صورت روشن ہو جائے، اس بارہ میں صرف شروحِ حدیث کے اقتباسات پر قناعت نہیں کی چنانچہ بعض مواضع میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مسئلہ کی بہت زیادہ مکمل تحقیق کسی ایسی کتاب میں مل گئی جہاں بالکل وہم و گمان بھی نہ تھا۔

(۶) اسرارِ شریعت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ، امام غزالیؒ اور شیخ اکبر وغیرہم کی تصانیف ان سے بھی موقع بموقع پورا استفادہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اعلیٰ مضامین اور عمیق حقائق و اسرار بھی حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کے مطالعہ سے گذر جائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴)

کہ دادہ است خدا اختیار بندہ را	میان دنیا و خود تا کرا است خواہانی
دلے گزید لقائے خدائے را بندہ	طمع بہ برید ز دنیائے باطلِ فانی
شنیدہ حضرت صدیق زار زار گریست	کہ کشف شد قبلش از طریقِ وجدانی
بگفت جان من و جانِ مادر و پدرم	بود نثار تو کاش اے رسولِ حقانی

یہ مولانا امین اللہؒ ابن سلیم الدین علیم اسرائیل انصاری ابو الدرداؒ نگر نہسوی عظیم آبادی) حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تلامذہ سے ہیں ادب و بلاغت کے امام سمجھے جاتے تھے۔ مدتہائے دراز تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مسندِ درس پر جلوہ افروز رہے اور متفیدین و متفیضین کی تشنگی کو بجھاتے رہے۔ تصانیف میں سے ایک تو یہی قصیدہ عظمیٰ ہے و نیز حاشیہ بر میرزاہد رسالہ و میرزاہد شرح مواقف و حاشیہ مسلم الثبوت۔ رسالہ در بیان

باقی حاشیہ صفحہ ۹۹

(۷) فتح الباری وغیرہ کے مختلف ابواب میں ایک ہی موضوع کے متعلق جو تحقیقات بکھری ہوئی تھی ان کو یکجا کیا گیا ہے۔

(۸) حنفیہ کے مسائل کی تحقیق وتشریح اور اثبات وایضاح کے لئے فقہ حنفی اور حنفیہ کے شرح وحواشی کے ضروری اقتباس پیش کئے گئے ہیں۔

(۹) اپنے اساتذہ واکابر کی وہ تحقیقات جو زبانی نقل ہوتی چلی آرہی تھی یا کسی کتاب میں مندرج تھی جس کی طرف قارئین حدیث کا ذہن منتقل نہ ہو سکتا تھا یا عربی کے سوا دوسری زبان میں تھی اس کو کافی بسط وایضاح کے ساتھ شرح میں درج کیا گیا ہے۔

(۱۰) بہت سی ایسی تحقیقات جو اس سے پہلے مسموع نہ ہوئی ہوں گی جن کی قدر وقیمت انشاء اللہ مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکے گی اور جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ خداوند قدوس کا انعام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض کسی وقت بھی منقطع نہیں ہے۔

(۱۱) تا بحدِ امکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ جس مسئلہ پر کچھ لکھا جائے وہ محض جدل اور احتمال آفرینی کے طور پر نہ ہو بلکہ ایسی چیز ہو جس کو وجدان قبول کرے اور ذوقِ سلیم رد نہ کرے

(۱۲) مؤلف نے جہاں کہیں اپنی عبارت "قلت" "قال العبد الضعیف" وغیرہ عنوان سے لکھی ہے پوری کوشش کی ہے کہ عبارت سلیس اور صاف ہو اور تفہیم میں کوئی گنجلک نہ رہے۔

(۱۳) وہ روایات جن میں بظاہر اختلاف خواہ وہ مذہب سے متعلق نہ ہوں ہر موقع پر بے انتہا کوشش کی گئی ہے کہ خود روایات ہی کے ذریعہ ان میں تطبیق دیجائے یا ہر ایک کا جداگانہ منشا بیان کیا جائے تاکہ تعارض کا شبہ نہ

بقیہ حاشیہ ص ۴۸ :۔ فصاحت آیۃ کریمہ ولکم فی القصاص حیوۃ الخ دیوان فارسی وغیرہا ہیں آپ کے بعض قصائد حدیقۃ الارواح میں بھی موجود ہیں کلکتہ میں ۱۲۳۳ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(۱۴) اپنے مقدور کے موافق بہت جگہ سعی کی گئی ہے کہ احادیث کے ماخذ قرآن کریم میں دکھلائے جائیں۔

(۱۵) حنفیہ کے اور دوسرے مذاہب کے دلائل کی کافی تنقیح کی گئی ہے اور پوری فراخ دلی سے ہر مذہب کے ادلہ اور وجوہ ترجیح کا بیان ہوا ہے۔

(۱۶) جو مسائل مہمہ یا ان کے دلائل بنظرِ اختصار ترک کر دئے ہیں ان کے متعلق ان کے مظان کے حوالے دئے گئے ہیں تاکہ طالب بہ سہولت ان کی تحقیق کر سکے۔

(۱۷) جدید شبہات کے ازالہ کی طرف بھی موقع بموقع توجہ کی گئی ہے۔

(۱۸) کتاب کی غیر معمولی خصوصیتوں کو دیکھ کر علمائے استنبول نے اس پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

تیسری قسم شروح ترمذی و متعلقات پر ۱۹ کتابیں

(۱) الکوکب الدری ۲ جلد۔ مرتبہ مولانا شیخ محمد یحییٰ کاندھلوی م ۱۳۳۴ھ یہ دراصل حضرت گنگوہیؒ م ۱۳۲۳ھ کی تقریر ہے۔

(۲) حاشیہ الکوکب الدری۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مظاہر العلوم سہارنپور۔

(۳) النفخ الشذی (اردو) یہ بھی حضرت گنگوہیؒ کی تقریر ہے۔

(۴) العرف الشذی ۲ جلد، املائی شرح حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ لطائف و معانی کا سمندر ہے۔ مرتبہ مولوی محمد چراغ صاحب

(۵) الطیب الشذی۔ مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی

(۶) ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی۔ مولانا شمس الحق صاحب ڈیانواں۔ بہار

(۷) نزل الثوی۔ صرف ایک جلد طبع ہوئی۔ طلبہ کے لئے حنفی نقطۂ نظر سے مختلف قسم کے سوالات اور ان کے جوابات لکھے ہیں۔ مولفہ الحاج مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ

دوسری جلد کا مکمل مسودہ ان کے خویش مولوی اصغر حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ مسلم بیک ورڈ ویلفیر ڈیپارٹمنٹ صوبہ بہار کے پاس موجود ہے کاش طبع ہو جائے۔

(۸) جواہر زمردی۔ ترجمہ نزل الثوی۔ مترجمہ الحاج مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم۔

(۹) الثواب الجلی۔ حکیم الامت مولانا تھانوی ؒ

(۱۰) المسک الذکی۔ غیر مطبوعہ۔ حکیم الامت مولانا تھانوی۔

(۱۱) تحفۃ الاحوذی ۴ جلد۔ مولانا عبدالرحمان صاحب مبارک پوری ؒ

خصائص حسب ذیل ہیں۔

(۱) جامع ترمذی کے تمام راویوں کا ترجمہ بقدر ضرورت لکھا گیا ہے اور مقدمہ شرح میں تمام راویوں کی فہرست بترتیب حروف تہجی دیدی گئی ہے اور جس راوی کا ترجمہ شرح کے جس صفحہ میں مذکور ہے اس کا نشان دیدیا گیا ہے۔

(۲) جامع ترمذی کی تمام حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے یعنی اس کتاب کی حدیثوں کو امام ترمذی کے علاوہ اور جن محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کی ہے۔ ان کا اور ان کی کتابوں کا نام بتا دیا گیا ہے

(۳) امام ترمذیؒ نے وفی الباب کے عنوان سے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی مفصل تخریج کی گئی ہے اور ان احادیث کے الفاظ بھی اکثر مقامات میں نقل کئے گئے ہیں احادیث مشار الیہا کے علاوہ اور دیگر احادیث کی تخریج کا بھی جابجا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۴) تصحیح وتحسین احادیث میں امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے اس لئے ہر حدیث کی تصحیح و تحسین کے متعلق دیگر ائمہ فنِ حدیث کے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں اور جن احادیث کی تصحیح وتحسین میں امام ترمذی سے تساہل ہوا ہے اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔

(۵) اسنادی ومتنی اشکالات کے حل و ایضاح میں خاص طور پہ توجہ کی گئی ہے۔

(۶) احادیث کی توضیح وتشریح میں بہت کچھ تحقیق سے کام لیا گیا ہے اور جن مقلدین جامدین اور جن اہل ہوانے احادیث نبویہ کو اپنے مذہب ومسلک پر منطبق کرنے کے لئے غلط اور بیجا تاویلیں وتقریریں کی ہیں ان کی تمام تاویلات وتقریرات کی کافی تغلیط وتردید کی گئی ہے اور احادیث کے صحیح مطالب ومضامین جو سلف صالحین رضی اللہ عنہم اور فقہائے محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک معتمد ومستند ہیں بیان کئے گئے ہیں۔

(۷) اختلاف مذاہب کے بیان میں ہر مذہب کے دلائل بیان کر کے مذہب حق وارجح کو ظاہر کر دیا گیا ہے اور اس کی نصرت و تائید کی گئی ہے اور مذاہب غیر صحیحہ و مرجوحہ کے دلائل کے شافی جواب دیئے گئے۔

(۸) اندنوں جامع ترمذی کی دو شرحیں ایک العرف الشذی اور دوسری الطیب الشذی شائع ہوئی ہیں و نیز ابوداؤد کی ایک تازی شرح بذل المجہود نکلی ہے آپ تحفۃ الاحوذی میں ان شروح پر بہت لطیف تنقید پائیں گے، کتاب آثار السنن مصنفہ مولوی شوق مرحوم کی بھی قابل دید تنقید آپ کو ملے گی انتہی بلفظہ مقدمہ علیحدہ سے ایک جلد میں ہے جو کافی لبسیط ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ابکار المنن ہے جو آثار السنن کا جواب ہے۔

(۱۲) حاشیہ ترمذی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳) حاشیہ ترمذی مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری

(۱۴) شرح شمائل ترمذی شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی۔ بے حد مقبول کتاب ہے ترجمہ کے ساتھ احادیث کے مختلف قسم کے مفید معلومات بھی ہیں اور مشکلات کا حل بھی

(۱۵) تقریر ترمذی میاں صاحب مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ۔ مرتبہ مولوی اختر حسین صاحب

(۱۶) حاشیہ ترمذی مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ مدرس دار العلوم دیوبند

(۱۷) تقریر ترمذی ا جلد حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہ۔ مرتبہ خلیلی صاحب اسلام آبادی (چاٹگامی)

(۱۸) تقریر ترمذی مولانا گنگوہیؒ مرتبہ مولانا عماد الدین شیرکوٹی

(۱۹) ترجمہ شمائل ترمذی مؤلفہ مولانا کرامت اللہ صاحب جونپوری م ۱۲۹۰ھ

چوتھی قسم شروح ابوداؤد و متعلقات پر ۹ کتابیں

(۱) التعلیق المحمود مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی

(۲) حاشیہ ابوداؤد غیر مطبوعہ حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

(۳) التعلیقات علی سنن ابی داؤد مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء م ۱۹۲۳ء

(۴) انوار المحمود - ۲ جلد تقریر حضرت شیخ الہند مرتبہ مولوی محمد صدیق صاحب نجیب آبادی

(۵) شرح ابی داؤد املائی ۲ جلد حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری

(۶) عون الودود فی شرح ابی داؤد مولوی محمد صاحب مدراسی

(۷) عون المعبود ۴ جلد مولانا شمس الحق ڈیانوی رحمۃ اللہ علیہ

(۸) غایۃ المقصود - ناقص

(۹) شرح ابی داؤد نامکمل. مولانا رفیع الدین صاحب شکرانوی بہاری ۱۹۲۰ء

(۱۰) شرح ابی داؤد. شوق نیموی۔

حکیم کبیر الدین صاحب نے انجمن اطبائے بہار شریف کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۴، ۵، اپریل ۵۳ء کے خطبۂ صدارت کی فہرست میں اس شرح کا ذکر فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب

(۱۱) بذل المجہود - حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ ۵ ضخیم جلدوں میں ہے ۱۳۳۵ھ میں تالیف شروع ہوئی اور شعبان ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں تمام ہوئی - اس خوشی میں مدینہ منورہ کے اعیان وعلماء کو دعوت دی گئی اور ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو خود جوار رحمت الٰہی میں جا پہونچے بقیع الفرقد میں قبور اہل بیت کے قریب دفن ہوئے۔

مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۱) مجتہدین خصوصاً ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تفصیل

(۲) متقدمین شراح ابی داؤد کے تسامح کی نشاندہی

(۳) بعض مطالب مہمہ کا حسب اقتضا اعادہ

(۴) ترجمۃ الباب کے مطابق حدیث کی مناسبت کو ظاہر کرنا

(۵) کوئی بات اس وقت تک نہیں لکھی گئی جب تک متقدمین کے کلام میں اس کی تائید نہ مل گئی ہو

(۶) مذہب حنفی کی پوری تحقیق اور کافی دلائل بیان کئے گئے اور دوسرے مذاہب کے

دلائل کا جواب بھی نہایت تحقیق سے دیا گیا ہے۔

(۷) ہر راوی کے متعلق پوری جرح و تعدیل صناعتِ حدیث کے موافق کی گئی۔

(۸) جو روایات ابوداؤد میں مرسل یا معلق تھیں ان کا دوسری کتابوں سے متصل ہونا ظاہر کیا گیا۔

(۹) جو روایات ابوداؤد میں مختصر تھیں ان کو دوسری کتابوں سے جہاں مفصل ہیں مکمل طور سے بیان کیا گیا یا حوالہ دیدیا گیا۔

(۱۰) حدیث رسولؐ کا منشا ظاہر کر کے وہ محاسن و حقائق بیان کئے گئے جن کا حظ فن داں محدث ہی اٹھا سکتا ہے

(۱۱) بعض مقامات کو حضرت نے اول اپنی فہم کے مطابق املا کرایا پھر خواب میں تنبیہ ہوئی کہ فلاں مضمون کو اس طرح نہیں بلکہ اس طرح لکھنا چاہیئے، بیدار ہو کر کتابوں سے مراجعت کی گئی تو معلوم ہوا کہ خواب صحیح تھا پھر اس مقام کو صحیح طور سے لکھا گیا۔

پانچویں قسم سنن نسائی کے شروح و متعلقات پر ۳ کتابیں | (۱) حاشیہ سنن نسائی مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ مطبوعہ مطبع مجتبائی۔ اس میں زیادہ تر حضرت شاہ اسحاقؒ صاحب کی تحقیقات درج ہیں۔

(۲) حاشیہ سنن نسائی۔ مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی

(۳) التعلیقات السلفیہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی مطبوعہ انصاری پریس دہلی ۱۸۹۸ء

چھٹی قسم شروح ابن ماجہ و متعلقات پر ۳ کتابیں | (۱) حاشیہ ابن ماجہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ

(۲) شرح ابن ماجہ مولانا ابوسعید شرف الدین صاحب صرف چند اجزا ہیں مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اسے دیکھ کر پسند فرمایا تھا

(۳) شرح ابن ماجہ۔ مولوی عبدالسلام صاحب بستوی۔ طباعت کے لئے مصر گئی تھی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرتِ قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از

(سعید احمد)

(۴)

خوش قسمتی سے ہمارے فاضل دوست حدیث اور اس کی حجیت کے منکر نہیں ہیں، چنانچہ منکرین حدیث سے متعلق لکھتے ہیں:-

"بعض کمزور روایتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت تمام حدیثوں کے ماننے سے انکار کرتی ہے۔ لیکن ان کا یہ رویہ محض ناواقفیت اور کم علمی کی وجہ سے ہے۔ اگر اسی طرح بغیر جانچ پڑتال کے کل تاریخ انسانی کا انکار کر دیا جائے تو سراسر نادانی ہے عقل و کتاب اللہ کے معیار پر ہر مقدس کتاب اور ہر حدیث نبوی کو جانچنے کے بعد ہی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی حقیقی تعلیم کیا ہے" (ص ۲۴)

اس بنا پر ہم نے جو کچھ قرآن مجید سے ثابت کیا ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام منحصر ہوگیا ہے صرف آپ کے منہاج و شریعت کے اتباع میں اور توراۃ و انجیل یا کسی اور آسمانی کتاب پر بھی عمل کرنا ہرگز اسلام نہیں ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں چند احادیث بھی پیش کر دیں تاکہ قارئین کرام کو صاف معلوم ہو جائے کہ اس معاملہ میں قرآن و حدیث میں کوئی گنجلک اور کسی قسم کا کوئی ابہام و خفا یا اختلاف و تضاد نہیں ہے یہ واضح رہنا چاہیئے کہ اس باب میں ہم نے صرف صحیح بخاری کی طرف مراجعت کی ہے اور ذیل میں جتنی احادیث درج ہیں وہ سب اسی اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کی ہیں۔

(۱) عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان (کتاب الایمان)

ابن عمرؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے ایک اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں دوسرے نماز ادا کرنا تیسرے زکوٰۃ دینا چوتھے حج کرنا اور پانچویں رمضان کے روزے رکھنا۔

(۲) حضرت طلحہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک پراگندہ مو نجدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم بھن بھن اس کی آواز سنتے تھے (نسمع دوی صوتہ) مگر سمجھتے نہیں تھے کہ کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ قریب آیا اب جو ہم سنتے ہیں تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہا تھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "دن اور رات میں پانچ نمازیں۔ اس نے پھر پوچھا کہ بس ان کے سوا تو میرے اوپر کوئی اور فرض نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا "اور رمضان کے روزے اس شخص نے پھر وہی سوال دہرایا تو اس مرتبہ آپ نے فرمایا اور ہاں زکوٰۃ (کتاب الایمان)

(۳) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا اور پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور فرشتوں اور اللہ سے ملنے اور اس کے پیغمبروں اور یوم حشر کی دل سے تصدیق کرے۔ اب اس شخص نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا "اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی بندگی کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور یہ کہ تو نماز ادا کرے فرض زکوٰۃ دے اور یہ کہ رمضان کے روزے رکھے" (کتاب الایمان)

(۴) حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عبدالقیس کے قبیلۂ ربیعہ کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ایمان باللہ یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو"

ان احادیث میں دو باتیں خاص طور پر غور طلب ہیں ایک یہ کہ ان میں اور ان کے علاوہ بعض اور

احادیث ہیں اور خود قرآن میں بھی ایمان اور اسلام کو دو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ مذکور ہے کہ اسلام نام فقط نماز روزہ۔ زکوٰۃ اور حج کا نہیں ہے بلکہ عبادات کے ساتھ ساتھ تمام اخلاق و معاملات پر بھی وہ حاوی ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بہتر ین اسلام کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا "وہ یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور جن کو تم جانتے ہو یا نہ جانتے ہو ان کو سلام کرو۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک اور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں اسی مضمون کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ سے ہے اور اس میں یہ ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ کون سا اسلام افضل ہے؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ "من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ" اب سوال یہ ہے کہ جب اسلام عبادات کے ساتھ ساتھ تمام اخلاق و معاملات پر بھی حاوی ہے اور ان سب کے مجموعہ ہی کا نام اسلام ہے تو پھر مذکورۂ بالا احادیث میں یہ فرمانے کی کیا وجہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے کلمہ تشہد نماز، روزہ، اور زکوٰۃ و حج۔

ذرا غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ چونکہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات خاص اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر پیغمبر اور ہر مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہیں اس بنا پر وہ تعلیمات مثلاً ہر ایک کے ساتھ حسنِ خلق سے پیش آنا کسی کو زبان اور ہاتھ سے ایذا نہ دینا، غریبوں کو کھانا کھلانا سلام کرنے میں سبقت کرنا یہ سب خواہ کیسی ہی افضل پسندیدہ و محمود ہیں، چنانچہ احادیث میں ان کو خیر اسلام اور افضل الاسلام کہا گیا ہے۔ مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج و شریعت کی جس کا دوسرا نام "الاسلام" ہے بنیاد نہیں ہیں اس کی بنیاد صرف وہی چیزیں ہو سکتی ہیں جو آپ کے منہاج و شریعت کے خصوصی امتیازات ہوں اور وہ یہی ہیں کہ اللہ کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کی شہادت دینا، آنحضرت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور روزے رکھنا" ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ان صفات اور ان طریقوں اور ان

ارکان و اعمال کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی تعلیمات اور ان کی کتابوں میں نہیں تھیں پس اسی بنا پر احادیث میں ان کو اسلام کی بنیاد رکھا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام صرف خدا پرستی کا خواہ وہ کسی طریقہ پر ہی ہو۔ نام نہیں رہا ہے بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج و شریعت یہ آپ کے ارشاد کے مطابق عمل کرنے کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے

اب رہی پہلی بات یعنی یہ کہ کیا اسلام اور ایمان دو مختلف چیزیں ہیں تو اصل یہ ہے کہ ایمان کا تعلق دل کے اعتقاد اور اس کے جزم و یقین کے ساتھ ہے، اور اسلام کا اعمال و افعال کے ساتھ، چنانچہ عہدِ نبوی میں کچھ لوگ مسلمانوں کے ڈر سے مسلمان ہوگئے تھے اور اس بنا پر وہ مسلمانوں کی طرح اعمال و افعال کرتے تھے۔ لیکن اللہ اور اس کے پیغمبر پر ان کو یقین کامل نہیں تھا تو قرآن نے ان کو اس پر متنبہ کیا اور فرمایا گیا۔

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم

اعراب کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اے پیغمبر آپ ان سے کہئے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ البتہ ہاں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں درآنحالیکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے

اس سے بھی واضح طور پر یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص غیر محرف یہودیت اور غیر محرف عیسائیت پر عامل ہونے کی وجہ سے مومن کہلایا جاسکتا ہے لیکن اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتا یا ایمان لاتا ہے بایں معنی کہ وہ آپ کو رسول خدا مانتا ہے لیکن آپ کی ہی شریعت پر عمل کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا تو وہ صاحب اسلام یا مسلم نہیں کہلایا جاسکتا اور جب وہ مسلم نہیں ہے تو اگرچہ ایک محدود معنی کے اعتبار سے وہ مومن ہے۔ لیکن اسلام میں جو ایمان معتبر ہے اور جو اسلام کی تعریف کا جزء ہے وہ اس سے محروم ہے اور اس بنا پر اس پر جو احکام دنیوی و دینی مرتب ہوں گے وہ سب اسی روشنی میں ہوں گے۔

بہرحال قرآن مجید کی طرح احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف خدا پرستی کا خواہ کسی بھی طریقہ پر ہو اور عمل صالح کا نام نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور

آپ کے ہی منہاج و شریعت پر عمل کرنے کا نام اسلام ہے۔

قرآن و احادیث کے بعد اب تعامل امت۔ اور تعامل نبوی کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیجئے تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کون نہیں جانتا کہ عہد نبوی میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں ایک بڑی تعداد ان کی بھی تھی جو پہلے سے اہل کتاب تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد کیا ان لوگوں کو اس کی آزادی تھی کہ وہ اپنے معاملات و قضا کا فیصلہ قرآن کو چھوڑ کر اپنی ہی کتاب توراۃ و انجیل کی روشنی میں کریں اپنے ہی طریقہ پر نماز پڑھیں روزہ رکھیں اور دوسرے امور معاش و معاد میں اسی کا اتباع کریں ظاہر ہے کہ انھیں یہ آزادی نہ تھی اور یہ آزادی انھیں کیونکر ہوسکتی تھی جب کہ خود ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خوش خبری دی گئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ جب وہ نبی موعود و آخر الزماں آئے تو تم اس پر ایمان لانا اس نبی پر ایمان لانے کے کیا معنی تھے اور اس خوش خبری کی وجہ کیا تھی؟ صرف یہ تھی کہ اس طرح حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اپنے اپنے متبعین کو خبردار کر رہے تھے کہ جب وہ پیغمبر موعود آجائے تو تم سب اسی کا اتباع کرنا اور اسی کی شریعت و منہاج پر عمل کرنا توراۃ و انجیل اور دوسری کتابیں بلاشبہ پیغام خداوندی اور آسمانی کتابیں ہیں اور سراپا ہدایت و نور مبین لیکن اسی وقت تک جب تک کہ کتب الٰہیہ کا آخری ایڈیشن یعنی قرآن نہ آجائے اور شریعت موسوی و عیسوی پر عمل کرنا واجب ہے مگر اسی وقت تک جب تک کہ شریعت محمدی نہ آجائے چنانچہ لیظہرہ علی الدین کلہ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اب اسی مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے سوال یہ ہے کہ ہمارے فاضل دوست کی رائے کے مطابق اسلام کی جو کچھ بھی حقیقت ہے اس میں بہرحال ایمان بالرسل داخل ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ داخل ہے جیسا کہ انھوں نے بصراحت لکھا ہے! اب سوال یہ ہے کہ رسل میں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے! بس اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور آپ کے منہاج پر عمل کئے بغیر آنحضرت پر ایمان لانے کی حقیقت کیونکر متحقق

ہوگی آپ کہہ سکتے ہیں کہ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اور پیغمبروں پر ایمان لانے کا بھی تو حکم ہے۔ پس اگر آنحضرت پر ایمان لانا بغیر آپ کے اتباع کے ممکن نہیں ہے تو پھر دوسرے پیغمبروں پر ایمان لانا ان کے اتباع کے بغیر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام پیغمبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذرے ہیں اور برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خوش خبری سناتے اور آپ کے اتباع و پیروی کا حکم دیتے چلے آئے ہیں اس بنا پر ان پیغمبروں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اور آپ کی ہی شریعت و منہاج پر عمل کیا جائے۔ پس صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ کل کائنات انسانی ایک مرکز وحدت کے ساتھ وابستہ رہ سکتی ہے۔ اور تفریق بین الرسل کی معصیت سے جس پر قرآن مجید نے بار بار تنبیہ کی ہے اور جو انسانیت کے شیرازہ جمعیت کو پراگندہ کرنے میں سب سے زیادہ موثر حربہ ہے اس سے محفوظ رہ سکتی ہے جو لوگ اسلام پر تفرقہ پروری فرقہ بندی اور انسانوں میں باہمی افتراق و تشتت کے پیدا کرنے کا الزام لگاتے ہیں ذرا تھوڑی دیر کے لئے اپنی موروثی عصبیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے الگ ہو کر غور کریں اور انصاف سے کام لیں کہ اسلام کس طرح ہر مذہب و ملت کے انسانوں کو ہر طبقہ اور ہر گروہ کے فرد کو ہر ملک اور ہر قوم کے آدمی کو ایک ہی رشتۂ وحدت کے ساتھ مربوط و منظم کر دینا چاہتا ہے تمام انسان ایک ہی خدا کے بندے ہیں جس طرح ان تمام انسانوں کی مادی زندگی کا قیام و بقا ہوا۔ پانی اور روشنی اور غذا پر موقوف ہے اور اس بارہ میں ان میں کوئی تفریق و اختلاف نہیں ٹھیک اسی طرح اسلام نوع انسانی کی اخلاقی روحانی اور دینی و معادی زندگی کے لئے ایک ایسی چیز پیش کرتا ہے جس پر کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کا کوئی اجارہ نہیں ہے وہ دنیا کے کسی مذہب کو چیلنج نہیں کرتا کسی پیغمبر کی تکذیب اور کسی الہی کتاب کی تغلیط و تردید نہیں کرتا بلکہ ان سب کو ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں اور ایک ہی لڑی کے مختلف موتی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل صداقتیں بکھری پڑی تھیں سچائیاں ایک دوسرے سے الگ الگ تھیں۔ کوئی بیت المقدس

کو قبلہ بنائے ہوئے تھا اور کوئی مشرق کو کسی کے ہاں کچھ چیزیں حلال تھیں اور کسی کے ہاں ہی حرام
اب قرآن نے ان تمام سچائیوں اور صداقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے پہلے انسانی ذہن و
دماغ ارتقا کی تدریجی منزلوں سے گذر رہا تھا اس لئے ہر منزل کے مناسب جو بات نظر آئی اس کا حکم
دیا گیا لیکن تدریجی ارتقائے ذہن و فکر کا یہ قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ اپنی
منزل مقصود کو پہنچ گیا تو اب ایک آخری قانون محکم تم سب کو دیا جا رہا ہے جس میں پرانی صداقتیں
بھی سب کی سب ہیں اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ بھی ہے جو قیامت تک کے لئے تمام انسانوں
کے لئے چراغ ہدایت بنے رہے گا۔ اس بنا پر تم اگر اس ایک پیغمبر کو اور اس ایک قرآن کو مان لیتے ہو تو
اس کے معنی یہ ہیں کہ تم سب پیغمبروں کو خدا کا پیغمبر اور سب پچھلی کتابوں کو خدا کی کتابیں مان لیتے
ہو اور اس طرح تم سب ایک ہی رشتہ کے ساتھ وابستہ اور ایک ہی مرکز سے مربوط رہتے ہو۔
اب تم اگر یہودی ہو تو نہ کہو کہ نصاریٰ کچھ نہیں ہیں اگر نصرانی ہو تو یہ نہ کہو کہ یہودی کچھ نہیں ہیں یہ سب
چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں جو اب ایک سمندر میں مدغم ہو گئی ہیں۔ جب تک دن نہیں نکل آتا تم چاند
ستاروں اور چراغوں سے روشنی حاصل کرتے ہو۔ اور اس میں تم بالکل حق بجانب ہو۔ لیکن جب سورج
ان تمام روشنیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے طلوع کر آئے تو پھر اس وقت یہ کون سی عقلمندی ہے
کہ تم سورج کی روشنی کے منکر بن کر اس سے کسب فیض نہ کرو اور سورج کی شعاع بیزیوں کے باوجود
اپنے اپنے چراغ بھی جلائے بیٹھے رہو۔ فھل من مدکر (باقی آئندہ)

ادبیات

دیکھ لیتا ہوں

(جناب آلم مظفرنگری)

گلوں کو خونچکاں شبنم کو گریاں دیکھ لیتا ہوں
بہر عالم مذاقِ دردِ پنہاں دیکھ لیتا ہوں

دلِ بیتاب کی تصویرِ عریاں دیکھ لیتا ہوں!
پرِ پروانہ کو شعلے پہ رقصاں دیکھ لیتا ہوں

وہیں سعیٔ مسلسل میں کمی محسوس ہوتی ہے
جہاں ساحل کوئی نزدیک طوفاں دیکھ لیتا ہوں

غنیمت ہے ہجومِ بیکسی میں داغ مایوسی
تماشائے چراغِ زیرِ داماں دیکھ لیتا ہوں

مجھے تکلیف کیوں دیتے ہو سیرِ بزمِ ہستی کی
تصور میں تو اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

اسیری کے مزے جب یاد آتے ہیں بیاباں میں
بنا کر خاک پر تصویرِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

جسے شیخ و برہمن ڈھونڈتے ہیں دیر و کعبہ میں
اسے بے پردہ میں نزدِ رگِ جاں دیکھ لیتا ہوں

بہاروں میں ضرورت ہی نہیں نظارۂ گل کی
خدا رکھے میں اپنا داغِ حرماں دیکھ لیتا ہوں

نگاہِ شوق کی معراج کہہ سکتا ہوں میں جس کو
کبھی ایسا بھی اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

تصور کی حدوں سے اک خودی کی موج اٹھتی ہے
جو چھایا گا نسی مشکل کو آساں دیکھ لیتا ہوں

حقیقت پھر بھی رہتی ہے مری نظروں سے پوشیدہ
اگرچہ گمرہیٔ کفر و ایماں دیکھ لیتا ہوں

مذاقِ کاتبِ اعمال آنکھوں میں کھٹکتا ہے
نگاہ غور سے جب فردِ عصیاں دیکھ لیتا ہوں

آلمؔ وہ دور ہیں حالِ تعیّن سے مگر پھر بھی
میں اکثر ان کو اپنے دل میں پنہاں دیکھ لیتا ہوں

تبصرے

تنقید اور عملی تنقید از جناب احتشام حسین صاحب تقطیع متوسط کتابت وطباعت اعلیٰ، ضخامت ۲۸۰ صفحات قیمت مجلد معہ خوبصورت گرد پوش۔

تین روپے بارہ آنے۔ پتہ:۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

مغربی علوم وفنون اور مغربی افکار وخیالات کے اردو شعر وادب پر جو گہرے اثرات پڑے ہیں۔ ان کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ابھی چند برسوں میں ہی فنِ تنقید کو غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوگئی ہے اگرچہ یہ فن عربی میں نہایت ترقی یافتہ ہے اور فارسی ادبیات بھی اس سے خالی نہیں چنانچہ اردو میں مولانا شبلی اور حالی نے انہیں قدیم مشرقی اصولِ تنقید سے کام لے کر شعرا کے کلام پر تنقید کی ہے اور ادب میں ان کے مدارج ومراتب متعین کئے ہیں ان کے بعد حافظ محمود شیرانی نے اس دائرہ کو اور وسیع کیا اور انھوں نے نہایت ٹھوس بنیادوں پر ہمارے ادبی سرمایہ کا تنقیدی جائزہ لے کر افسانہ وحقیقت کے حدود کی نشان دہی کی۔ لیکن ہمارے اس دور میں مغربی اصولِ تنقید کے فروغ عام نے تنقید کی ایک اور نئی راہ پیدا کی ہے یعنی یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کے تخلیقات ذہنی کا مطالعہ اس کے عہد کے سماجی سیاسی اور ثقافتی واقتصادی ماحول کی روشنی میں کیا جائے اور ان حالات میں شاعر کا شعور کیا تھا وہ ان حالات سے کس حد تک متاثر ہوا اس کا تاثر کس قسم کا تھا۔ اس تاثر کو اس نے کیونکر ظاہر کیا اور اس نے سماج پر کیا اثر ڈالا ان سب چیزوں کا کھوج لگایا جائے اگرچہ قدیم مشرقی طرزِ تنقید جس کے حامل مولانا شبلی اور حالی تھے۔ جہاں تک نفس کلام کے محاسن ومعائب کے معلوم کرنے کا تعلق ہے ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا اور اس بنا پر نہایت اہم اور ضروری تھا لیکن فن شعر میں مہارتِ زبان کا شگفتہ ذوق۔ فنِ بلاغت ومعانی میں بصیرت ودیدہ وری اور مختلف شعرا اور ان کے اسالیب بیان کا وسیع مطالعہ درکار تھا اور ظاہر ہے کہ ہمارے آج کل کے نوجوان

ادیب اور نقاد انگریزی ادبیات کے وسیع مطالعہ کے باوجود ان علوم وفنون میں زیادہ دستگاہ نہیں رکھتے جو مشرقی طرز تنقید کے لئے ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں شبلی اور حالی اس طرز تنقید کو جس مقام پر چھوڑ گئے تھے وہ آج تک اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھا ہے اور چونکہ فنی ولسانی ذوق روز بروز مضمحل ہوتا جاتا ہے اس بنا پر امید نہیں کہ ابھی مستقبل قریب میں اس پر کوئی قابل قدر اضافہ ہو۔ تاہم مغربی اصول تنقید کی اشاعت ورواج پذیری سے تنقید کا جو یہ نیا ڈھنگ پیدا ہوا ہے اس کی بھی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس طرز تنقید نے مجموعی حیثیت سے شعر وادب کی ترقی رفتار اور اس کی سمت کو متعین کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے لائق مصنف سید احتشام حسین صاحب اسی دور جدید کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی ژرف نگاہی، اعتدال پسندی اور منصفانہ طرز تنقید کے اعتبار سے اس گروہ میں ایک نمایاں مرتبہ ومقام کے مالک ہیں ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور ان کی قوت استنباط واستخراج نتائج بھی کمزور نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے صاف اور واضح و دلنشین اسلوب کے ساتھ بیان بھی کرسکتے ہیں۔ یہ کتاب موصوف کے ہی چودہ تنقیدی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو غور وفکر اور معقولیت، وسنجیدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس مجموعہ میں بعض مضامین مثلاً "غالب کا تفکر" "اقبال کی رجائیت کا تجزیہ" "اکبر کا ذہن" "حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر" "حسرت کا رنگ سخن" خاص طور پر بہت اہم اور مفید ہیں۔ ان کے علاوہ اور مضامین بھی اس لائق ہیں کہ ادب وشعر کا ہر طالب علم ان کا مطالعہ کرے۔

حیات
شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

مؤلفہ: پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

یہ کتاب اسی ہفتہ پریس سے طبع ہوکر آئی ہے۔ بڑی تقطیع صفحات ۴۱۸ قیمت لعہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

بُرہان

جلد ۳۱ شمارہ نمبر ۴

اکتوبر ۵۳ء مطابق صفر ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ذرا کچھ سوچئے

ندوۃ المصنفین کو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جس شدید حادثہ سے دوچار ہونا پڑا اور اس کے نتیجہ میں اس کو جو عظیم مالی خسارہ ہوا اس کے بعد ہم لوگ جب قرول باغ سے منتقل ہو کر جامع مسجد دہلی کے قریب ایک مکان میں منتقل ہو گئے اور ادارہ کے کاموں کو دوبارہ جاری کرنے کا معاملہ زیر غور آیا تو اگرچہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ایک نہایت باہمت اور اولو العزم انسان ہیں لیکن ان کو بھی دلگرفتگی اس درجہ تھی کہ ادارہ کو دوبارہ جاری کرنے کے معاملہ میں مذبذب تھے لیکن اس خاکسار راقم الحروف کی قطعی رائے تھی کہ جب اتنی عظیم عمارت گر گئی ہے تو اب اسے ختم ہی کر دینا چاہئے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید ہم لوگ قدرت کی نگاہ میں اس بارِ گراں کو اٹھانے کے اہل نہیں تھے اور غالباً اسی وجہ سے "بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ہے" لیکن ہم دونوں کے برخلاف صرف ایک برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی تھے جن پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس حادثہ کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہے انھوں نے جس عزم اور ہمت کے ساتھ بے سروسامانی کے باوجود ۱۹۳۸ء میں ادارہ کی بنیاد رکھی تھی اسی "عزم عالی حوصلگی" اور "مردانہ ثبات و استقلال" سے کام لے کر لیا ایک لمحہ کے پس و پیش کے ادارہ اور برہان دونوں کو از سرِ نو جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں ادارہ کو جو حادثہ فاجعہ پیش آیا تھا اس کے دو ماہ بعد ہی یعنی نومبر میں انھوں نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ موجودہ نسل شاید محسوس نہ کر سکے کہ نہ صرف مسلمانوں پر اور ارباب علم و ادب پر بلکہ اس ملک پر ان کا یہ کتنا بڑا احسان ہے جس کی وجہ سے یہ ملک عالمِ اسلام سے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہاں سے بھی اس مرتبہ اور پایہ کا اسلامی

لٹریچر شائع ہوتا ہے جس کی نظیر بعض اچھے اچھے ممالک اسلامیہ میں بھی نہیں ملے گی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ آج نہیں تو کل جب موجودہ ہندوستان کی ثقافتی تاریخ لکھی جائے گی اور مورخ کو ان حوادث کا علم ہوگا جو ندوۃ المصنفین کو صبح آزادی کے طلوع کے ساتھ پیش آئے تو بے شبہ وہ مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی کی ہمت و حوصلہ اور قوتِ ارادی و پختہ خیالی کی داد دیگا اور آئندہ نسلیں ان کا ذکر شکر گذاری کے ساتھ کریں گی۔

جو لوگ میری افتادِ طبع اور مزاج سے واقف ہیں کہ میں کسی زندہ انسان کی اور خصوصاً اپنے بہت ہی قریبی دوست و عزیز کی مدح و ستائش کرنے میں کس درجہ کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں ان کو شاید میرے ان الفاظ پر حیرت ہو اور واقعہ یہ ہے کہ میں خود بھی طبعاً فطرتاً ان الفاظ کو لکھتے وقت اذیت محسوس کر رہا ہوں لیکن ندوۃ المصنفین آج موت و حیات کی جس کشمکش سے دوچار ہے اور جو اسکی زندگی میں اپنی نوعیت کی سب سے بڑی کشمکش ہے اس کے پیش نظر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپکو اصلی صورتِ حال سے مطلع کردوں اور اس سلسلہ میں یہ بتادوں کہ ندوۃ المصنفین کی نشاۃ ثانیہ نہ گورنمنٹ کی ممنونِ احسان ہے نہ کسی ریاست کی اسکے پیچھے نہ اسکا اپنا کوئی محفوظ سرمایہ تھا اور نہ کسی کی گرانقدر شخصی امداد بلکہ یہ درحقیقت ایک شخص کی اور کی اپنی ذاتی ہمت اور اولوالعزمی و حوصلہ مندی کی جرأتِ رندانہ تھی جس نے ایک مردہ پیکر میں روح پھونک کر پھر اسے کھڑا کر دیا!

ندوۃ المصنفین نے اپنے دورِ نشاۃ ثانیہ میں اب تک جو کچھ کیا ہے اسے دیکھکر ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ دور ثانی میں اس کا قدم بہ نسبت دورِ اول کے کسی درجہ میں اور کسی حیثیت سے بھی سست رہا ہے۔ اس مدت میں اس نے تقریباً تمام پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن شائع کئے اور انکے ساتھ ہی علاوہ ان کتابوں کے جو مختلف حضرات پر مکتبہ برہان کی طرف سے شائع ہوتی رہیں۔ ترجمان السنہ، لغات القرآن، اسلام کا نظام مساجد، تاریخ ملت کے متعدد حصے، تاریخ اسلام پر ایک نظر، عرب اور اسلام، خلیفہ کیا ہے، وغیرہ ایسی اہم، مفید اور ضخیم کتابیں چھاپیں اور طباعت و کتابت اور کاغذ کے اپنے روایتی معیار کو بہرحال قائم رکھا۔ ابھی گذشتہ چند مہینوں میں اس نے "مشائخ چشت" از خلیق احمد نظامی اور پھر انھیں کی دوسری کتاب "حیات شاہ عبدالحق محدث دہلوی"

قرآن اور تعمیر سیرت از ڈاکٹر میر ولی الدین العلم والعلماء ابن عبدالبر کا اردو ترجمہ از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ یہ چار کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے پہلی کتاب آٹھ سو اٹھارہ صفحات کی ہے اور باقی کتابیں علی الترتیب ۴۰۰، ۴۰۰ اور ۶۰۰ صفحات کی ہیں۔ طباعت و کتابت ... آپ سب کا اعلیٰ اور معیاری معنوی اعتبار سے یہ کتابیں اسی قدر ٹھوس۔ محققانہ اور بلند ہیں کہ دنیا کے کسی بھی اعلیٰ ادارۂ تصنیف کے لئے انکی اشاعت لائق فخر ہو سکتی ہے تاریخ مشائخ چشت ایک طویل سلسلہ کی پہلی کتاب ہے یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو صرف اسکی اشاعت علم و ادب اور تاریخ و تصوف کا ایک شاندار کارنامہ ہوگا۔ کتابوں کے علاوہ برہان جس پابندی سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے وہ بھی آپ جانتے ہی ہیں۔

اب آپ خود سوچئے کہ ندوۃ المصنفین کی نہ صرف بقا بلکہ اور اس کو ترقی دینا ہندوستان ایسے ملک میں ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو پھر اس پر غور کیجئے کہ ایک ایسا ادارہ جس کا چلتا رہنا صرف اس کے معاونین اور محسنین کے تعاون اور ان کی علمی ہمدردی پر موقوف ہے اور اس کے وسیع و بلند پایہ کاموں کی وجہ سے اس کے اخراجات بھی غیر معمولی ہوں۔ ایسے ادارہ کی بقا کس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کسی بڑے سے بڑے کارخانہ کو آپ منٹوں میں بند کر سکتے ہیں لیکن کسی ایک بلند نصب العین کے ماتحت کوئی ایک ادارہ قائم کرنا اور اسے کامیاب بنانا اس کے لئے سالہا سال درکار ہوتے ہیں۔ ندوۃ المصنفین ایک چلا چلایا ادارہ ہے۔ آپ کی معمولی توجہ سے وہ اپنی موجودہ مالی مشکلات پر عبور حاصل کر سکتا ہے اگر ادارہ کا ہر ممبر۔ ہر معاون اور ہر محسن اپنے اپنے حلقہ احباب میں اپنے ایسے کم از کم پانچ ممبر محسن اور معاونین بنانے کا عزم کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آخر آپ اور آپکے احباب لایعنی اور بے مقصد کاموں پر سینکڑوں روپیہ اٹھا دیتے ہیں تو کیا ایک بلند مقصد اور ایک اعلیٰ واشرف نصب العین کے لئے وہ سال میں ایک معمولی سی رقم بھی خرچ نہیں کر سکتے۔ اس وقت جبکہ ان کو اس رقم کے بدلہ میں نا فضل علما اور اکابر مصنفین کی برسوں کی دماغی و علمی کاوشوں کا ایک بصیرت افروز ذخیرہ علی الخصوص پر در مجموعہ بھی ملتا ہے۔ بات کوئی بڑی نہیں ضرورت صرف معمولی توجہ اور ... قومی احساس کی ہے ورنہ یہ صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایک شخص یا کسی ادارہ کے ارکان کتنے ہی عالی حوصلہ بلند ہمت اور مخلص و ایثار پیشہ ہوں اگر اس ادارہ کی کتابوں کے خریدار نہیں ہیں اور اسکی امداد کیلئے اسکے علاوہ کوئی اور دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے تو وہ ادارہ کس طرح قائم رہ سکتا ہے آپکے سوچنے اور کچھ کرنے کا ہے ایک لمحہ کی غفلت اور بے توجہی سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس کی تلافی بعض اوقات صدیوں میں بھی نہیں ہوتی

از
(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت ستمبر

بظاہر یہ بات دل کو لگتی بھی ہے، لیکن آپ دیکھ چکے کہ غلط ہی نہیں بلکہ "مذہبی جذبہ" کو بیدار کرکے اس کا الٹا اور قطعاً معکوس استعمال بھی تو وہ پھندا ہے جس نے دین کی روح کو شرک کے اس قدیم قالب میں گھونٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

اس کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ انسانیت کے عروج اور ارتقاء کے لئے جو جذبہ اور تقاضا آدمی کی فطرت میں محفوظ کیا گیا تھا، چڑھانا، بلند کرنا اور اتنا بلند کرنا کہ خاکی انسان خالق قدوس کے قدموں تک جس کے دست و بازو کی مدد سے پہونچ کر دم لیتا تھا اور لے سکتا تھا اسی کی الٹی اور اوندھی گردش گراتے ہوئے اور ایک درجہ سے اتار کر دوسرے درجہ دوسرے سے تیسرے درجوں پر پٹخنیاں دیتے ہوئے کہاں سے کہاں تک پہونچاتی رہی۔ مخلوقات میں جو سب سے اونچا تھا۔ وہی سب سے نیچے پڑ گیا، سب کی بندگی کا طوق اس کے گلے میں پڑ گیا۔ "قدیم علم الاصنام" یا "دیومالا" کا مطالعہ ہی بتا سکتا ہے کہ جن باتوں کو آج ہم سوچ بھی نہیں سکتے "بہ ثبات عقل و ہوش کرنے والے ان کو کرتے رہے آج سن کر بھی جن قصوں کو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے دیکھنے والے ان کو دیکھتے تھے ...... اور دانش خرد کا تقاضا ان کو یقین کرتے تھے آپ مجھ سے سن چکے کہ گبریلے کیڑے تک کی بندگی کا حلقہ کانوں میں ڈالا گیا اور گبریلے ہی کیا گننے والے نے تو یہاں تک گنے ہیں کہ خود گوبر اور اسی قسم کی چیز دیکی عبادت پر اسی آدمی نے فخر کیا اور اپنی آرزوؤں و تمناؤں کے پورے ہونے کی

امیدیں ان ہی بے حس وبے ارادہ گری پڑی گندی چیزوں کے ساتھ باندھیں اور بات اسی حد پر پہونچ کر ختم نہیں ہو گئی۔ یہ سب چیزیں خدا نہ سہی خدا کی پیدا کی ہوئی تو ہیں، لیکن اس راہ میں گرتے پڑتے لڑکھتے قلابازیاں کھاتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ انسانیت انحطاط وزوال، تنزل اور پستی کے اس نقطہ تک پہونچی کہ خود اپنے ہاتھوں کے کھودے ہوئے پتھروں کے آگے دیکھا گیا دیکھا جارہا ہے۔ آنکھیں بند کئے دست بستہ دلوں میں آرزوں اور تمناؤں کے ہجوم ..... کوئے لوگ کھڑے ہیں اوران کھودے پتھروں میں جنھیں "اصنام" اور "مورتیاں" کہتے ہیں پتھر کے نقش ونگار نہ سہی، خود پتھر تو خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں، صورت نہ سہی مادہ تو ان کا خدائی ہے، لیکن ان میں تو ایسوں کو بھی پایا گیا ہے، جو پتھروں کی ان کھودی ہوئی مورتیوں اور بتوں کے پیچھے بے دیکھے بے سنے یہ فرض کر لیا کرتے تھے کہ کوئی ان دیکھی روح پوشیدہ ہے ظاہر ہے کہ یہ "ان دیکھی روح" ان پوجنے والوں کے دماغوں کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی تھی وہ تو ان کو اپنے آپ سے باہر فرض کرتے تھے، لیکن رہتی تھی وہ ان ہی کے اندر اپنی خیالی قوت سے باہر خود ان کے پیدا کرنے والے بھی ان پوشیدہ روحوں کو نہ پاتے تھے نہ پاسکتے تھے۔ الغرض ان کی خیالی قوت اس ان دیکھی روح کو بھی پیدا کر لیتی تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیتی تھی کہ پتھر کی کھودی ہوئی کسی مورتی سے اس کا رشتہ ان کی اپنی تجویز اور خواہش کے مطابق قائم ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں جس وقت ان کا جی چاہتا تراشیدہ پتھروں کے کسی ٹکڑے کو اپنی اسی مفروضہ خیالی روح کا نمائندہ فرض کر لیتے تھے۔ مطلب جس کا یہی ہوا کہ خدا ہی کے مخلوقات" ہی کا نہیں بلکہ خود اپنے خیالی اور فرضی" مخلوقات" کا بھی آدمی بندہ اور بھکاری بنتا رہا ہے اور اب بھی کتنے ہیں جو اپنے خیال کی پیدا کی ہوئی اس قسم کی مخلوقات کی بندگی و نیازمندی کو اپنی سعادت اور خوش بختی کا سرمایہ باور کئے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ساری بے دینیاں "دینی جذبہ" کی بیداری ہی کی بدولت تو اس لئے پیدا ہوئیں کہ مذہبی رجحان کے جھکنے کا رخ بجائے اوپر کے اس کے بالکل برعکس نیچے کی طرف پھیر کر اس کو چالو کر دیا گیا۔ جھکا تو یقیناً گھومتا رہا اور پوری قوت سے

گھوستا رہا لیکن بجائے چڑھنے کے "انسانیت" اسی کے ساتھ لپٹی ہوئی گرتی اور نیچے ہی کی طرف ڈھلکتی اور پھسلتی ہی چلی گئی۔

"مذہبی جذبہ" کی یہ بیداری جس میں بجائے چڑھنے کے "آدمی" نیچے ہی گرتا چلا گیا، گرتے ہوئے اپنی تیرہ و تار بھیانک اتھاہ کھائیوں میں پہونچ کر غوطے کھانے لگا، ایسے دل دل میں جاکر دھنس گیا، جس سے نکلنے کی ہر کوشش اسے دھنساتی ہی چلی گئی دینی رجحانات کے اس جاگ سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ سلا ہی دئے جاتے جیسے جدید مشرکانہ مادی ذہنیت میں حیلوں حوالوں اور طرح طرح کے شغلوں کی تھپکیاں دے دے کر وہ سلا دئے گئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سوتوں کو تو جگایا جاسکتا ہے لیکن جاگنے والوں کو جاگنے کا مشورہ کیسے دیا جائے، سچ پوچھئے تو بت پرستی کی قدیم مشرکانہ ذہنیت اپنی اسی خاص صورت حال کی وجہ سے ایک ایسی گتھی بن گئی ہے جو سلجھانے سے اور زیادہ الجھ جاتی ہے مذہبی جذبہ کا یہ چکر اگر گردش میں نہ رہتا اور معطل کر کے اس کو چھوڑ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ خسارے سے تو اس وقت بھی بچنے کی اگرچہ کوئی صورت نہ تھی، جس "مشین" کی افادیت چالو کرنے ہی پر موقوف ہو اس کو بند کر کے نقصان کے سوا فائدہ کی بھلا کوئی کیا امید کر سکتا ہے لیکن اسی "مشین" کی الٹی گردش نے تو سارے کارخانہ ہی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا خود اس کی اپنی ہی طاقت سے اسی کا ایک ایک پرزہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا ہے، سارے جوڑ بند اس کے کھل گئے، "خود مشین" کے بھی پرزے اڑ گئے اور اس کی معکوس گردش کی لپیٹ میں جو چیز بھی آئی وہ بھی چور چور ہو کر رہ گئی سب ہی کا بھونسا نکل گیا۔

تفصیل میں میں جانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً کہہ چکا ہوں کہ "مخلوق پرستی" کے غلط تجربہ کے پیچھے کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کہاں کہاں کتنی انسانی نسلوں کا وقت، انرجی، مال، دولت، بلکہ خون تک رائگاں اور برباد ہوا، یہ سوچنے کی اور بات ہے، ورنہ "مخلوق پرستوں" میں کسی زمانے میں اس کا شعور اور احساس کہ جن جن چیزوں کو وہ پوجتے ہیں ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اخلاقی ضابطہ بھی ان پر عائد ہوتا ہے؟ اگر اس سوال کو اٹھایا جائے جو نفی کے سوا مشکل ہی سے

اس کا جواب اثبات ہی میں مل سکتا ہے۔

دیکھنے والے اس سلسلہ میں جو کچھ دیکھتے رہے ہیں زیادہ سے زیادہ لے دے کر بس یہی ہے کہ نذر و نیاز منت اور چڑھاوے کے ناموں سے کچھ پیش کرکے فرض کر لیا جاتا ہے کہ ان کے معبودوں کے مطالبات کی تکمیل کردی گئی ان کے سوا بھی اپنے پوجنے والوں سے ان کے یہ معبود اور بھی کچھ چاہتے ہیں جہاں تک میرا مطالعہ ہے آج تک اس کا پتہ نہ چل سکا، بلکہ "علم الاصنام" پر یورپین نقطہ نظر سے بحث کرنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ساری اخلاقی کمزوریوں کو ان ہی معبودوں کی طرف منسوب کرکے لوگ ان کے "جواز" ہی کا پہلو پیدا کر رہے ہیں۔ فن فریب سے مثلاً کام لینے والے کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں دیوتا نے بھی تو فلاں موقعہ پر فریب سے کام لیا تھا اور ایک فریب ہی کیا، شاید ہی کوئی "اخلاقی جرم" ہوگا، یورپ کے ان بحث کاروں کا بیان ہے کہ کسی نہ کسی دیوتا کی طرف اس کو منسوب کرکے "ضمیر کی آواز" کے دبانے کا کام نہیں لیا جا سکتا ہے یا نہیں لیا گیا ہے یہی تو میں بھی عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ دین ہی کا ڈھانچہ سہی لیکن اندر اس کے بے دینی کے سوا ڈھونڈھنے والوں کو بھی کچھ نہیں ملتا ہے۔

کچھ نہیں تو لوگوں کو اس پر غور کرنا چاہیئے تھا کہ "انسان" اور "انسانی فطرت" کے سارے امکانات کی نشو و نما کو اپنی بحث کا موضوع بنا کر قرآن میں ہر شعبہ پر جاننے والے جانتے ہیں کہ روشنی ڈالی گئی ہے اور جیسا کہ اس "قدرتی کلام" کا قاعدہ ہے کہ اس سلسلہ کے "مہمات" کے متعلق بھی چند جامع و مانع لیکن اعجازی فقروں کو ہی دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اسی "قدرتی اجمال" سے تفصیلات پیدا کئے جائیں، یہی حال قدرت کے کاموں کا ہے گویا "رنگ اور چال" قدرت کے [illegible] کا ہے کچھ [illegible] رنگ ڈھنگ اس "قدرتی کلام" یعنی قرآن کا بھی ہے [1]۔

عرض ہی کر چکا ہوں، کہ شرک یا مشرکانہ ذہنیت کا یہ نیا رنگ جو یورپ کی "نشاۃ جدیدہ"

---

[1] تفصیل اس کی مقصود ہو تو خاکسار کا رسالہ "کائنات روحانی" نامی کا مطالعہ کیا جائے ۱۲

میں زیادہ شوخ اور گہرا ہو کر نگاہوں کے آگے نکھر گیا ہے انسانی ذہن کی اس "لغزش" کی طرف بھی قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں، لیکن انصاف سے پوچھتا ہوں کہ جس گرج کا جو ہنگامہ مشرک کے اصنامی نظام کے مقابلہ میں اس کتاب میں پایا جاتا ہے دون اللہ (یعنی اللہ کے سوا) مخلوقات کو "الٰہ" معبود بنانے کے جرم کو جتنی غیر معمولی اہمیت قرآن میں دی گئی ہے، اسی قدیم مشرکانہ طریقہ فکر اور طرز عمل کے سامنے "مستقل محاذ" قائم کر کے، بار بار مختلف پیرایوں میں یہی مضمون، اس کتاب میں اول سے آخر تک جس جس طریقہ سے دہرایا گیا ہے کیا کسی دوسرے قرآنی مسئلہ کو ہم اس کی نظیر بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔؟

واقعہ یہ ہے کہ لوگ سوچتے نہیں، اور سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، شاید قرآن کی ایک عادت قرار دے کر آگے نکل جاتے ہیں، لیکن "انسانیت" کو اس عجیب و غریب "طریقۂ فکر اور طرز عمل" سے حد سے زیادہ مہیب، اور خوفناک نقصانات خاکی زندگی کے اسی عبوری دور میں جو پہونچ چکے ہیں میرا تو خیال ہے کہ وہی ہر اس شخص کو بوکھلا دینے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں، جس کے دل میں اپنے ابنائے جنس کا کچھ بھی درد پایا جاتا ہو۔ اور وہی کچھ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن کی تیوریاں اس فکری و عملی بغاوت کے مقابلہ میں کیوں اتنی غیر معمولی طور پر چڑھی ہوئی ہیں، باقی جن خساروں کو آدم کی اولاد اس وقت بھگتے گی، جب فکر و عمل کے نتائج مجسم بن کر سامنے آجائیں گے، ہم اس وقت اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں، جو قرآن ہی میں اطلاع دی گئی ہے یعنی ہر نقصان کی تلافی کی کوئی نہ کوئی شکل زندگی کے اس "دوامی دور" میں بالآخر نکل ہی آئے گی مگر ایک اور صرف یہی ایک انسانیت سوز جرم ہے جسے "تلافی مافات" کے اس عام قانون سے قرآن نے قطعاً مستثنیٰ کر دیا ہے مشہور آیت ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک	قطعاً اس جرم کو اللہ نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ
بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء	کسی (مخلوق) کو شریک ٹھہرایا جائے اور بخش
(نساء)	دیگا اس کے سوا جس (جرم) کو چاہے گا،

ایک بڑا اہم مسئلہ یعنی عہد جدید کے لادینی رجحانات کے کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ قدیم مخلوق پرستی ہی کی ایک ترمیم یافتہ شکل ہے جو نئے رنگ روپ میں ہمارے سامنے آئی ہے، درمیان میں اسی مسئلہ کا ذکر چھڑ گیا۔ اجمالی اشارے ناکافی تھے اس لئے ذرا طول بیانی سے کام لینا پڑا ورنہ اس وقت تک "خالق و مخلوق" کے متعلق سے دو ہی آئڈیا لوجیاں روحانیت و مادیت آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں، مخلوق سے لاپروائی ہی نہیں بلکہ نفرت اور بیزاری کے شعور کو مسلسل مشتعل رکھتے ہوئے خالق ہی کے گیان دھیان، جپ تپ، ذکر و فکر، طلب و جستجو میں ممکن حد تک زندگی کو بسر کرنے کی کوشش عرض کیا گیا تھا کہ اپنی خاص اصطلاح میں زندگی کے اس طریقہ کا نام میں نے "روحانیت" رکھ لیا ہے قرآن میں "رہبانیت" کے لفظ سے اسی مسلک کو جہاں تک میرا خیال ہے روشناس کیا گیا ہے۔ ٹھیک اس کے برعکس انسانی زندگی کا وہ قالب جس میں "خالق" کی طرف سے بے اعتنائی و بے نیازی کے رجحانات کو بڑھاتے ہوئے زندگی کی ساری ضرورتوں میں اپنی جد وجہد کد و کاوش کا اساسی محور "مخلوقات" ہی کو ٹھیرالیا گیا ہو۔ اسی مسلک کا نام میں نے مادیت" اس لیے رکھ لیا ہے کہ اس طریقۂ فکر کے زیر اثر جینے والوں میں اور ان لوگوں کی زندگی میں عملاً بہت کم فرق نظر آتا ہے، جو واقعی فلسفہ والی مادیت کے قائل ہیں یعنی صراحۃً خدا کا انکار کر کے عالم اور عالم میں جو کچھ ہے سب کو اسی "مادہ" سے اگا لینے کی مضحکہ خیز کوشش میں مشغول ہیں، جس میں خود کچھ نہ تھا۔ نہ زندگی تھی، نہ علم تھا، نہ شعور تھا، کہتے ہیں کہ اس سے سب کچھ برآمد ہو گیا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ کتابی اور درسی حد تک انکار خدا والی یہ مادیت، فلسفہ مابعد الطبیعیات کی ایک پرانی دیمقراطیسی دقیانوسی یادگار ہے۔ تعلیم گاہوں میں اب بھی اس کی آواز گشت کسی نہ کسی رنگ میں گونجتی ہی رہتی ہے،

لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اس دماغی مرض نے عام وبائی شکل نہ پہلے کبھی اختیار کی اور نہ آج بھی کہنے والے خواہ کچھ ہی کہتے ہوں لیکن بنی آدم کی اکثریت کی طرف "انکار خدا" والی اس

مادیت کا انتساب افترائی جرأت کے سوا شاید اور کچھ نہیں ہے، بلکہ قصہ وہی ہے کہ کائنات کی تخلیق و آفرینش کے کام کو خدائے حی و قیوم پر ختم کر کے آگے زندگی کی عام حاجتوں اور ضرورتوں میں "مخلوقات" ہی کو لوگوں نے ماوی و ملجا بنا لیا ہے سمجھا جاتا ہے کہ خدا یا خالق کو درمیان میں لائے بغیر سب کچھ ان ہی مخلوقات سے حاصل کر لیا جائے گا۔ یہ وہی قدیم "مشرکانہ ذہنیت" ہے جس کی شکار پرانی بت پرست قومیں ہوتی چلی آئی ہیں بجائے "مادیت" کے اسی لئے واقعہ تو یہی ہے کہ "شرک" کی قرآنی تعبیر ہی اس "ذہنیت" کو ظاہر کرنے کے لئے مناسب ترین تعبیر ہے، حقیقت کی صحیح ترجمانی "شرک" ہی کا لفظ کر سکتا ہے مگر تفہیمی سہولتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے "روحانیت" کے مقابلہ میں "مادیت" ہی کے لفظ کو میں نے اختیار کر لیا جس سے اعتقادی نہیں بلکہ صرف

"عملی مادیت"

مراد ہے یعنی عملاً وہی سب کچھ وہ بھی کر رہے ہیں جس کی توقع انکارِ خدا والی "مادیت" کے ماننے والوں ہی سے کی جا سکتی ہے،

آپ دیکھ رہے ہیں "روحانیت" اور "مادیت" کے اس جھگڑے کو سوچئے ان دونوں متخالف آئڈیالوجیوں میں مصالحت کی کوئی صورت کسی طرح سے کیا نکالی جا سکتی ہے؟ حال یہ ہے کہ ان میں ہر ایک مسلک کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز سے توڑنے کا حکم ایک میں دیا جاتا ہے دوسرے میں ٹھیک اسی سے جوڑنے پر اصرار کیا جاتا ہے "روحانیت" ہی کے سلسلہ میں یاد ہوگا کھانے تک کے متعلق بہ مطالعہ کتابوں میں پایا جاتا ہے کہ جنگل میں اپنے بچے کے گوشت کھانے پر گویا کھانے والا مجبور ہوا ہے[۱] بھوک کی تکلیف کے مٹانے میں ہر لقمہ اس احساس کے ساتھ حلق میں

---

[۱] ہندوستانی رہبانیت کی تشریح کرتے ہوئے میں نے شاید پہلے ہی نقل کیا تھا کہ "برتر کی تمنا" کر نیوالے کیلئے ضرور ہے کہ غذا سے نفرت کرے اور کچھ کھائے بھی تو اس احساس کے ساتھ کھائے کہ جنگل سے گذرنے والا مسافر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے بچہ کا گوشت کھا رہا ہو کتاب ہندی فلسفہ ڈاکٹر گپتا ترجمہ دار الترجمہ حیدرآباد ص ۱۵۲

جہاں اتارا جاتا ہو، وہاں مخلوقات سے بے زاری کا اندازہ کرنا چاہیئے کہ کوئی حد بھی ہے روحانیت کے اس مسلک میں "مادیت" کے اس نقطۂ نظر کی گنجائش بھلا کیا پیدا ہوسکتی ہے۔ جس میں پیدا ہونے کے سوا چاہا جاتا ہے کہ سب کچھ "مخلوقات" ہی سے حاصل کرلیا جائے۔

الغرض توڑنے کی منفی کوشش اور جوڑنے کی مثبت کوشش کا تعلق ان دونوں انڈیالوجیوں میں ایسی دو مختلف چیزوں سے ہے کہ نہ توڑ ہی میں اشتراک کی کوئی جہت دونوں میں نکل سکتی ہے اور نہ جوڑ میں، نظریاتی جنگ کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس کے متعلق "صلح" کا کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا، کہنے والے جو کہتے ہیں کہ دنیا اور دین دونوں کا جمع کرنا محال ہے مراد ان کی دین سے شاید "روحانیت" کا یہی مسلک ہے، اور مادیت کے نقطہ نظر کی تعبیر شاید وہ دنیا سے کرتے ہیں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا اور دین کا مطلب اگر یہی ہے تو دنیا اور دین دونوں کو ساتھ ساتھ لے چلنے کا ارادہ خیال ہو محال ہو، جنون ہو۔ یا اس کے سوا کچھ اور ہو آپ سب ہی کچھ کہہ سکتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایسی خطرناک جنگ جس پر "صلح" کے دروازے بند، اور قطعاً بند ہیں اس پر راضی ہو جانے کے بعد بھی "روحانیت" ہو یا "مادیت" اپنی دوسری انسانیت سوز تباہیوں کے ساتھ ساتھ یہ عجیب بات ہے کہ کس لئے؟ کے سوال کے حل میں دونوں ہی ناکامی و نامرادی ہی کے نتیجہ تک پہونچکر دم توڑ دیتی ہیں۔ شاید پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کرچکا ہوں۔ مطلب یہی ہے کہ انسان کے سوا کائنات میں جو کچھ ہے، روحانیت کے مسلک میں خالق کی کارفرمائیوں کے ان سارے مظاہر کو لاحاصل اور بے نتیجہ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ گویا کس لئے کے سوال کے متعلق صرف انسانی وجود کے نصب العین کو پیش کرکے یعنی آدمی خدا کے لئے پیدا ہوا ہے، باقی یہاں جو کچھ بھی ہے خدا نے اس کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ اس کا جواب "روحانیت" والے نہ دیتے ہیں اور نہ دینا چاہتے ہیں بلکہ منہ سے اقرار کریں یا نہ کریں لیکن اپنے طرز عمل سے وہ بھی ثابت کرتے رہتے ہیں کہ عالم اور اس کا یہ سارا نظام اپنے اندر نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ مطلب، آخر مکان سے لباس سے غذا سے پانی سے بے زاریوں کے عام رجحانات جن کی روحانیت میں عموماً حوصلہ افزائی کی جاتی ہے،

سانس لینے کی چوتانک سے بے نیازی کا ثبوت حبس دم وغیرہ کی طویل طویل مشقوں سے جو پیش کیا جاتا ہے، روحانیت کے ان جسم گداز، روح فرسا مہیب کڑی کڑی سخت ریاضتوں کے ہتھوڑوں چاہا جاتا ہو، یہ چاہا جاتا ہو، لیکن کائناتی حقائق کے افادی پہلوؤں پر جو چوٹیں ان سے قدرتاً پڑتی ہیں، اور معطل و مفلوج ہو ہو کر دنیا کی ہر وہ چیز اپنی قدر و قیمت جو کھو رہی ہے جن سے انسانی زندگی کی عام ضرورتوں میں عموماً کام لیا جاتا ہے، بلکہ زندگی کی ناگزیر ضرورتوں میں جن کو شمار کر لیا گیا ہے، کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے آخر جہاں یہ دکھایا جا رہا ہو کہ جینے والے ان کے بغیر بھی جی سکتے ہیں اور جی رہے ہیں تو روحانیت والوں کے طرز عمل کو ان ہی چیزوں کی ضرورت کے مقابلہ میں کھلے ہوئے عملی احتجاج کے سوا خود ہی سوچئے کہ اور کیا سمجھا جائے میں یہ نہیں کہتا کہ روحانیت کے اس مسلک میں کرنے والے جو کچھ کر کے دکھاتے ہیں، ان کی غرض بھی یہی ہوتی ہے، لیکن جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے تو بہر حال یہی ثابت ہوتا ہے کہ خود پیدا کرنے والے نے تو جو ہوا کو پانی کو یا اس قسم کی دوسری چیزوں کو اس لئے پیدا نہیں کیا تھا کہ آدمی ان سے نفع اٹھائے، لیکن نفع اٹھانے والوں نے اپنی طرف سے افادیت کا خود ساختہ مصنوعی پہلو ان میں پیدا کر دیا ہے۔

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ فقط ایک انسان وجود کے متعلق کس کے لئے سوال کا حل پیش کر کے ساری کائنات اور خدا کے ساری مخلوقات کو اسی کس لئے کے سوال کے جواب میں گونگا بہرا بنا کر "روحانیت" یا "رہبانیت" میں جو چھوڑ دیا جاتا ہے، اگر یہی خالق آفریدگار کے علم و حکمت کا اعتراف و اقرار ہے، تو اسی خالق کے علم و حکمت کے انکار کی شکل آخر کیا ہوگی؟

اللہ اللہ! اپنے کسی فعل و عمل پر لاحاصلی اور عبث کاری کے الزام کو جو برداشت نہیں کر سکتے ان ہی کے اندر اس فیصلے کی گنجائش کیسے پیدا ہو جاتی ہے کہ خود ان کے سوا قدرت کی ساری کار فرمائیاں لاحاصل و عبث ہیں، بلکہ الٹے ان ہی پر تیوریاں چڑھائی جاتی ہیں، جو اپنی زندگی کی ضرورتوں میں مستفید ہو کر خدا کے ان کارناموں کی قدر و قیمت کو ہویدا اور نمایاں کرتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ "مادیت" کا مسلک بجائے خود جس لعنت و ملامت کا بھی مستحق ہو لیکن کائنات کے ذرہ ذرہ میں پیدا کرنے والے خالق کی دانائیوں اور اس کی حکیمانہ مصلحتوں کی جستجو و تلاش جو کم از کم مادیت کی جدید ذہنیت کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہے، اس نقطۂ نظر سے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ رہبانیت اور روحانیت والوں کے مقابلہ میں مادیت والوں ہی کی پیٹھ ٹھونک دی جائے۔ مگر یہ سوچ کر ہاتھ رک جاتا ہے، کہ جس چراغ کی روشنی میں "مادیت" والے ہر چیز کا مطلب خود بھی سمجھ رہے تھے اور دوسروں کو بھی سمجھا رہے تھے ان کی اسی آئڈیالوجی میں اچانک اسی چراغ کو گل کر کے رکھ دیا جاتا ہے، مطلب میرا وہی ہے کہ انسانی وجود کو بے معنی، اور بے مطلب ٹھہرا کر آپ دیکھ چکے کہ روشنی میں لانے کے بعد کتنی بے دردیوں کے ساتھ ساری کائنات کو اچانک مادیت کا نقطۂ نظر اندھیرے، گھپ اندھیرے میں ڈھکیل دیتا ہے، عرض ہی کر چکا ہوں کہ مادیت میں کبوتر کا وہی "پر" نوچ لیا گیا ہے جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا، آخر دنیا کی چیزیں انسانی ضرورتوں ہی میں تو کام آکر اپنی قدر و قیمت کو ثابت کر رہی ہیں، جب انسانی وجود ہی کو بے قیمت بنا کر "مادیت" میں چھوڑ دیا جاتا ہے، تو دنیا کی کسی چیز کی قدر و قیمت کا معیار ہی کیا باقی رہا۔ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان کسی کے لیے نہیں تو نتیجہ منطقی یہی تو نکلا سب کچھ کسی کے لئے نہیں مختلف پیرایہ میں مسلسل اس مسئلہ کو سمجھاتا چلا آرہا ہوں کہ آدمی کس لئے ہی؟ اس سوال کے جواب سے خاموشی کے ساتھ ہی عالم کا یہ سارا نظام ہی گو نگے کا خواب اور "نظام باطل" بن کر رہ جاتا ہے، یہی جوہری روگ ہے مادیت کی ملعون ذہنیت کا ہی جس کی بدولت سب کچھ ہوتے ہوئے زندگی کا مادی قالب "کچھ بھی نہیں" بن کر رہ جاتا ہے گھوڑے والی وہی مثال امام غزالی کی صادق آتی ہے، کہ گھوڑا سمند بھی ہے، سیاہ زانو بھی ہے، پنج کلیان بھی ہے لیکن مرا ہوا ہے یہی مادیت" کا "پائے طاؤس" ہے، جسے دیکھ کر اس کا "طاؤسی سر" ندامت سے جھک جاتا ہے یا چاہیئے کہ وہ جھک جائے۔

آخر روحانیت کچھ بھی ہو، لیکن انسانیت کی گلیم کو تو مستی کے اس بحر بے کراں کی موجوں سے

باہر نکال لینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، لیکن مادیت تو انسان اور انسان کے ساتھ سارے عالم کو لپیٹے ہوئے لاحاصلی کے اتھاہ سمندر میں لے جا کر بیٹھ جاتی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیوں اور کس لئے پیدا ہوئی تھی، ہم اس دنیا میں کس لئے لائے گئے تھے؟

"مادیت" اور "روحانیت" کے باہمی موازنہ کے مسئلہ کو آئندہ کسی مناسب و موزوں مقام پر ہم بیان کریں گے اس باب میں جو قرآنی نقطۂ نظر ہے اسے ہم پیش کریں گے، سردست اتنا اشارہ کافی ہے

درحقیقت گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ اتنی شدید نظریاتی کش مکش میں اپنے آپ کو الجھا دینے کے بعد بھی جسے دنیا کی کوئی منطق سلجھا نہیں سکتی، روحانیت والے ہوں، یا مادیت والے دونوں ہی کے دونوں کائنات کی مقصدیت کی کامل توجیہ یعنی وہی کس لئے کے سوال کے ایسے جواب کے پانے میں قطعاً ناکام ہیں، جو انسان، اور ماوراء انسانی حقائق و موجودات سب ہی پر منطبق ہو، ہر ایک کے متعلق سمجھ میں آ جائے کہ پیدا کرنے والے نے اس کو کس لئے پیدا کیا ہے متعین ہو جائے، کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے، مگر کیا کیجئے کہ اسی ذہنی تناقض کی "دماغی کوفت" کو خود بخود خریدکر "مادیت" بھی سر ٹپک رہی ہے اور روحانیت کہئے "یا رہبانیت" اسی جال کے اندر تڑپنے اور پھڑکنے پر مجبور رہی ہے،

اب آئیے، ان دونوں آئیڈیالوجیوں کے مقابلہ میں انسانی زندگی ہی کے تیسرے قالب کو آپ کے سامنے رکھا جاتا ہے،

یہ اسلامی نظام زندگی ہے، حقیقی نام تو اس کا "الاسلام" ہے لیکن "مادیت" اور "روحانیت" کے معاملہ میں جی چاہے تو "اسلامیت" یا "اسلام" کے الفاظ سے بھی اس کی تعبیر کر لیجئے۔ آدمی کی زندگی کا یہ اسلامی نظام جب کہ دنیا جانتی ہے قرآن میں پیش کیا گیا ہے لیکن خود قرآن میں زندگی کے ان تینوں طریقوں کے متعلق جو آگاہی بخشی گئی ہے، دوسرے مباحث سے پہلے مناسب ہے کہ اسی کو سمجھ لیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ "روحانیت" جسے قرآن میں "رہبانیت" کا نام دیا گیا ہے اس کا ذکر کرتے

ہوئے جیسے

رھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنٰھا — رہبانیت (کا طریقہ) جسے لوگوں نے خود ہی

علیھم (حدید) — تراش لیا ہے ان پر اسکا مطالبہ ہم نے عائد نہیں کیا۔

کا مشہور اعلان کیا گیا ہے اسی طرح رہبانیت کے بالکل برعکس جینے کا وہ طریقہ جس میں ان مخلوقات کو جو خود اپنے اندر اپنا کچھ نہیں رکھتے، ان کو تو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے اور خالق جس کا سب کچھ ہے اسی سے کتراتے ہوئے اور زندگی کے سارے کاروبار میں عملاً اسی کو کچھ ایسے طریقے سے نظر انداز کرتے چلے جاتا کہ گویا وہ کچھ نہیں، بن کر رہ گیا ہے۔ جو قدیم ہو، یا جدید مشرکانہ ذہنیت کی مشترکہ خصوصیت ہے اسی کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

ام انزلنا علیھم سلطانا فھو — کیا ان پر ہم نے کوئی سلطان (دلیل) نازل کیا ہے

یتکلم بما کانوا بہ یشرکون — وہی دلیل بولتی ہے ان چیزوں کو جنھیں وہ خالق کا

(روم) — شریک ٹھہراتے ہیں،

یا اس کے قریب قریب

ام اتیناھم کتابا فھم علی بینۃ — کیا ہم نے ان کو کوئی نوشتہ دیا ہے اسی لئے اپنے

منہ — آپ کو کھلی دلیل کی روشنی میں پاتے ہیں۔

وغیرہ سوالات کے ساتھ ان ہی "مخلوقات" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنھیں مشرکانہ زندگی میں سب کچھ ٹھرا لیا جاتا ہے، اس قسم کے مطالبات مختلف پیرایوں میں بکثرت کئے گئے ہیں مثلاً

ارونی ماذا خلقوا من الارض — دکھاؤ مجھے ان چیزوں نے جنھیں تم شریک

ام لھم شرک فی السمٰوٰت — ٹھراتے ہو، انھوں نے زمین کی کسی چیز کو پیدا کیا

ایتونی بکتاب من قبل ھذا — یا انکا ساجھا آسمانوں میں ہے لاؤ کوئی نوشتہ

او اثارۃ من علم ان کنتم صادقین — جو پہلے نازل ہوا ہو، یا علم جو چلا آتا ہو ان کے

(الاحقاف) — ہاں اگر تم سچے ہو،

یا ان ہی سے دریافت کرتے ہوئے پوچھا گیا ہے کہ

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا (الانعام) — کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اس علم کو ہمارے آگے کے لئے

اس نوعیت کی تحدیوں یا چیلنج پر چیلنج کے بعد خود ان کو بھی جنھیں اس مشرکانہ نقطۂ نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے پر اصرار ہے قرآن اس قسم کے الفاظ سے چونکاتا چلا گیا ہے کہ

إِنْ يَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُوْنَ (الفاطر) — نہیں پیچھے چل رہے ہو تم لوگ مگر صرف خیالی گمان کے اور نہیں تم لوگ مگر یہ کہ صرف اٹکل سے کام لے رہے ہو

اور دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہوئے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُوْرًا (الفاطر) — بلکہ (نظریہ شرک کے متعلق واقعاتی حدود) سے ہٹنے والے باہم ایک دوسرے کو نہیں امیدوار بنا رہے ہیں مگر صرف فریب کا

حاصل سب کا یہی ہے کہ رہبانیت اور روحانیت جیسے زندگی کا کوئی قدرتی دستور و آئین نہیں ہے بلکہ اپنے ذاتی رجحانات ذہنی افتاد یا اتفاقاً پیش آنے والے حوادث و حالات کے زیر اثر تراشنے والوں نے جینے کا ایک مصنوعی، غیر فطری طریقہ خود ہی تراش لیا ہے، یہی حال اس مشرکانہ مادی زندگی کا بھی ہے جس میں "نظریۂ شرک" آدمی کو مبتلا کر دیتا ہے۔ قرآن نے چیلنج کیا ہے کہ نہ تو علم کے حکیمانہ اور سائنٹیفک معیار پر جانچی اور پرکھی ہوئی کوئی حقیقت مشرکانہ نظام زندگی میں ڈھونڈھنے والوں کو کبھی مل سکتی ہے اور استناد و اعتماد کی قدرتی ضمانت وحی و الہام کی لاہوتی راہ کے مکشوفات معلومات میں جو پائی جاتی ہے اسی کی ضمانت اس خوامخواہ کے بے بنیاد وسوسہ کو میسر آ سکتی ہے جس میں مبتلا ہو کر باور کرنے والے باور کر لیتے ہیں کہ جس کا سب کچھ ہے وہی عملاً کچھ نہیں ہے اور جن میں خود اپنا کچھ نہیں ہوتا وہی سب کچھ بن بیٹھے ہیں اور ہے بھی بجائے خود یہ اتنی بودی پھسپھسی مضحکہ خیز، تبسم انگیز بات کہ وحی و الہام کیطرف انتساب کا دعویٰ ہی اس کی تردید اور یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اتنا بے بنیاد وسوسہ یا وہم خدائے علیم خبیر

کا بجتا ہوا علم نہیں ہو سکتا، عقل بے چاری ہر بھلی بری بات کی تائید اور جذبات احساسات کی وکالت میں لاکھ بدنام سہی، لیکن ایسے بے معنی دعوی کی برداشت کی گنجائش بتائیے کہ اس فریب میں بھی کیسے پیدا کی جائے۔ کسنا اور کس کر دکھانا تو خیر دور کی بات ہے، سچ تو یہ ہے کہ ایسے دانش سوز عقل گداز وسوسہ کو تجربہ اور مشاہدہ کی حکیمانہ وعلمی کسوٹی پر کسنے ہی کا بھلا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے! خدا کا انکار کر کے تو خیر بنانے والے کچھ الٹی سیدھی باتیں بنا بھی سکتے ہیں، لیکن مشرکانہ طریقہ فکر جس میں خدا کا انکار بھی تو نہیں کیا جاتا یہی مانا جاتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی صورت میں بتایا جائے "کہ فرض وتخمین کی ایک انکل پچو بات ظن اور گمان کے سوا اوہام ووساوس کی ان تھپیڑوں کی توجیہ اور کیا کی جائے جن سے "مشرکانہ ذہنیت" ٹکرا کر جو کچھ نہیں ہے اسی کو سب کچھ اور جو سب کچھ ہے اسی کو "کچھ نہیں" ٹھہرانے کی ابلہ فریبیوں میں خود مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی مبتلا کرتی چلی آرہی ہے۔

بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا (الفاطر)	بلکہ (واقعات کی حدود سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے) ظالمین باہم ایک دوسرے کو نہیں امید وار ٹھہرا رہے ہیں مگر صرف فریب کار

کے سوا اور کن لفظوں میں آخر کاروبار کے اس سارے نظام کی روداد قرآن پیش کرتا جو شرک کی راہوں میں انجام دیے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں مشرکوں ہی کو خطاب کر کے قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے۔

فَأْتُوا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ	لاؤ اپنے فکر وعمل کی صداقت پر کوئی سلطان مبین یعنی کھلی دلیل

اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی اظہار واعلان کر دیا گیا ہے کہ

مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ	نہیں اتارا ہے اللہ نے اس کے متعلق کوئی سلطان یعنی دلیل

جہاں تک میرا خیال ہے ایسی بات جو انسانی عقل واحساس پر مسلط ہو کر اس طریقے سے چھا جائے۔ کہ اس کے ماننے پر آدمی بے بس ہو جائے قرآنی اصطلاح کی رو سے اسی نوعیت کے دلائل کی تعبیر "سلطان"

کے نقطے کی گئی ہے۔ بظاہر اس پیرایۂ بیان سے ادہر توجہ دلانا مقصود ہے کہ زندگی، بہرحال زندگی ہے، وہ کوئی ہنسی مذاق، کھیل کود، لہو ولعب نہیں ہے کہ من ملنے خود تراشیدہ خیالات واوہام کے نیچے بہنے اور بہلنے کے لئے حیاتی توانائیوں کے اس انمول قیمتی سرمایہ کو چھوڑ دیا جائے" سلطان" کے لفظ سے قرآن چونکانا چاہتا ہے اور اس احساس کو دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جو قدم بھی اس زندگی میں اٹھایا ہے چاہیئے کہ "سلطانی دلائل" ہی کی روشنی میں اٹھایا جائے، اور شکر ہے کہ "نزول قرآن" کے بعد نظر وفکر کے اس سلطانی کہئے یا قرآنی طریقہ پر اصرار کا مذاق روز بروز شدت پذیر یا اور اپنے دائرے کو وسیع کرتا چلا جا رہا ہے، تعلیم کا نیا مغربی نظام اپنی جوہری کوتاہیوں بلکہ بعض انسانیت گداز خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ سلطانیت کے مذاق کو آگے بڑہانے میں جو کام کر رہا ہے اس کا انکار میرے نزدیک تو ایک حقیقت اور واقعہ کا انکار ہوگا مگر کیا کیجیے مغربی تمدن وتہذیب کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ جب بقول شخصے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کے پہلو پر نظر پڑتی ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے سب کچھ سوچا جا رہا ہے۔ ہر مسئلہ پر بحث کا دروازہ کھول دیا گیا ہے لیکن زندگی کے بنیادی سوالوں ہی کی طرف سے دوسرے تو دوسرے خود یورپ وامریکہ والے بھی غفلت یا تغافل ہی سے کام لے رہے ہیں تاہم پہلے بھی عرض ہی کر چکا ہوں کہ حال کی تاریکی کے پیچھے میری ایمانی بصیرت وفراست کسی روشن مستقبل کو دیکھ رہی ہے، مجھے امید ہے کہ اس قسم کی پادر ہوا وسواسی باتوں کا زور کم تو ہوتا ہی جا رہا ہے مگر زیادہ دور نہیں ہے وہ دن کہ ہمیشہ کے لئے یہ زور ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے یعنی وہی باتیں جن کے چرچا کرنے والے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہے تو ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے" یا زیادہ سے کسی انفرادی شخصیت کا سپنا یا خواب یا افراد ہی کے اتفاقی ونفسیاتی کرشموں کے ان آثار کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں یقین سے زیادہ شکوک اور شبہات ہی کے حباتیم بھنبھناتے رہتے ہیں توقع تو یہی ہے کہ ایسی پارینہ کتابیں جن کی قدیم تعبیروں میں امتداد زمانہ سے ہر مفہوم اور ہر مطلب کے نکال لینے کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے ان ہی غیر سلطانی مبہم فقروں سے نکالے ہوئے مشکوک ومشتبہ نتائج پر بھروسہ کر کے آدم کی اولاد زیادہ دن تک

اپنی زندگی سے کھیلتی نہ رہے گی، اور قرآنی مطالبہ

فَأْتُوا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ اور لاؤ (مشرکانہ کاروبار کی صداقت پر) کوئی

سلطان مبین یعنی کھلی دلیل

پر دھیان دینے کے لئے آج نہیں تو کل انشاء اللہ دنیا آمادہ ہو جائے گی،[1]

یہ تو خیر ایک ضمنی بات تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک طرف رہبانیت کہیے یا "روحانیت" اور نظریہ شرک والی "مادیت" دونوں ہی لوگوں کا ساختہ پرداختہ خود افریدہ وتراشیدہ مصنوعی طریقہ حیات قرار دیتے ہوئے جہاں قرآن میں

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ قطعاً اللہ کے پاس دین "الاسلام" ہی ہے

کا اعلان کیا گیا ہے،

جس کا مطلب یہی ہے کہ "رہبانیت" اور "مادیت" ان دونوں مصنوعی خود ساختہ اسٹڈیالوجیوں کے مقابلہ میں آدمی کی زندگی کا ایسا قدرتی دستور جس کی پابندی کا مطالبہ اللہ یعنی خالق کائنات کے پاس سے کیا گیا ہے۔ وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ (باقی)

---

[1] اس موقعہ پر میرے قلم سے یہ چند فقرے گرچہ بطور جملہ معترضہ ہی کے نکل پڑے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ایک مسئلہ کی طرف ضمنی انتباہ بھی مقصود ہے یعنی قرآن میں مشرکانہ نقطۂ نظر کے متعلق بار بار دہرا دہرا کر یہ چیلنج جو کیا گیا ہے کہ وحی والہام کی راہ سے معلومات مختلف زمانہ میں جو قوموں میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں ان میں بھی کوئی توثیقی شہادت "نظریہ شرک" کی تصحیح میں پیش کرنے والے پیش نہیں کر سکتے آج دنیا میں الہامی کتابوں کے نام سے جو کتابیں مشہور ہیں۔ باوجود مشتبہ ومشکوک ہونے کے یہ واقعہ ہے کہ بنیادوں کی تعلیم بھی مسئلہ توحید ہی پر رکھی گئی ہے اسی لئے ان کتابوں کے ماننے والے توحید ہی کو اپنا دینی عقیدہ قرار دیتے ہیں لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں توحید کے بعد عموماً دیکھا گیا ہے کہ قوموں میں مشرکانہ ذہنیت کی وبا پھوٹ پڑی حد یہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانیوالی امت بھی اس وبائی حادثہ سے محفوظ نہ رہ سکی ایسے بعد تاویل وتوجیہ کی چابک دستیوں سے عموماً کام لینے والوں نے کام لیا ہے جب قرآن پر ایمان لانیکے ساتھ مشرکانہ کاروبار کی گنجائش پیدا کر لی گئی تو دوسری الہامی کتابوں کے سننے والوں پر یہی افتاد اگر پڑی تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے لیکن آدمی کا ضمیر بہر حال جب زندہ ہو جاتا ہے تو تاویلوں کے یہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور قرآن کا یہ چیلنج بھی اصل حقیقت سے تعلق رکھتا ہے ورنہ تاویل وتوجیہ کے رو سے تو کاندہ کی کتاب کو بھی لوگوں نے تصوف کی کتاب ثابت کر کے دکھایا ہے ۱۲

مولائے روم

از جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت لکچرر۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد

یہ مقالہ گلستان ادب حیدرآباد دکن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۵ر جون ۵۳ء میں پڑھا گیا

ارباب گلستانِ ادب کا حکم ہے کہ میں اس موقع پر حضرت مولائے روم پر کچھ عرض کروں اسے بھی مولائے روم کا ایک تصرف سمجھنا چاہیئے کہ عین اس وقت جب کہ مولائے روم کے وصال پر پورے سات سو سال گذر چکے ہیں (۵ر جمادی الآخر ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۰ر فروری ۱۹۵۳ء کو مولائے روم کی وفات پر پورے سات سو سال ہوگئے) اور ترکی، ایران، افغانستان اور ہند و پاکستان، فرانس جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے بعض مقاموں پر ان کی یہ سات سویں برسی بڑے دھوم دھام سے منائی جارہی ہے مجھے اس موضوع پر کچھ عرض کرکے حصول خیر و برکت کی عزت بخشی جارہی ہے۔ ارباب گلستان ادب نے حضرت مولائے روم پر کچھ سننے کی خواہش غالباً اس لئے کی ہے کہ وہ بھی ہماری موجودہ نسل کے ہزاروں لاکھوں افراد کی طرح شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے کلام سے متاثر ہوئے ہیں اور علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مولائے روم سے راست استفادہ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ جاوید نامہ میں آپ پڑھتے ہیں کہ مولائے روم کی روح ان پر آشکارا ہوتی ہے اور اپنی قیادت میں انھیں ہفت افلاک کی سیر کراتی ہے۔ ابتدا ہی میں وہ مولائے روم کا تعارف اس طرح کراتے ہیں ؎

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید	از پس کہ پارہ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب	او فرخندہ چوں عہد شباب
پیکرے روشن ز نورِ سرمدی	در سراپایش سرورِ سرمدی
بر لبِ او سرِ پنہانِ وجود	بند ہائے حرف و صورت را کشود

حرف او آئینہ او بختہ   علم با سوزِ درون آمیختہ

پھر بالِ جبریل میں ہمیں وہ مشہور مکالمہ ملتا ہے جس میں شاعر مشرق مرید ہندی کے روپ میں مولائے روم سے مختلف موضوعات پر سوال کرتے ہیں اور مولائے روم "پیر رومی" کی حیثیت سے ان کے شافی جواب دیتے جاتے ہیں۔ اسی مجموعہ میں "یورپ سے ایک خط" والی نظم میں فرماتے ہیں ؎

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں، اقبال   جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اور پھر ایک جگہ ارشاد فرما گئے ہیں ؎

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک   کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

ارمغانِ حجاز میں جو شاعر مشرق کے کلام کا آخری مجموعہ ہے، مولائے روم سے اکتسابِ فیض کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہمی روشن ز تاکِ من فرو ریخت   خوشا مردے کہ در دامانم آویخت
نصیب از آتشے دارم کہ اول   سنائی از دلِ رومی برانگیخت

شاعر مشرق نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، لیکن اس مطالعہ سے ان پر کوئی چیز نہ کھلی، انھیں جو کچھ ملا وہ پیر رومی ہی سے ملا ہے، فرماتے ہیں ؎

مرا از منطق آید بوی خامی   دلیلِ او دلیلِ نا تمامی!
برویم بستہ در ہا را کشاید   دو بیت از پیر رومی یا ز جامی

علامہ اقبال کے ناقدوں اور شارحوں کا خیال ہے کہ مولائے روم کا کوئی حقیقی جانشین اور ان کا کوئی حقیقی خلیفہ پیدا ہوا تو وہ سوا چھ سو سال کے بعد ہند میں حضرت اقبال کی ذات میں پیدا ہوا۔ خود علامہ اقبال کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ عصر کہن کے فتنہ میں جو کام مولائے روم نے کیا تھا وہی کام انھوں نے فتنۂ عصر رواں میں کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من   از و آموختم اسرار جان من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او! بہ دورِ فتنۂ عصرِ روانِ من

کہیں وہ مشورہ دیتے ہیں کہ مولائے روم کے اشعار حریم دل میں آویزاں کیے جائیں، فرماگئے ہیں ؎

بکام خود دگر آں کہنہ مے ریز کہ با جامش نیرزد ملک پرویز

ز اشعار جلال الدین رومی! بہ دیوارِ حریمِ دل بیاویز

کہیں رومی سے اسرار فقیری سیکھنے کی دعوت دیتے ہیں ؎

ز رومی گیر اسرار فقیری کہ آں فقر است محسود امیری

حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے رسیدی بر مقام سر بزیری

کہیں بڑے درد سے دعا مانگتے ہیں ؎

عطا کن شورِ رومی سوزِ خسرو عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی

کلام اقبال میں یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد آپ کے دل میں مولانا جلال الدین رومی کے حالات اور ان کا پیام جاننے کی خواہش پیدا ہوئی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں آیئے اب کچھ دیر اس حکیم نے نواز کی صحبتِ فیض اثر میں بسر کریں اور اس کے جان بخش نغموں سے ایک نئی زندگی حاصل کریں، کیونکہ ؎

ضمیر امتاں را می کند پاک کلیمے یا حکیمے نے نوازے!

ایران کے بلند پایہ صوفی شعرا کا وہ سلسلہ جو سنائی، عطار، حافظ، شیخ شبستری، سعدی خسرو اور عراقی سے شروع ہو کر مولانا عبد الرحمٰن جامی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں مولانا جلال الدین رومی ایک امتیازِ خاص کے حامل ہیں۔ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو آپ کی ولادتِ باسعادت شہر بلخ میں ہوئی جو آج کل سلطنت خداداد افغانستان میں شامل ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ شہر ایرانی ممالک کا ایک حصہ اور ایرانی ادبیات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا نسباً صدیقی ہیں اور آپ کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر مل جاتا ہے اور ایک عرصے سے آپ کے آباد اجداد ہجرت کر کے ایران میں مقیم ہو گئے تھے۔ آپ کے والد سلطان العلماء محمد بن حسین الخطیبی ملقب بہ بہاء الدین ولد حسب روایت علاء الدین

خوارزم شاہ کے داماد تھے اور اپنے زمانے کے اونچے پائے کے عالموں اور عارفوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے اور آپ کو خوارزم شاہ کے دربار میں بڑا تقرب حاصل تھا۔ کہتے ہیں جب آپ کے زہد و تقویٰ کی شہرت بڑھی اور مریدوں کی کثرت سے آپ کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا تو خوارزم شاہ کو آپ کی طرف سے ایک گونہ بدگمانی پیدا ہوگئی اور در پردہ وہ آپ کا دشمن ہوگیا ادھر تصوف کے مخالفوں نے بھی آپ کے خلاف سر ابھارا اور ان کے بھڑکانے پر بلخ کے باشندے آپکے درپئے آزار ہوگئے۔ وطن والوں کی یہ بے مہری دیکھ کر آپ نے مجبوراً وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے صاحبزادے مولانا جلال الدین کو ساتھ لے کر بغداد کے راستے سفر حج کیا۔ مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد کی تالیف کردہ مثنوی کے بعض اشعار کی رو سے یہ سفر فتنۂ مغول کے ظہور کے وقت اختیار کیا گیا تھا۔ غالباً اس وقت یہ فتنہ کافی رنگ لاچکا تھا قیاس ہے یہ سفر ۶۱۷ھ کے لگ بھگ اختیار کیا گیا ہوگا۔ اس لحاظ سے اس وقت مولانا جلال الدین کی عمر چودہ سال کے قریب ہوگی۔

کہتے ہیں کہ مولانا بہاؤ الدین ولد نے نیشاپور میں شیخ فرید الدین عطار کی بھی زیارت کی اس ملاقات کے وقت مولانا جلال الدین رومی بھی موجود تھے۔ شیخ فرید الدین عطار نے مولانا جلال الدین رومی کو اپنے سینے سے لگایا دعا دی اور انھیں اپنی لکھی ہوئی مثنوی "اسرار نامہ" تحفتہً عطا کی۔ بغداد سے روانہ ہوکر حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد مولانا بہاؤ الدین ولد ملاطیہ پہونچے اور اسی شہر میں چار سال تک اقامت گزین رہے۔ اس کے بعد آپ لارندہ آئے جو اس زمانہ میں سلاجقۂ ایشیائے کوچک کا ایک حکومتی مرکز تھا اس شہر میں بھی آپ سات سال تک مقیم رہے اس کے بعد آپ سلاجقۂ ایشیائے کوچک کے بارھویں بادشاہ علاؤ الدین کیقباد (۶۱۷ - ۶۳۴ھ) کی دعوت پر اس کے پایہ تخت قونیہ پہنچے۔ قونیہ پہونچکر آپ نے رشد و ہدایت کی مسند پر قدم رکھا اور آپ کے انفاس کی برکت سے ایک عالم فیضیاب ہونے لگا۔ خود علاؤ الدین کیقباد آپ سے غیر معمولی ارادت رکھتا تھا آپنے قونیہ ہی میں ۶۲۸ھ کے قریب انتقال فرمایا۔

مولانا جلال الدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ والد کی وفات کے ایک سال بعد جب سید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے والد کے خاص شاگرد اور

محبوب خلفاء میں شمار ہوتے تھے، قونیہ آئے تو مولانا جلال الدین نے ان کی مجالسِ درس کے سے بھی کسبِ فیض کیا اور پورے نو سال تک اس مردِ عارف کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد مولانا نے سیاحت، اکتسابِ معرفت، اور اصحابِ طریقت سے فیضِ صحبت حاصل کرنے کے لئے شام کا سفر اختیار کیا۔ ایک عرصہ تک آپ حلب اور دمشق میں اقامت گزین رہے اور معنوی تجارب اور علمی اکتسابات کی ایک دنیا لئے قونیہ لوٹے اور یہاں آکر سلطان کیقباد کے حکم پر اپنے والد کی طرح علوم شرعی کی تعلیم اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، اس طرح وہ اپنے اس مبارک کام میں مشغول تھے کہ حسنِ اتفاق سے آپ کی ملاقات ایک اوتادِ زمانہ اور نوادرِ دوراں سے ہوگئی۔ اس ملاقات نے مولانا جلال الدین کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی کی ذات تھی جو اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے صوفی اور مجذوب پیر تھے۔ آپ اپنے انفاس میں عشقِ حقیقی کی بے پایاں گرمی، اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے ایک شہر سے دوسرے شہر تک راہ پیمائی کرتے اور اہلِ راز عارفوں اور درویشوں کے دل میں آتشِ شوق بھڑکاتے ۶۴۲ھ کے لگ بھگ آپ مولانا جلال الدین کی تلاش میں قونیہ پہونچے ایک ہی نظر میں مولانا جلال الدین کے گداختہ اور گداز دل میں عشق و مستی کا شعلہ بھڑکا اور سوجان سے آپ شمس تبریز کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ آخر عمر تک انھیں اپنا روحانی پیشوا اور ہادی و رہنما مان لیا جس ادب اور جس احترام کے ساتھ مولانا اپنے اشعار و اقوال میں اپنے آپ کو شمس تبریزی سے نسبت دیتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی صحبت نے مولانا کے جہانگیر دل پر بڑا زبردست اثر کیا تھا، ذیل کے اشعار جو مثنوی کے دفتر اول سے انتخاب کئے گئے ہیں اس دعوے کے بہترین شاہد ہیں ؎

شمس تبریزی کہ نورِ مطلق است — آفتاب است و ز انوارِ حق است

ایں نفس جاں دامنم بر تافت است — بوی پیراہانِ یوسف یافت است

کز برای حق صحبت سالہا | باز گو رمزی ازاں خوش حالہا
من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست | شرح آں یاری کہ آں را یار نیست
خود ثنا گفتن زمن ترکِ ثناست | کایں دلیلِ ہستی و ہستی خطاست
شرح ایں ہجران و ایں خون جگر | ایں زماں بگذار تا وقتِ دگر
گفتمش پوشیدہ خوش تر سرِ یار | خود تو در ضمنِ حکایت گوش دار
خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں | گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

جیسا کہ ان اشعار میں بیان کیا گیا ہے مولانا جلال الدین نے مثنوی کی حکایتوں کی شرح اور تصوف کے معانی کے بیان میں اپنے پیر و مرشد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان کی یاد سے ایک جوش و ولولہ اور ایک وجد و طرب کی کیفیت ان پر طاری ہو گئی ہے ان کا نام کہیں نہیں لیا ہے اور اسرارِ عرفاں اور رموزِ ایمان کو حدیثِ دیگراں کے پردے میں بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ مولانا نے ایک مدت اس عارفِ سوختہ و سوزندہ کے ساتھ خلوت میں ان کے فیض صحبت میں بسر کی۔ اس دوران میں کچھ دنوں کے لیے شمس تبریزی نے دمشق کا سفر بھی کیا، لیکن پھر لوٹ کر قونیہ آ گئے اور مولانا جلال الدین کی آتشِ عشق کو شعلہ در بنانے میں مشغول ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریزی نے مقام وجد و شوق میں عنانِ اختیار اپنے ہاتھ سے دے دی اور مضمراتِ دروں کو برملا کہنے لگے تھے اور عوام کے سطحی عقائد پر تنقید کرنے میں بے باک ہو گئے تھے اور بے محابہ اسرار کو فاش کرنے لگے تھے۔ ان کی سماع و وجد و طرب کی محفلیں بے باکانہ منعقد ہونے لگی تھیں۔ اس لیے روایت ہے کہ ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے ایک دن قونیہ کے عوام نے شورش کر کے ان کو مجمع عام میں قتل کر ڈالا (۶۴۵ھ)۔ اس حادثہ میں مولانا کے سب سے بڑے فرزند بھی سخت زخمی ہوئے اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکے لیکن مولانا روم کی غزلیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شمس تبریزی ایک روز غائب ہو گئے

اور مولانا دو سال تک شب و روز اپنے کعبۂ مقصود کے فراق میں گھلتے رہے۔ اس کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن اس کا پھر پتہ نہ پا سکے۔

اس حادثہ کے بعد ہی مولانا جلال الدین نے ریاضت اور عالم عرفاں کے تجارب میں بہت ہی اونچا مرتبہ حاصل کیا، اور اس مسلک کے قطب مانے گئے۔ آپ کے پہلے خلیفہ صلاح الدین زرکوب ہوئے مولانا نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی اور ان کے حال پر آپ کی غیر معمولی شفقت کی وجہ سے وہ مولانا کے تمام مریدوں کے محسود بن گئے تھے۔ دس سال تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ ان کے علاوہ یعنی ۶۵۷ھ میں مولانا نے حسام الدین حسن بن محمد بن حسن کو خلافت عطا فرمائی۔ آپ مولانا کی زندگی میں گیارہ سال تک مولانا کے خلیفہ اور مولانا کی وفات کے بعد بارہ سال تک آپ کے جانشین رہے۔

حسام الدین مولانا کے خاص مریدوں میں تھے اور مولانا نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی تھی۔ مولانا نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ طریقت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے اور علم و تقوی اور معرفت میں بہت اونچے مرتبے پر فائز ہو چکے تھے اور ان کا قول اپنے پیر و مرشد کے حضور میں نہایت درجہ مقبول اور اثر پذیر تھا۔ چنانچہ یہ ان کی تحریک اور تشویق کا نتیجہ تھا کہ مثنوی مولوی معنوی جو تصوف کا شاہکار ہے عالم وجود میں آئی۔ مولانا حسام الدین نے ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد خلافت مولانا کے فرزند سلطان ولد کو ملی اور وہ تیس سال تک اس منصب پر فائز رہے۔

مثنوی معنوی مولانا جلال الدین کے افکار عالیہ کا گراں بہا ثمر ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔ اس میں چھ دفتر ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ۲۶ ہزار ہے اور پوری مثنوی بحر رمل میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کے دفتر اول کی ابتدا کس تاریخ سے ہوئی یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ لیکن اس دفتر کے اختتام کے کوئی دو سال بعد دوسرا دفتر شروع ہوا دوسرے دفتر کی تالیف کی تاریخ ۶۶۲ھ ہے۔ اس لحاظ سے دفتر اول کی ابتدا ۶۵۷ھ اور

۶۶۰ھ کے درمیان آتی ہے کیونکہ حسام الدین ۶۵۷ھ میں منصبِ خلافت پر فائز ہوئے۔ اس دو سالہ وقفہ کی وجہ مولانا کے ملہم اور مشوق حسام الدین کی بیوی کی وفات کا ازدہ وغم تھا اس غم نے استاد و شاگرد دونوں کو دل گرفتہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناگہانی مصیبت کی وجہ سے حسام الدین نے گوشہ نشین ہوکر ریاضت اور اعتکاف کی زندگی اختیار کرلی تھی، دفتر دوم کے ابتدائی اشعار اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

مدتی ایں مثنوی تاخیر شد | مہلتی بایست تاخوں شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عنان | بازگردانید ز اوج آسمان
چوں بہ معراجِ حقایق رفتہ بود | بی بہارش غنچہ ہا نشگفتہ بود
چوں ز دریا سوی ساحل بازگشت | چنگ شعر معنوی باسازگشت
مطلع تاریخ ایں سودا و سود | سال ہجرت شش صد و شصت ~~دو بود~~

ان اشعار سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حسام الدین اپنے پیر و مرشد کے دل میں ذوق و شوق پیدا کرنے میں کتنا زبردست اثر رکھتے تھے۔ مثنوی کا دفتر سوم بھی مولانا اسی طرح حسام الدین کے نام سے شروع کرتے ہیں ؎

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار | ایں سیوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

دفتر چہارم کے آغاز پر پھر ایک بار مولانا جلال الدین اپنے شاگرد رشید اور مرید سعید حسام الدین کی تاثیر معنوی کو اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

ای ضیاء الحق حسام الدین توئی | کہ گذشت از مہ بنورت مثنوی
ہمت عالی تو ای مرتجا | می کشد ایں را خدا داند کجا
گردن ایں مثنوی را بستہ | می کشی آنجا کہ تو دانستہ
مثنوی را چوں تو مبدا بودہ | گر فزوں گردد تو اش افزودہ

دفتر پنجم کے مطلع میں بھی ایسے ہی خیالات کی تکرار یوں فرماتے ہیں ؎

شہ حسام الدین کہ نور انجم است　　طالب آغاز سفر پنجم است

ای ضیاء الحق حسام الدین راد　　او ستاد ان صفا را او ستاد

دفتر ششم جو مثنوی کا آخری دفتر ہے، اس کی ابتدا بھی حسام الدین ہی کے نام سے فرماتے ہیں ؎

ای حیاتِ دل حسام الدین بسی　　میل می جوشد بقسم سادسی

گشت از جذب چو تو علامہ　　در جہاں گردان حسامی نامہ

مثنوی معنوی میں مسلسل منظوم حکایتیں ہیں، ان حکایتوں کو بیان کر کے مولانا ان سے دینی اور عرفانی نتائج اخذ کرتے اور حقائقِ معنوی کو سیدھی سادی زبان میں از راہ تمثیل بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح وہ قرآن شریف کی بہت سی آیتوں اور احادیث نبوی کی شرح صوفیانہ طرز پر کرتے ہیں یہ صحیح ہے کہ مثنوی شریف تصوف میں اولین مثنوی نہیں اس سے پہلے شیخ سنائی اور شیخ عطار جیسے عارف شاعروں نے صوفیانہ عقائد کی شرح میں مثنویاں تصنیف کی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عارفانہ مثنویاں اور ان کے مصنف دونوں مولانا جلال الدین کے پیش نظر تھے اور انھیں وہ اپنا استاد مانتے تھے، اسی لئے تو فرماتے ہیں ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت　　ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا خود اپنا ایک مستقل رنگ اور اپنا الگ ہی لحن رکھتے ہیں۔ انھوں نے شہر تصوف میں اپنا دلکش و بلند و بالا قصر سب سے الگ ہی تعمیر کیا ہے اور اس قصر رفیع پر خود ان کا اپنا پرچم لہرا رہا ہے،

مثنوی کے بعد مولانا کی سب سے اہم تصنیف ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو دیوان شمس تبریز کے نام سے جمع کیا گیا ہے۔ اس دیوان کو انھوں نے اپنے مرشد اور روحانی پیشوا کے نام سے منتسب کیا ہے۔ اس دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے اور چھپے ہوئے دیوان میں پچاس ہزار شعر ہیں۔ غالباً بعد کے لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں اضافہ

کر دیا ہے۔

مثنوی اور دیوان کے سوا نثر میں مولانا کی ایک کتاب فیہ مافیہ بھی موجود ہے، یہ مولانا کے اقوال کا مجموعہ یعنی آپ کے ملفوظات ہیں، یہ اقوال معین الدین پروانہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے گئے ہیں جو اپنے استاد کے حلقہ درس کے پروانے تھے۔ اس کتاب میں صوفیانہ مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا کے بعض مکتوبات اور مقالات بھی ملتے ہیں۔ ان سب میں وہی صوفیانہ نکات بیان کئے گئے ہیں جو تفصیل سے مثنوی میں آئے ہیں۔

مولانا جلال الدین نے پچھلے سات سو سالوں میں مغرب اور مشرق کے اذہان پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے۔ آپ کے پیروؤں اور ان کے مسلک کے ماننے والوں کی گنتی بے شمار ہے۔ آپ کا معنوی اور ادبی اثر نہ صرف ہندوستان اور ایشیائے کوچک میں اپنے عروج پر ہے بلکہ آپ کی شہرت مغربی ممالک میں بھی پھیل چکی ہے اور ان ملکوں کی مختلف زبانوں میں مثنوی کا ترجمہ ہو چکا ہے، مثنوی کی شرحیں بھی بہت لکھی گئی ہیں۔ ان میں کمال الدین خوارزمی کی فارسی شرح ایران میں، ترکی میں اسماعیل بن احمد کی شرح اور ہندوستان میں مولانا بحر العلوم کی شرح بہت مشہور ہے۔ مولانا نے ۵ رجمادی الآخرہ ۶۷۲ھ میں بمقام قونیہ وفات پائی اور اپنے والد کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

مولانا کے بعد آپ کا سلسلہ ہی مولویہ کہلانے لگا اور اس سلسلہ کے لوگوں نے طریقت کے ایک نئے مسلک کی طرح ڈالی۔ ترکی میں اس سلسلہ کے درویشوں کے رقص وسماع کی کسی زمانے میں خاصی شہرت تھی۔ کمالی دور کی آندھی نے ان درویشوں کو تتر بتر کر دیا اور حد یہ ہوئی کہ آپ کے مزار مبارک پہ تالے لگا دئے گئے۔ یہ آندھی جب ذرا تھمی تو حکومت نے آپ کے مزار کے بند دروازے پھر سے کھولے اور ٹکٹ کے ذریعہ "مولانا میوزم" میں داخلہ دیا جانے لگا۔ اب ٹکٹ کے ذریعہ ہزاروں امیر و غریب مرد و زن اندر جاتے اور

لحد مبارک پر فاتحہ پڑھ کر داخلِ حسنات ہوتے ہیں۔ ترکی میں مولانا کی ہمیشہ سے جو قدر و منزلت ہوئی اُس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ سلاطین آلِ عثمان کی تاج پوشی مولانا کے احفاد ہی کے ہاتھوں انجام پاتی تھی۔ مثنوی معنوی کا ترکی ترجمہ ہر گھر میں رہتا ہے۔ کلام پاک کے بعد اسی کتاب کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ اس وقت مولانا کی اولاد میں حضرت ولد چلپی سب سے معمر اور سب سے محترم بزرگ ہیں۔ افسوس ہے آج کل آپ بہت بیمار اور صاحبِ فراش ہیں۔

مولانا روم حضرت ابوبکرؓ کی اولاد میں ہیں اس لئے آپ نسلاً عرب ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد ایک مدت تک ایران میں رہے آپ نے ایران میں پرورش پائی اور فارسی میں اظہارِ خیال کیا، اس اعتبار سے آپ ایرانی ہیں۔ بلخ میں پیدا ہوئے اس لئے وطناً افغانی ہیں۔ قونیہ ہجرت کی وہاں سے اور وہیں وفات پائی اس اعتبار سے آپ ترکی ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ آپ اپنے عالمگیر پیام کے لحاظ سے کسی ایک قوم یا ایک ملک کی ملک نہیں بلکہ عالمی ہیں اور سارے عالم کو ان کی ذات پر فخر ہے۔

مولانا کے فرزند سلطان ولد جو بعد میں طریقت مولویہ کے پیشوا تھے خود بھی بہت بلند پایہ عارف اور شاعر ہوئے ہیں آپ نے تین مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور مثنوی ولدی یا ولد نامہ ہے۔ اس مثنوی میں آپ نے اپنے والد اور دوسرے اولیا، کے حالات بیان کئے ہیں اور صوفیانہ مطالب اور مقالات کی تفسیر کی ہے۔

سلطان ولد ترکی زبان سے واقف تھے اور ترکی میں شاعری بھی کی ہے۔ ترکی ادبیات پر ان کا اثر بہت گہرا ہے۔ ترکی میں فارسی ادبیات کا ذوق عام کرنے والے عوامل میں ایک عامل آپ کی ذات کو بھی سمجھنا چاہیے۔ آپ نے ۷۱۲ھ میں قونیہ ہی میں وفات پائی اور اپنے والد کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

مولانا جلال الدین کی شاعری کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ صوفیانہ عقاید کی شرح و تفصیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ فارسی شاعری میں شیخ سنائی نے صوفیانہ شاعری کا قوام تیار کیا شیخ عطار نے

اسے لطافت بخشی اور اسے شور و شوق کا مظہر بنایا اور مولانا جلال الدین نے اسے اوج کمال پر پہنچایا،
فارسی شاعری کے ایک ہزار سالہ کاروان پر نظر ڈالیے تو بے اختیار آپ کہہ اٹھیں گے کہ فردوسی
رزمیہ شاعری کا استاد ہے، خیام حکیمانہ رباعی کا بادشاہ ہے۔ انوری قصائد کا شہنشاہ ہے، نظامی
بزمیہ اور عشقیہ داستان بیان کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، سعدی اچھوتی نثر اور غزل کے
مالک ہیں، حافظ عرفانی غزل کے آقا اور مولانا جلال الدین عرفانی مثنوی کے سرتاج ہیں۔

مولانا جلال الدین نے اپنی مثنوی کا بیشتر حصہ املا کرایا ہے اور حسام الدین اسے ضبط تحریر میں
لاتے گئے ہیں۔ اس طرح چھ دفتر عالم وجود میں آئے ہیں۔ جن میں (۲۶) ہزار سے زیادہ اشعار ہیں
اس مثنوی میں آپ نے اپنی پوری قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے اور کمال یہ ہے کہ دوسرے شاعروں
کے برخلاف مولانا کی توجہ الفاظ کی زینت کی طرف بالکل نہیں رہی ہے یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے
مثنوی کا وزن بھی اپنے مقصد کی ادائی میں آسانی کے لئے اختیار کیا ہے۔ آپ کا اصل مقصود شاعری
میں کمال دکھانا نہیں بلکہ عرفانی مطالب کو بیان کرنا ہے، لیکن اس کے باوصف مثنوی شاعری
کا ایک نہایت درجہ پاکیزہ نمونہ ہے۔ اسی لئے تو آپ خود فرما گئے ہیں ؎

شعر گویم بہتر از شیر و نبات من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

معانی اور حقائق عرفانی کے بیان کا شوق مولانا پر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ لفظی آرائش،
بندش اور عروض و قوافی کی قیود پر آپ کی کچھ ایسی توجہ نہیں رہی ہے۔ چھبیس ہزار اشعار کے اس مجموعہ
میں ہمیں کچھ ایسے شعر بھی نظر آجاتے ہیں جو فصاحت لفظی، بندش الفاظ، ترکیبات اور قوافی کے
لحاظ سے کچھ ایسے جاذب اور دلکش نہیں۔ اسی حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے ؎

غیر نطق و غیر ایما و سجل ! صد ہزاراں ترجماں خیزد ز دل!

اور جہاں لطائف معارف بیان کرنے کے لئے آپ نے خیال پیدا کرنے کے قال کی قید کو اٹھا
دیا ہے وہاں قافیوں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہی ہے، فرماتے ہیں ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من ! گویدم مندیش جز دیدار من

حرف وصوت وگفت را برہم زنم   تاکہ بے ایں ہر سہ با تو دم زنم

صوفی شعرا کے لطائفِ سخن کے لئے عموماً اور مولانا کی تصانیف سمجھنے کے لئے خصوصاً اسلامی علوم سے گہری واقفیت، صفائے ضمیر، شوقِ معرفت اور ذوقِ وحدت کی صوفیانہ اصطلاحوں سے آگہی نہایت درجہ ضروری ہے۔ بس اسی صورت میں ان کی تصانیف پر سے راز کا پردہ اٹھ سکتا ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں مثنوی شریف کے مطالب وافکار کی شرح وتفصیل کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس کے لئے ضخیم سے ضخیم کتابیں بھی ناکافی ثابت ہوئی ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ دریا کو کوزے کے اندر سمائے تو کیسے سمائے ؎

گر بریزی بحر را در کوزۂ   چند گنجد قسمت یک روزۂ

اس لئے یہاں صرف چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں اور عاقل کے لئے اشارہ کافی ہے ؎

گر بگویم شرحِ ایں بے حد شود   مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

دنیا کی ہستی ایک ہے، اور وہ خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے سوا کوئی موجود نہیں جو کچھ ہے درحقیقت خود اسی کی ذات ہے اور تمام دنیا اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ہماری روح بھی اسی ہستی کی ایک شعاع ہے جو اپنے مبدء نور سے جدا ہو کر اس جہانِ ظاہر و کثرت وتعین میں آئی ہے۔ اسی لئے یہ اپنے دلدار کے شوق وعشق اور اس کے دیدار کی حسرت میں زندگی بسر کرتی ہے چاہتی ہے کہ جسم کے ظلماتی حجابات کو چاک کر کے اپنی اصل سے جا ملے۔ اس کے ہجر کے نالے ایسے ہی ہیں جیسے کہ نَے کو نیستاں سے کاٹ لینے کے بعد سنائی دیتے ہیں۔ ظاہر بینوں اور کوردلوں نے اپنے مبداء اصلی کو فراموش کر دیا ہے اور روح کی پکار کا جواب دینے سے معذور ہیں

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

ہر کسی کو دور ماند از اصلِ خویش   باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

من بہر جمعیتی نالاں شدم	جفتِ خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسی از ظنِ خود شد یارِ من	وز درونِ من نجست اسرارِ من
آتش است ایں بانگ نائی و نیست باد	ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
آتش عشقست کاندر نی فتاد	جوششِ عشقست کاندر مَی فتاد

وحدت کی یافت اور حقیقت کے ادراک کے لئے عشق سوزندہ چاہیئے کہ جس کی آگ تمام ہستی اور غرور جسمانی کو جلا کر خاکستر کر دے، فرماتے ہیں ؎

عشق ہائی کز پی رنگی بود	عشق نبود عاقبت ننگی بود
خام را جز آتش ہجر و فراق	کہ پزد کہ وارہاند از نفاق
چوں توئی تو ہنوز از تو نرفت	سوختنی باید تو را در نار تفت

جو ذات خداوندی کے عشق سے سرفراز ہو وہ بتوں کی، اوہام اور نقش ظاہری کی پرستش کیسے کر سکتا ہے ؎

عاشق تصویر و وہم خویشتن	کے بود از عاشقانِ ذوالمنن
عاشقِ آں وہم اگر صادق بود	آں مجازش تا حقیقت می کشد

عاشق صادق کو اپنے آپ سے گذر جانا چاہیئے، یعنی اپنی تمام خواہشوں اور اپنی ساری غرضوں کو ختم کر دینا چاہیئے، کیونکہ ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد | صد حجاب از دل بسوی دیدہ شد

اسے چاہیئے کہ خود پسندی اور جاہ طلبی کے غرور سے باز آئے، اپنے علم کے فریب سے بچے اور اپنی ذات یعنی شہوانی ذات کو درمیان سے اٹھا دے اور مر جائے تاکہ زندہ ہو سکے ورنہ جب تک وہ ظاہر پرستی کے چکر میں پڑا رہے گا وہ زندہ نہ ہو سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک نحوی جو قواعد نحو کے لحاظ سے دوسروں کو جاہل بتاتا تھا، ایک بار کشتی میں سوار ہوا، اس خود پرست نے کشتی بان سے پوچھا کہ تو نے کبھی نحو بھی پڑھی ہے۔ بیچارے

ملاح نے جواب دیا نہیں پڑھی، کہا تو نے اپنی آدھی عمر ضائع کی۔ ملاح چپ کا ہو رہا، تھوڑی دیر بعد کشتی گرداب میں جا پھنسی تو ملاح نے نحوی سے پوچھا آپ نے تیرنا بھی سیکھا ہے۔ جواب دیا نہیں۔ ملاح نے کہا افسوس تم نے پوری عمر ضائع کی۔ اب جانبازی کا وقت ہے، نحوی ہونے سے کچھ کام نہیں چلے گا، یہاں تو "محوی" کی ضرورت ہے۔ یعنی ایسے مردِ حقیقت پرست و شہوت کش کی ضرورت ہے جو گردابِ حوادث اور آزمائشِ زندگی سے اپنے آپ کو سلامت نکال لے جائے اور دوسروں کو بھی ان حوادث سے رہائی دلائے ؎

آن یکی نحوی بکشتی در نشست — رو بہ کشتیبان نہاد آن خود پرست
گفت ہیچ از نحو خواندی، گفت لا — گفت نیم عمرِ تو شد در فنا
دل شکستہ گشت کشتیبان ز تاب — لیک آن دم گشت خامش از جواب
باد کشتی را بگردابی فگند — گفت کشتیبان بدان نحوی بلند
ہیچ دانی آشنا کردن بگو! — گفت نی، از من تو سباحی مجو
گفت کل عمرت ای نحوی فناست — زانکہ کشتی غرق این گرداب ہاست
محو می باید نہ نحو اینجا بدان — گر تو محوی بے خطر در آب ران
آبِ دریا مردہ را بر سر نہد — در بود زندہ ز دریا کے رہد
چون بمردی تو ز اوصافِ بشر — بحرِ اسرارت نہد بر فرقِ سر
مردِ نحوی را ازاں در دوختیم — تا شمارا نحوِ محو آموختیم

صوفیا نے ظاہر پرستی، ریا اور خود فریبی کے خلاف جتنا جہاد کیا ہے، شاید ہی کسی اور گروہ نے اتنا جہاد کیا ہو۔ ان کی نظر میں ساری دنیا ایک حقیقت کی مظہر اور ایک مشیت کی جلوہ گاہ ہے اس لئے اختلافِ امم اور نسر زندانِ بنی آدم کی دشمنیاں ان کے جہل اور ان کے غرور کا نتیجہ ہیں۔ اس کی وجہ وہی ظاہر پرستی اور وہی ان کے غلط قیاسات ہیں۔ ان لوگوں کا حال بقال کی طوطی کا سا ہے جو بڑی خوش نوا اور خوش رنگ تھی اور باتیں بھی خوب کرتی تھی۔

ایک دن ایک بلی اس پر جھپٹی۔ جان بچانے کے لیے طوطی جو بھاگی تو اس کی ٹکر سے روغن بادام کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بقال نے روغن کا شیشہ جو ٹوٹا دیکھا تو مارے غصہ کے وہی شیشہ اٹھاکر طوطی کے سر پر دے مارا۔ بے چاری طوطی گنجی اور گونگی ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد اتفاق سے ایک گنجے پریشان حال درویش کا ادہر سے گذر ہوا اسے دیکھ کر طوطی کی قوت گویائی واپس آگئی اور اس نے آواز لگائی افسوس تونے بھی روغن بادام کا شیشہ توڑا، اسی لیے تو گنجہ بنا پھرتا ہے! نادان لوگ بھی طوطی کی طرح دوسروں کو اپنے آپ پر قیاس کرتے ہیں ؎

بود بقالی و اورا طوطئی ! خوش نوا و سبز و گویا طوطئی !

بر دکان بودی نگہبانِ دکان نکتہ گفتی با ہمہ سوداگراں !

در خطابِ آدمی ناطق بدی ! در نوای طوطیاں حاذق بدی

گربہ برجست ناگہ در دکان بہر موشی طوطیک از بیم جان

جست از صدرِ دکان سوئی گریخت شیشہ ہای روغنِ بادام ریخت

از سوی خانہ بیامد خواجہ اش بر دکان بنشست فارغ خواجہ وش

دید پر روغن دکان و جاش چرب بر سرش زد گشت طوطی کل زحرب

روزکی چندی سخن کوتاہ کرد ! مرد بقال از ندامت آہ کرد

ریش بر می کند و می گفت ای دریغ کافتابِ نعمتم شد زیرِ میغ

دستِ من بشکستہ بودی آن زمان چون زدم بر سرِ آن خوش زبان

ہدیہ ہا می داد ہر درویش را ! تا بیابد نطق مرغ خویش را

بعد سہ روز و سہ شب حیران و زار بر دکان بنشستہ بد نومید وار

می نمود آن مرغ را ہر گون شگفت تا کہ باشد کاندر آید او بگفت

جولقی سر برہنہ می گذشت با سری بی مو چو پشت طاس و طشت

طوطی اندر گفت آمد در زمان بانگ بر درویش زد کہ ہی فلان

از چہ اے گل باگلاں آمیختی	تو مگر از شیشہ روغن ریختی
از قیاسش خندہ آمد خلق را	کو چو خود پنداشت صاحب دلق را
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر	گرچہ باشد در نبشتن شیر شیر
جملہ عالم زین سبب گمراہ شد	کم کسی ز ابدال حق آگاہ شد

ہر جماعت کا یہی خیال ہے کہ اس کی فکر صالح ہے "کل حزب بما لدیہم فرحون"، انسانی گمراہی بس یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے اختلافات رونما ہوتے ہیں اور یہیں سے لڑائی جھگڑے کی ابتدا ہوتی ہے اس لطیف نکتہ کو مولانا نے عجیب دلنشین انداز میں بیان کر دیا ہے انسانیت کی نجات کے لئے ظاہر سے گذر کر حقیقت کا مشاہدہ ضروری ہے۔ لیکن حقیقت کو صرف حقیقت بین آنکھ ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی نظر حاصل کرنے کے لئے ریاضت، تہذیب نفس اور فضائل کا کسب لازمی ہے۔ ورنہ انسان سایہ کو حقیقت اور سراب کو آب سمجھنے لگے گا، نادان خیال کے پیچھے دوڑتے ہیں اور سایہ کو پکڑنا چاہتے ہیں اور حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے لیلیٰ کی دید کے لئے چشم مجنوں پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسی نکتہ کو مولانا اس مثل سے واضح کرتے ہیں کہ لیلیٰ کی محبت میں مجنوں کی دیوانگی کا شہرہ ہوا تو بادشاہ وقت نے لیلیٰ کو دیکھنا چاہا۔ لیلیٰ حاضر کی گئی تو ایک کالی کلوٹی سی عورت کو دیکھ کر اسے بڑی حیرانی ہوئی اس نے اس سے کہا تجھ میں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ تجھے دیکھ کر ایک اچھا خاصہ آدمی اپنے حواس کھو بیٹھے اور تیری محبت میں پاگل ہو جائے۔ لیلیٰ نے کہا تم مجنوں کہاں کہ میرے حسن کا نظارہ کر سکو۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی	کز تو مجنوں شد پریشان وغوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی	گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
ہر کہ بیدار است او در خواب تر	ہست بیداریش از خوابش بتر
خفتہ آں باشد کہ او از ہر خیال	دارد امید و کند با او مقال
مرغ بر بالا پران و سایہ اش	می دود بر خاک پراں مرغ وش

الٰہی صیاد آں سایہ شود	می دود چندان کہ بے مایہ شود
تیر اندازد بسوی سایہ او	ترکشش خالی شود در جست وجو

حقیقی بیداری کے لئے طاعت، عبادت، حق پرستی، تربیتِ نفس اور دردمندی لازمی ہے۔ ظاہر بین کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حق جوئی کا درد نہیں رکھتا ؎

ہر کہ او بیدار تر پر درد تر	ہر کہ او آگاہ تر رخ زرد تر

ظاہر ہے اس دردمندی اور ریاضت سے مقصد وظائفِ زندگی سے دست کشی بے معنی توکل اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا نہیں۔ اس دنیا میں اسباب وعلل کا پتہ لگانا چاہیئے تاکہ حیاتِ جاوید کے مقدمے یعنی اس حیات مستعارہ کے کام میں تعطل پیدا نہ ہونے پائے ؎

گفت پیغمبر بآوازِ بلند	با توکل زانوی اشتر ببند
رمزِ الکاسب حبیب اللہ شنو	از توکل در سبب کاہل مشو!
در توکل جہد کسب اولیٰ تر است	زانکہ در ضمن محبت مضمر است
گر توکل می کنی در کار کن!!	کشت کن پس تکیہ بر جبار کن

اس لئے درویشی اور عبادت الٰہی افلاس ونا داری، دریوزگی اور بے اسبابی کا نام نہیں بلکہ غرور وخود پرستی سے رہائی ہے اور ظاہر سے گذر کر خدا سے وابستہ ہوجانا ہے۔ مال دنیا وسیلہ ہے اور اسے جائز طور پر حاصل کرنا چاہیئے، انسان کو چاہیئے کہ خود مال پر مسلط رہے یہ نہ ہو کہ مال اس کی ذات پر مسلط ہوجائے اسی طرح خدا کے راستے میں زن وفرزند کاوٹ نہیں ہیں۔ درویشی استغنا اور بے نیازی کا نام ہے، احتیاج اور ناداری کا نہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن	نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
مال راکز بہرِ دیں باشی حمول!	نعم مال صالح خواندش رسول
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است	آب اندر زیر کشتی پشتی است

سچا صوفی ہر چیز کا مقصد اور اس کا محل جانتا ہے، وہ عالم باطن کے معنی، جہانِ ظاہر کا مطلب

اور اسباب و علل جاننے کی کوشش کرتا ہے، ایسی زندگی کا بیشتر حصہ خدمتِ خلق میں بسر کرتا ہے، امور میں تامل کرتا ہے اور آزمائش سے پہلے اپنے پیرو پیشوا کے آگے دم نہیں مارتا وہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا، کیونکہ بسیار گوئی اور دانش کا دعویٰ ناپختگی کی علامت ہے جو بات زبان سے نکل گئی گویا تیر ہے جو کمان سے نکل گیا، اس کے بعد پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

کودک اول چوں بزاید شیر نوش | مدتی خاموش باشد جملہ گوش
مدتی می بایدش لب دوختن | از سخن تا او سخن آموختن
نکتہ کاں جست ناگہ از زباں | ہم چو تیرے داں کہ جست از کماں
در نگردد از رہ آں تیر اے پسر | بند باید کرد سیلی را ز سر

پس تامل و خاموشی اختیار کرنا اور نصیحت سننا ہی عارفوں کا آئین ہے۔ کیونکہ بسیار گوئی، خود ستائی اور دانش فروشی صاحبِ دل عارف کا شعار نہیں۔ وہ دل کو زبان پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ دل خدا کی جلوہ گاہ ہے اور جب خدا کے سامنے بندہ کا تعلق عالم الفاظ سے گزر کر قلبی ہو جاتا ہے تو اس میں یگانگی اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر کا رنگ اور نیرنگی ناپید ہو جاتی ہے، کیونکہ آدمی کا جدال و قتال اس کی منافقی اور زبان بازی کا نتیجہ ہے ؎

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد | موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

دل اور دل جمعی کا راستہ وحدت ہے، یہی اقوام کو بے گانگی سے یگانگی سکھاتی ہے، زبان اور ظاہر سے یہ ممکن نہیں ؎

ای بسا ہندو و ترک ہم زباں! | اے بسا دو ترک چوں بے گانگاں
پس زبانِ ہم دلی خود دیگر است | ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

سرِ وحدت سے اتنی آشنائی اور عواملِ جمعیت سے اتنی آگاہی کہ انسان کثرات سے گذر کر جمع الجمع کے مقام پر پہونچ جائے بہت دشوار ہے۔ جب کسی کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ہر شخص کے آگے اس مقام کا راز بیان نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے لئے بڑی تربیت اور تہذیب

نفس کی ضرورت ہے۔ اسی لئے صوفیوں کو اہل راز کہا گیا ہے ؎

گفت پیغمبر کہ ہر کو سر نہفت زود باشد بامراد خویش جفت

دانہ چوں اندر زمیں پنہاں شود سرّ آں سر سبزیِ بستان شود

رازِ عرفانی کے افشا میں دو برائیاں ہیں، ایک تو اہل ظاہر اور بے مغز پوست پرستوں کی طرف سے اور دوسرے اپنے آپ کو عالم ظاہر کرنے والوں کی طرف سے یہ لوگ جدل کے زور پر استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک عقل قیاس نورِ عرفان سے منور نہ ہو جائے، لاکھ عقل سر پٹکے حق تک اس کی رسائی ممکن نہیں ؎

پای استدلالیاں چوبین بود! پای چوبیں سخت بے تمکین بود

یہی سرِّ عرفان اور رازِ ایمان ہے جو دیوان شمس تبریز میں شور انگیز غزلوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مثنوی میں حضرت شمس تبریز کا نام شاذ و نادر آیا ہے اور ان کی طرف نظر بالراست نہیں رہی ہے تو غزلیات میں راست شمس تبریز ہی پر دردوتاب اشعار کے مقصود و مخاطب ہیں۔ چند ایک غزلوں کے سوا ہر غزل اس (کے) نام پر ختم ہوتی ہے جو مولانا کا معشوق معنوی اور کعبۂ عرفانی تھا۔

غزلیات میں مولانا کی خاص خصوصیت وہ عاشقانہ جوش و خروش ہے جو ہر پڑھنے والے کے دل کو تڑپا اور اس کے احساسات کو گرما دیتا ہے۔ ہر غزل احساسات کی بھڑکتی ہوئی آگ اور جذب و حال کی زندہ تصویر ہے، اور بیشتر غزلیں روحِ سماع اور رقصِ عارفانہ سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سر تا سر شور و شوق، جوش و خروش اور سوزِ عشق کی آگ بھڑک رہی ہے۔ مولانا جلال الدین سے پہلے ایسا شوریدہ اور تڑپا دینے والا کلام شیخ عطار اور ان کے بعد سنائی کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ملتا۔ سوان شور انگیز غزلوں کا موضوع بھی وہی وصالِ حق اور وجود مطلق کا ادراک ہے اور ہر شعر سے ہجرانِ یار و عشقِ دلدار ہویدا ہے جس کے مظہر آپ کے پیر و مرشد حضرت شمس تبریز ہیں۔ یعنی اس پرجوش کلام سے تو نشاط اور

شوقِ دیدار ہویدا ہے تو کہیں ہجرانِ یار کا سوز و گداز، کہیں اس پیرِ معنوی کی مجلس کا وجد آفریں ساز اس پر چھیڑا جاتا ہے تو کہیں اس سے دوری اور اس کے فراق کا دل گداز نالہ بلند کیا جاتا ہے جذبات کی صداقت اور گہرائی نے کلام کو حد درجہ مؤثر بنا دیا ہے۔ ہر غزل کے دل آویز وزن ترنم اور جوشش و مادم سے روح کی آشفتگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ غزلیں ملاحظہ ہوں جن کے مطلع ہیں ؎

بیائید بیائید کہ گل زار دمیدست بیائید بیائید کہ دل دار رسیدست

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم دولتِ عشق آمدہ من دولت پایندہ شدم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عشق کی اس گیر و دار میں عارف کی سب سے بڑی پناہ گاہ دل کا کعبہ ہے اور وصالِ دوست کا قریب ترین راستہ دل کا راستہ ہے کیونکہ دل خدا کی جلوہ گاہ ہے، اسی لئے فرماتے ہیں ؎

طوافِ کعبۂ دل کن اگر دلی داری دلست کعبۂ معنی تو گل چہ پنداری

طوافِ کعبۂ صورت حقت ازاں فرمود کہ تا بواسطۂ آں دلی بدست آری

ہزار بار پیادہ طوافِ کعبہ کنی قبولِ حق نشود گر دلی بیازاری

ز عرش و کرسی و لوح و قلم فزوں باشد دلِ خراب کہ اورا بہ ہیچ نشماری

جو دل نہیں رکھتے اور صفائے درون سے محروم ہیں، خدا کی طلب میں نزدیک ترین راستہ گم کر کے دور کے راستے سے جاتے ہیں، یار کو گھر میں چھوڑ کر دنیا کے گرد گھومتے ہیں ؎

آنہا کہ طلب گارِ خدائید خدائید بیروں ز شما نیست کجائید کجائید

چیزی کہ نگردید گم از بہر چہ جوئید کس غیرِ شما نیست کجائید کجائید

در خانہ نشینید مگردید بہر کوی! زیرا کہ شما خانہ و ہم خانہ خدائید

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو آلودہ قلب رکھتے ہیں، جو حلال اور حرام میں فرق نہیں کرتے

جو کبھی حق کی تلاش میں ایک قدم نہیں اٹھاتے، جو عشق الٰہی سے محروم ہیں لیکن بظاہر نماز پڑھتے ہیں اور ظاہر پرستی کرتے ہیں بے دلوں کی نماز کی قیمت چند حرکات سے زیادہ نہیں تو پھر ایسے لوگوں کی نماز جو ریاکاری سے پڑھتے ہیں اور جو بظاہر زاہد اور باطن میں مردم آزار ہیں، کس شمار میں آسکتی ہے ؎

اگر نہ روی دل اندر برابرت دارم — من ایں نماز حسابِ نماز نشمارم
زعشق روی تو من رو بہ قبلہ آوردم — وگرنہ من زنماز وز قبلہ بیزارم
مراغرض زنماز آن بود کہ پنہانی — حدیث دردِ فراقِ تو با تو بگزارم
وگرنہ ایں چہ نمازی بود کہ من با تو — نشستہ روی بہ محراب دل بہ بازارم
نماز کن بصفت چوں فرشتہ ماندو من — ہنوز در صفتِ دیو و دد گرفتارم
کسیکہ جامہ بہ سگ بر زند نمازی نیست — نماز من بچہ ارزد کہ در بغل دارم
ازیں نماز نباشد بجز کہ آزارت — ہماں بہ آں کہ ترا بیش ازیں نیازارم
ازیں نماز ریائی چناں خجل شدہ ام — کہ در برابر رویت نظر نمی آرم
اشارتی کہ نمودی بہ شمس تبریزی — نظر بجانب ما کن غفور و غفارم

خلاصہ یہ کہ اس عارف کامل کے کلام کا موضوع وحدت پر نظر، رجوع بباطن ظاہرے اعراض، خلوص وصفا کی تعلیم، ظاہر پرستی اور ریاکاری و بیرونی نمائش سے گذر کر کشایش درون سے ربط، تحمل آفاق سے صرفِ نظر اور نورِ اشراق کے نظارہ کی دعوت ہے، کیسے والہانہ اور وجدانی انداز میں فرماگئے ہیں ؎

ما دل اندر راہ مردان باختیم — غلغلے اندر جہاں انداختیم
آتشی اندر دلِ خلقاں زدیم — شورشی در عاشقاں انداختیم
خرقہ و سجادہ و تسبیح را!! — در خراباتِ مغاں انداختیم
داشتیم بر پشتِ خود بارِ گراں — شکر کان بارِ گراں انداختیم

جبہ و دستار و علم و قیل و قال — جملہ در آب رواں انداختیم
از کمانِ شوق تیرِ معرفت — راستی سوی نشاں انداختیم
دست شستیم از ہمہ اسبابِ خود — آتش اندر خانماں انداختیم
دنیئ دون نزد دانا جیفہ است — جیفہ را پیشِ سگاں انداختیم
ما ز قرآں برگزیدہ مغز را — پوست را پیشِ خساں انداختیم
ما بساطِ عشرت و ذوق و صفا — در سرای لامکاں انداختیم
بہرِ عشق شمس تبریزی لقب — غلغلے در آسماں انداختیم

وحی الٰہی

(جدید ایڈیشن)

تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم اے

مسئلہ وحی پر ایک محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دلپذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے، جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق کتاب کاغذ نہایت اعلیٰ، کتابت نفیس طباعت عمدہ

صفحات ۳۰۰ قیمت سے مجلد للعہ

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرتِ قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از

(سعید احمد)

(۵)

اور یہ تو کوئی تنہا اسلام کی ہی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ملک میں ایک حکومت قائم ہوتی ہے۔ اُس کا دستور مرتب ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسب ضرورت اس دستور میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے اور حکومتِ وقت اسی کے مطابق عمل کرتی ہے اور ملک کے سب شہریوں کو بھی دستور کے اس اڈیشن پر ہی عمل کرنا ہوتا ہے جو اس کا آخری اڈیشن ہو۔ اور ان کو اسی حکومت کی وفاداری کرنی پڑتی ہے جو ان کے زمانہ میں آخری حکومت ہو۔ لیکن دستور کے آخری اڈیشن پر عمل کرنے اور آخری حکومت کی وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ اب سے پہلے کی جتنی حکومتیں تھیں وہ غلط اور باطل تھیں یا آخری اڈیشن سے قبل جو اڈیشن تھے وہ لغو اور بے کار تھے۔

مسئلہ زیر بحث سے متعلق اسلام کے اصل نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے بعد اب آئیے ذرا ان دلائل کا بھی جائزہ لے لیجئے جو جناب مصنف نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔

اس سلسلہ میں آپ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وما محمدٌ الا رسولٌ قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ویسے رسول ہیں جیسے رسول پہلے گذر چکے ہیں۔ اگر وہ مر جاتے یا قتل ہو جاتے تو کیا

انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین۔

تم دین اللہ سے پھر جاتے؟ بہرحال اگر کوئی پھر جاتا تو اللہ تعالےٰ کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور جو شکر گذار (مومن بالشہ) ہیں انہیں اللہ جزا دیگا۔

پروفیسر صاحب یہ آیت اور اس کا مندرجہ بالا ترجمہ لکھنے کے بعد دو سوال قائم کرتے ہیں اور ان کے جواب میں اسی ترتیب سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام غزوۂ احد سے پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت کی جو تعلیم تھی وہ وہی تھی جو دوسرے رسول دے چکے تھے! ان دونوں مقدمات کا گویا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بس بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر نازل ہوتا رہا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ یہ دونوں باتیں اور یہ تنقیحات ونتائج کس درجہ کمزور ہیں اور قرآن مجید اگر یہ کہتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو جاتی تو کیا تم پھر جاتے تو اس کا مطلب یہ کیونکر ہوا کہ غزوۂ احد سے پہلے اسلام کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی!! اگر ایک حکومت کا بادشاہ اپنی رعایا سے کہے کہ اگر میں اس جنگ میں مارا جاتا تو کیا تم حکومت کے باغی ہو جاتے، تو کیا اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ بس بادشاہ کی حکومت ختم ہو گئی اور اب اس کے بعد وہ جتنے دن بھی زندہ رہے گا واجب الاطاعت نہیں ہوگا! اور اس جنگ میں شرکت کے بعد جو فرامین بھی شائع کرے گا ان کی سند نہیں ہوگی۔ افسوس ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہ لکھ کر فن بلاغت اور اسالیب کلام سے بیخبری کا بڑا افسوسناک ثبوت دیا ہے۔ قرآن اس موقع پر کہنا یہ چاہتا ہے کہ تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو پیغام دیا گیا ہے تمہیں بہرحال اس کا دھیان رکھنا اور اس کا اتباع کرنا ہے۔ خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود دنیا میں تشریف فرما رہیں یا نہ رہیں اور دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی دنیا میں آتے ہیں اور اپنی اپنی مدت حیات پوری کر کے چلے جاتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آج (غزوۂ احد میں) نہ سہی ایک نہ ایک دن دنیا سے تشریف لے جائیں گے تو کیا تم لوگ آپ کی وفات کے بعد اس پیغام کو بھول جاؤ گے جو آپ لائے ہیں اور ان تعلیمات کو پس پشت ڈالدو گے جو آپ نے تم کو دی ہیں؟ بس صرف یہ مطلب اور یہ ماسیق لہ الکلام ہے اس آیت کا! اس سے یہ کہاں نکلا کہ اسلام غزوۂ احد پر ختم ہو چکا اور اس بنا پر غزوۂ احد سے

بعد کی جو تعلیمات نبوی ہیں وہ واجب العمل نہیں یا کم از کم اسلام کے خط و خال نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اُن کا کیا مطلب ہے ؟ کیا اُن کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطاع اور واجب الاطاعت ہیں مگر صرف غزوۂ اُحد سے پہلے تک کی زندگی میں اور اس کے بعد نہیں۔ اگر دوسری صورت کو مانا جائے تو پھر صرف آنحضرتؐ کا سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ غزوۂ اُحد کے بعد جتنا قرآن نازل ہوا ہے وہ بھی کتاب الٰہی نہیں رہتا اور اُس کا اتباع ضروری نہیں ہوتا اور ہاں غزوۂ اُحد کا کیا ذکر ہمارے فاضل دوست کے نزدیک تو شعب ابی طالب ۳ھ میں اور یہ بھی نہیں بلکہ غارِ حرا کی پہلی وحی ہی میں اسلام آچکا تھا! (ملاحظہ فرمائیے ص ۳۳ - ۳۴) اب

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

رہی دوسری بات یعنی یہ کہ مذکورہ بالا آیت میں قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سے یہ سمجھنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہی تھی جو پہلے رسول دے چکے تھے!" تو ہم گذشتہ صفحات میں اس پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آنحضرتؐ کی تعلیم کلاً وجزءً وہی تھی جو پہلے رسول دے چکے تھے تو اس سے تضاد لازم آتا ہے اور اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دنیا میں ایک معمولی سے معمولی قانون کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس میں قطعیت اور پختگی ہو۔ لیکن صرف ایک "خدا پرستی" کا قانون ایسا ہے جو قانون کی اس عام خصوصیت سے محروم ہے۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو تو یہ بھی درست۔ کعبہ کی طرف مڑ جاؤ یہ بھی صحیح! کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے چند بول بول لو تو یہ بھی نماز اور کسی مندر میں جا کر سنکھ بجاؤ تو یہ بھی نماز۔ اور ہاتھ باندھ کر کھڑے رہو اور رکوع و سجود کرو تو یہ بھی نماز۔ شراب پینا حرام بھی اور حلال بھی۔ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کرنا جائز اور ناجائز۔ ذرا سوچئے تو یہ مذہب کیا ہوا بچوں کا کھلونا ہو گیا! جب سب چیزیں بیک وقت جائز بھی اور ناجائز بھی! اگر واقعی خدا پرستی اور مذہب اسی کا نام ہے تو اس مذہب سے لا مذہبیت اچھی! وفاداری بشرطِ استواری عین ایمان ہے۔ اور اگر یہی اسلام ہے! تو کون مسلمان یہ کہے گا کہ

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

اتنا لکھنے کے بعد خود پروفیسر صاحب کو یہ خیال ہوا اگر اسلام واقعی اُن کے بقول غارِ حرا کی پہلی وحی میں

پورا ہو چکا تھا تو پھر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ الآیۃ کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال قائم کرنے کے بعد وہ خود اس کا جواب یہ دیتے ہیں "ظاہر ہے لکم سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین قدیم یعنی اسلام کے ماننے والے تھے"۔
اب سوال یہ ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ لکم سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو پہلے سے کسی نبی پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور یہ اسلام کے نئے ماننے والے تھے یا بالفاظ دیگر یہ لوگ پہلے مشرک تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے اس کے علاوہ دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ دین جس کے ماننے کا حکم اسلام دیتا ہے کوئی ایک دین ہے یا کئی مختلف دین ہیں۔ اگر ایک ہی دین ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ اکمالِ دین کی بشارت دین کے نئے ماننے والوں کو دی جاتی ہے اور پرانے ماننے والوں کو نہیں۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک اہل کتاب کا۔ اور ایک نئے لوگوں کا! اول الذکر کا دین پہلے سے مکمل ہے اور موخر الذکر کے دین کو اب الیوم اکملت لکم کہہ کر مکمل کیا جا رہا ہے اور اگر دین ایک نہیں بلکہ دو یا دو سے زیادہ ہی ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ اسلام کس دین کا نام ہے، ظاہر ہے کہ وہ کسی ایک دین کا ہی نام ہو سکتا ہے۔ ہر ایک دین کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ پس اگر اہل کتاب کا دین اسلام ہے تو نئے مسلمان ہونے والوں کا دین غیر اسلام ہوا۔ حالانکہ پروفیسر صاحب کی تفسیر کے مطابق قرآن مجید ان نئے مسلمانوں کے دین کو بھی وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کہہ کر اسلام ہی کہہ رہا ہے اور اگر اسلام یہی دین ہوا تو پھر ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے دین کو اسلام نہیں کہیں گے۔

دوسری بڑی دلیل پروفیسر صاحب کی قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا۔ الآیۃ

آپ کہہ دیجئے کہ اے کتاب والو آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے یعنی یہ کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانیں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلام کی تعلیم دی ہے وہ بس وہی ہے جس کو آیۃ مذکورہ بالا میں "کلمۃ سواء" سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے

تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب جس دین کو مانتے چلے آرہے تھے اس میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلام پیش فرمارہے ہیں اس میں ایک کلمہ مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب بھی توحید کے قائل ہیں۔ اور اسلام بھی یہ ہی کہتا ہے لیکن اسلام بس فقط یہ ہی ہے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا۔!!

اب ہم تبصرہ ختم کرتے ہیں لیکن آخر میں یہ اور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کے خیال میں چونکہ قرآن مجید اب تک ترتیب نزولی کے مطابق مدون نہیں کیا گیا یا کم از کم اس کی ترتیب نزولی کی روشنی میں اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا اس بنا پر قرآن کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا ہے اور فہم قرآن کی راہ میں طرح طرح کی دشواریاں اور مشکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی قرآن جمع تو ہوگیا تھا مگر آنحضرتؐ نے اس کی مختلف سورتوں کی ترتیب کو نہیں بتایا تھا" (ص ۲۵) صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث و روایات سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرتؐ کے عہد میں ہوگئی تھی۔ چنانچہ سنن ترمذی میں ہے کہ جب آیات نازل ہوتی تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں رکھو۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ہوگئی تھی اور وہ ترتیب آپ کی نظر سے گذر چکی تھی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر موجودہ ترتیب سے فہم قرآن میں غلطیاں واقع ہوتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے خود اس کو ترتیب نزولی کے مطابق کیوں مرتب نہیں کرایا!!

علاوہ بریں پروفیسر صاحب کو یہ معلوم ہوگا کہ کسی دستور میں اگرچہ کسی ایک دفعہ کا اضافہ بعض خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے لیکن جب وہ دفعہ قانون یا دستور کا جز بنجاتی ہے تو اب اس کا حکم عام ہوتا ہے اور وہ شان نزول کے ساتھ مخصوص نہیں رہتی اگرچہ اس دفعہ کی اسپرٹ کیا ہے؟ اس کا پتہ اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ اس دفعہ کا شان نزول معلوم نہ ہو۔ اس بنا پر قرآن مجید کی آیات کو تاریخی ترتیب نزولی کی روشنی میں مطالعہ کرنا ان آیات کی اسپرٹ معلوم کرنے کے لئے تو ضروری ہے لیکن جہاں تک اُن احکام کا تعلق ہے جو ان آیات سے نکلتے ہیں ان کے لئے ترتیب نزولی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

مشرقی افریقہ کا علاقہ (کینیا)

اور

"ماؤ ماؤ" تحریک

(اس مضمون کی تیاری میں "رسالہ الہلال" (مصر) مجریہ جولائی ۱۹۵۳ء سے استفادہ کیا گیا)

از مولانا محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم اے)

آج کل "ماؤ ماؤ" تحریک کے سلسلہ میں انگریزی نوآبادی یا برطانی مقبوضہ علاقہ "کینیا" منظرِ عام پر آگیا ہے۔ جس کے متعلق روزنامہ اہم خبریں اخبارات میں آرہی ہیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ عام معلومات کے لئے کینیا کی جغرافیائی حیثیت کو اجمالاً اور وہاں کی تحریک آزادی کی تاریخ کو نسبتاً تفصیل سے لکھدوں تاکہ اس تحریک کی اجمالی حقیقت سے کماحقہ آگاہی ہو جائے۔

مشرقی افریقہ میں علاقہ کینیا "خط استوا" کے جنوب میں (۱۰) درجہ پر واقع ہے۔ جس کے مشرق میں بحر ہند اور اس کا ساحل "ممباسا" ہے "ممباسا" کے جنوب میں جزیرہ "زنجبار" ہے شمال مشرق میں اٹلی کا سومالی لینڈ شمال میں سلطنت حبش اور شمال مغرب میں سوڈان اور مغرب میں یوگنڈا اور "بحیرہ وکٹوریا" ہے۔ اس کے مغرب میں بلجیم کا علاقہ "کنگو" ہے۔ کینیا کا پایہ تخت "نیروبی" گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کا مجموعہ ہے۔ جنوب میں ہے اور اس کے جنوب مغرب میں "ٹنگانیکا" کا علاقہ ہے۔ اس طرح سے یہ علاقہ مختلف حکومتوں کی نوآبادیوں اور مختلف سلطنتوں کی حدود سے گھرا ہوا ہے جو برطانوی مشرقی افریقہ کے وسط میں ہے۔

بہرحال مشرقی افریقہ کا یہ وہ وحشی اور وحشت ناک علاقہ ہے جو اب برطانوی تسلط سے بہ قیمت دقربانی چھٹکارا چاہتا ہے۔ اسی کوشش آزادی یا آزادی پسندی کا نام "ماؤ ماؤ" تحریک ہے۔

وہ برطانوی یا سفید فام جماعت جواب تک آرام وسکون کی زندگی بسر کرتے ہوئے وہاں کے وحشی یا نیم وحشی سیاہ فام قوم پر حکمرانی کر رہی تھی وہ اب آئے دن کے خطرات سے دوچار ہے۔

اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ "کینیا" کی نوآبادی کے علاقہ "کیکو یولینڈ" میں جو یورپین رہتے ہیں ان کی تعداد تقریباً ساڑھے بارہ لاکھ ہے گویا وہاں کے اصلی باشندوں کے مقابلہ میں ان کی آبادی ایک چوتھائی ہے باوجود اتنی بڑی آبادی کے بقول ایک انگریز کے کہ :۔

"رات دن میں ایک لحظ کے لئے بھی ہم میں سے کوئی بھی اپنی جانوں اور جائداد کی طرف سے مطمئن نہیں ہے"

اس علاقہ کے اکثر باشندگان اب تک وہی وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ البتہ چند ایسے ہیں۔ وہ بھی پایہ تخت بیرونی ہیں۔ جو فرنگی لباس پہن کر گھوڑ دوڑ وغیرہ کے میدانوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے یا تو گھریلو اور ہوٹلوں کے ملازم ہیں۔ جیسے بہرے و خانساماں وغیرہ یا ٹیکسیوں (کرایہ کے موٹروں) کے ڈرائیور ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے "ماؤ ماؤ" انجمن کی بنیاد ڈالی جو اس سے پہلے ایک خفیہ انجمن تھی اس انجمن کی غرض وغایت ہی صرف یہ تھی اور ہے کہ اپنے ملک سے فرنگیوں کو جس طریقہ سے ہوسکے نکال دے۔ یہ تحریک اس تیزی سے بڑھی کہ ملک کے بیشتر افراد اس کے ممبر ہو گئے حتیٰ کہ عورتوں نے بھی ممبر بن کر اس تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا

اس تحریک کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اس سے قبل دو انجمنیں قریب قریب ایک ہی مقصد کے لئے قائم کی گئیں۔ چنانچہ ایک جماعت میں وہ انتہا پسند اراکین تھے جن کی رہنمائی ایک ایسے مجنون کے ہاتھ میں تھی جو یہ پرچار کیا کرتا کہ یوروپین کو یا تو نکال دو یا ختم کر دو یہ پرچار ایسا نہ تھا کہ حکومت بطور تماشائی دیکھتے رہتے، چنانچہ حکومت نے انسدادی تدابیر اختیار کیں نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت اور پولیس میں ایک ایسا ہولناک تصادم ہوا کہ اس میں صدر انجمن اور (۱۲) اراکین کام آ گئے اور اس طرح حکومت کے نزدیک گویا وہ انجمن مع اپنے اغراض ومقاصد کے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

اب یہی دوسری انجمن جس کی غرض تو یہی تھی مگر تنظیم بدلی ہوئی تھی۔ اس کے صدر نے گو صاف طور پر تو نبوت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن یہ دعویٰ کیا کہ وہ خدا کی طرف سے صرف اس کام کے لئے بھیجا گیا ہے کہ۔

"وہ اپنے ملک کو انگریزوں کی لعنت سے نجات دلا دے"

سرخ کوٹ اور سرخ ہیٹ (انگریزی ٹوپی) سے ملبوس ہو کر وہ ہم وطنوں میں پھرتا اور اپنی بعثت کی بشارت دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے ایک روز ایک پولیس افسر کو ذبح کیا اور اس کے خون سے اپنے مددگاروں کے کپڑوں کو داغدار بنا کر یہ تلقین کی کہ:۔

"اگر یہ یوروپین ملک کو نہ چھوڑیں تو اسی طرح سے ان کے خون سے ہولی کھیلو"

قریب تھا کہ یہ تشدد آمیز تحریک مزید خطرات پیدا کرے کہ اسی قتل کی پاداش میں حکومت نے اس خودساختہ "مبعوث" یا نام نہاد "نبی" کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی۔ چنانچہ یہ دوسری تحریک بھی حکومت کے نزدیک دب گئی۔

ان دونوں تحریکوں کے گویا فنا ہونے کے بعد "ماؤ ماؤ" تحریک نے ۱۹۴۸ء میں یا اس کے بعد جنم لیا جس نے یوروپین دشمنی کو اپنا مسلک بنا کر ان فناشدہ دونوں جماعتوں کا انتقام لینے کا گویا اعلان کیا اور انگریزی دینی تعلیم کی طرف سے باشندگانِ ملک کو جن میں سے بعض اس تعلیم سے عیسائی بھی ہو چکے تھے منحرف کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کیا کہ:۔

"مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) تو انگریز تھے۔ اس لئے وہ نبی یا رسول نہیں ہو سکتے تھے"

اس کے ساتھ ہی عام جلسوں کو منعقد کر کے مقررین لوگوں کو یہ سمجھاتے تھے کہ یہ سفید فام اپنے ذاتی نفع کی خاطر سیہ فام قوم پر تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ غرضکہ اسی قسم کی باتیں کر کے اپنی قوم کے افراد کو اس تحریک میں شرکت کی نہ صرف دعوت دیتے تھے۔ بلکہ بصورت انکار یا اعراض ان کو انتقام کی دھمکیاں بھی دیتے تھے۔

تحریک کے مبادی یا اغراض و مقاصد کچھ ہوں جس کے آغاز و انجام کا سمجھنا انسان کے لئے ذرا مشکل ضرور ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک ملک کی معاشی پستی کی پیداوار ہے کیونکہ دنیا کی اس آخری لڑائی کے بعد "کیکو یولینڈ" کے بیشتر قبائل کے افراد جب معاش سے تنگ ہوئے تو وہ جوق جوق ترکِ وطن کر کے "نیروبی" میں آکر بسنے لگے تاکہ حصولِ معاش میں ان کو آسانی ہو کیونکہ نہ صرف ان بنجر اور قحط زدہ علاقوں میں معاش کا فقدان تھا بلکہ نوجوان لوگ پایہ تخت کی بڑھتی ہوئی رونق پذیر صنعت میں داخل ہو کر بہتر زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے۔ بہر حال یہ فطرت کا ایسا تقاضا تھا جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی غور طلب مسئلہ تھا اور ہے کہ آیا پایہ تخت کی صنعت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو ان تمام تارکینِ وطن کو جذب بھی کر سکتی تھی یا نہیں اور اس طرح ان کی معاشی حالت سدھر بھی سکتی تھی بہر حال یہاں آنے کے بعد جب انھوں نے صنعت کا دروازہ بند پایا تو ان کے لئے سوائے لوٹ مار کے کوئی راستہ نہ تھا چنانچہ انھوں نے اس کام کے لئے جماعتیں بنائیں تاکہ وہ ان یوروپین کو لوٹیں جو عیش و راحت کی زندگی گزار رہے تھے مرکزی حکومت نے اس عام ترکِ وطن کے خطرات کو نہ تو بروقت محسوس کر کے اس کے انسداد کی تدابیر کیں اور نہ پہلے کے تارکینِ وطن پر سخت نگرانی رکھی۔

اس سیاسی معاشی خلفشار کے زمانہ میں انھیں قبائل کا ایک سیاسی لیڈر جو "کینیتا" (غالباً روس سے واپس آگیا جو کینیا میں اب زیر حراست ہے اور جس کے مقدمہ پر دنیائے قانون کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں) ان فاقہ کش تارکینِ وطن کی تنظیم میں مشغول ہو گیا جلسے کر کے اس نے لوگوں سے انجمن کے اصول پر چلنے کا حلف لینا شروع کیا پولیس سے عدم تعاون اور یوروپین سے نجات حاصل کرنا اس اصول کی بنیاد تھی۔ اب تک یہ انجمن ایک حد تک خفیہ کام کر رہی تھی مگر یہ وہ کھلا ہوا راز تھا جس سے مقامی ذمہ دار حکام ناواقف نہیں ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے اس کے خطرناک نتائج کو محسوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ یہ انجمن نہ صرف طاقتور ہو گئی بلکہ اس کی شاخیں سارے ملک میں پھیل گئیں اور اس کا ایسا منظم جال تقریباً تمام ملک میں پھیل گیا کہ پولس انسدادی تدابیر کی کوششوں میں ناکام رہی۔ اب یہ حالت

ہوگئی کہ اگر کوئی واقعہ پیش آتا تو اس کے ثبوت کے لئے پولس کو کوئی گواہ ہی نہیں ملتا تھا دن دہاڑے قتل کی واردات ہوتی لیکن کوئی شخص گواہی دینے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ یوروپین مالکان زراعت کے مکانوں کی دیواروں پر جلی قلم سے لکھا ہوتا کہ:۔

"روانگی یا موت"

بہرحال اس قسم کے قتل کی وارداتیں مسلسل ہونے لگیں لیکن پولس قاتل یا قاتلین کے پتہ چلانے سے قاصر رہنے لگی اور کیوں نہ ہوتی کیونکہ مقامی لوگ تفتیشی سختیوں کو برداشت کرتے تھے لیکن واردات سے لاعلمی ظاہر کرتے تھے وہ اہل ملک جو انگریزوں اور ارباب حکومت سے تعاون کرتے تھے وہ بھی اس جماعت کی زد سے محفوظ نہیں تھے۔ وہاں کا ایک مقامی لیڈر جو حکومت کا معاون تھا اور جس کو اہل ملک نے "افریقہ کا چرچل" نام دیدیا تھا۔ باوجود پولس کی حفاظت کے انتہائی بے رحمی سے قتل کردیا گیا لیکن باوجود انتھک کوششوں کے پولس قاتل کے پتہ چلانے میں کامیاب نہ ہوئی۔

پولس کے ایک مقامی جاسوس نے ایک بار انجمن کے اراکین کی میٹنگ کی اطلاع پولس کو کردی اسی روز رات کو وہ خبررساں کو گھر سے اٹھالے گئے اور ایک کافی آباد گاؤں میں اس کو لے جاکر مجمع کے سامنے اس کو سزا کا حکم سنایا سب سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اس کے بعد بستی والوں سے کہا گیا کہ اپنے اپنے کدالوں سے اس کے تکے بوٹی کریں۔ چنانچہ یہ حکم فوراً نافذ ہوا پولس دوسرے روز اس گاؤں میں پہنچی اس نے سب سے اس واردات کے متعلق دریافت کیا لیکن سب نے متفقہ طور پر یہی کہا کہ:۔

"ہم کو اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہے"

تنظیم ماؤ ماؤ "جماعت ماؤ ماؤ" کو ان لوگوں نے کافی منظم کیا ہے جس کے چار بڑے مرکز ہیں اور جو مقامی لیڈروں کی نگرانی میں ہیں ان کی تعداد باوجود گرفتاریوں کے اب بھی کافی زیادہ ہے اور روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ انجمن کی ممبری کی فیس (۶۲) شلنگ (تقریباً ۵۰ روپیہ) ہے جن کو یا تو یکمشت ادا کیا جاتا ہے اور یا باقساط ادائگی ہوتی ہے۔ قسطوں کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ مقامی لیڈر اس فیس میں سے ½

تہائی اپنے لئے رکھ لیتا ہے اور باقی رقم مرکز کو بھیجدیا کرتا ہے اس مالی تنظیم سے مرکز اور لیڈر دونوں مستفید ہوتے ہوئے نہایت کامیابی سے اپنے مشن کو چلا رہے ہیں۔

"ماؤ ماؤ" کی کامیابی کا راز سب سے بڑا یہ ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ پورے ملک میں بہت زیادہ گھنے جنگل اور پہاڑ ہیں۔ جو ایسی پناہ گاہیں ہیں جہاں سے یہ اراکینِ جمعیت وقت مناسب پر نکل کر واردات کر جاتے ہیں اور پھر وہیں چلے جاتے ہیں۔ پولس نہ وہاں جاکر تفتیش کرسکتی ہے اور نہ ان کا پتہ چلاسکتی ہے۔ صرف اسی قسم کی وارداتیں نہیں ہیں جو جنگلوں کے آس پاس کی آبادیوں تک محدود ہوں فی الحقیقت اس انجمن کے دائرۂ عمل نے اہل شہر کی یوروپین زندگی کو نہ صرف تلخ کر دیا ہے بلکہ سخت خطرہ میں ڈال دیا ہے شہری آبادی مقامی ملازموں سے بے نیاز نہیں ہوسکتی ہے جن کی اکثریت اس انجمن کی ممبر ہے جو کم از کم یہی کیتے ہیں کہ وہ ضروری خبریں مرکزوں کو دیتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شام کو کوئی یوروپین حسب عادت۔ اب شہر کے نواح یا سمندر کے کنارے پر نہیں جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے فارم سے دن کو بھی اپنے مکان تک وہ بغیر محافظ کے نہیں آسکتے اور کسان جو مقامی ہوتے ہیں مگر وہ کسی نہ کسی فارم کے مالک یوروپین کے ملازم ہوتے ہیں۔ نیز یوروپین اپنی عورتوں کو اس فارم میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے اور اب تو بیشتر کسان یا تو جیل خانوں میں ہیں، یا اپنا کام چھوڑ کر انھیں باغیوں کے ساتھ شریک ہوگئے ہیں۔

غرضکہ نہ رات خطرہ سے خالی ہے نہ دن فرنگیوں کے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں سلاخدار کواڑوں سے بند رہتے ہیں اور جیسا کہ ان کا دستور تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ یا تو اپنے پائیں باغ میں بیٹھ کر کافی پیتے تھے یا اوپر کے چھجے پر جو پائیں باغ کے طرف ہی ہوتا ہے۔ لیکن ان خطرات نے ان کو اب گھریلو تفریحات سے بھی محروم کر دیا۔ حکومت نے انسدادی کارروائیوں کے علاوہ ایک اور تدبیر بھی نکالی ہے "تاکہ باشندگانِ ملک اس انجمن سے الگ ہوجائیں۔

یعنی حکومت نے تشددی کارروائیوں کے علاوہ قبائلی "طبیبوں" سے کام لینا شروع کیا ہے جن کا قبائل کے افراد پر کافی اثر ہے۔ تاکہ وہ اس انجمن سے کنارہ کش ہوکر اس کے اثر سے

آزاد ہو جائیں وہ لوگ شہروں اور گاؤں کی آبادیوں میں "ہاتھی کی ریڑھ کی ہڈی" لے کر جس کو وہ "سنگ موت" کہتے ہیں۔ پھرتے ہیں اس پر چند تعویذ بھی ہوتے ہیں۔ وہ طبیب اپنے ہم وطنوں سے کہا کرتے ہیں کہ بس اس کے چھو لینے کے بعد انسان تمام ان خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جس کی دھمکیاں "ماؤ ماؤ" کی طرف سے دی جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ نسخہ بھی کامیاب نہ ہوا اور باشندگانِ ملک نے انجمن کا یا انجمن نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اس تخریبی اور مہلکانہ تحریک کے نتیجہ کے متعلق سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ "قوت" اور "وحشیانہ اعمال" یا "وحشت" کا مقابلہ ہے۔ العلم عند اللہ

ادبیات

بلالؓ

از

(جناب الم مظفر نگری)

فسانۂ غمِ اُلفت ہے داستاں تیری　　فغانِ عشق کی تفسیر تھی اذاں تیری
تھے اشکِ سُرخ شب و روز زینتِ مژگاں　　جگر فروش تھی ہر کاوشِ نہاں تیری
باشتیاق اُٹھایا ہر ایک بارِ جفا　　رہی رازدانِ خودی ہمتِ جواں تیری
ہوا جمالِ نہاں نیرِ زینتِ شبِ قدر　　بنی فروغِ سحر ظلمتِ عیاں تیری
ہر ایک لفظ میں وقتِ اذاں تھا کیفِ ازل　　جوابِ کوثر و تسنیم تھی اذاں تیری
فروغِ شوق تھا نظارۂ جمالِ حبیب　　نگاہ ہوتی نہ کیوں عرش آشیاں تیری
سرِ نیاز رہا وقفِ آستانِ جمال　　گئی نہ جراتِ مستانہ رائگاں تیری
تجھے مذاقِ وفا نے سکوں تو بخشا تھا　　مگر تھی تشنۂ غمِ روحِ شادماں تیری
کلیم شعلۂ در پردہ بھی نہ دیکھ سکے　　حریفِ جلوہ رہی چشمِ ناتواں تیری
اسے بھی طوفِ مدینہ کا شوق ہے شاید　　جبھی تو کرتا ہے تقلید آسماں تیری
شعور رکھتی ہے آزادی و غلامی کا　　وہ قوم جو کہ ہے دُنیا میں ازداں تیری

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

غزل

(جناب شارق میرٹھی ایم اے)

میری نگاہِ شوق کا جانے کہاں مقام ہے
عرش پہ آکے بھی مجھے حوصلۂ خرام ہے

بادِ خزاں کا یہ پیام موسمِ گل کے نام ہے
گردشِ صبح و شام پھر گردشِ صبح و شام ہے

عشق کی جو خلش بھی ہے اک خلشِ دوام ہے
یہ نہ سمجھ کہ تیرے بعد کارِ وفا تمام ہے

عشق کی بیخودی کو کیا کیف شراب سے غرض
تیرے تباہ حال کو تیری نظر سے کام ہے

رفعتِ ماہ سے اُدھر انجم و کہکشاں سے دور
تجھ کو خبر نہیں ابھی تیرا کہاں مقام ہے

زندگی اس کی زندگی بیخودی اس کی بیخودی
جو ہے خرد سے دور دور جس کو جنوں سے کام ہے

اے مرے درد آشنا کیا تجھے یہ نہیں پتہ
راہِ طلب میں جو مٹا اس کے لئے دوام ہے

حدِ نظر سے دور دور عالم دل کے پاس پاس
تیرا پتہ تو مل گیا، میرا کہاں مقام ہے

تیری نگاہ پھرتے ہی رنگ جہاں بدل گیا
اب نہ وہ پہلی صبح ہے اب نہ وہ پہلی شام ہے

مٹ نہ سکے گی عمر بھر قلب و نگاہ کی خلش
عشق تمام کا تمام سوزشِ ناتمام ہے

شارقِ غم نواز کا توڑ کے اس نے دل کہا
سن اسے غور سے کہ یہ سازِ شکست جام ہے

شئونِ علمیہ

تجربہ خانہ ایڈیسن

امریکہ کے مشہور موجد ٹامس الوا ایڈیسن نے ۷۷ برس ادھر ایک تجربہ خانہ قائم کیا تھا۔ یہ تجربہ خانہ امریکہ کے ضلع نیوجرسی میں بمقام ویسٹ آرینج میں آج بھی قائم ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جو نوجوان سائنسداں بننا چاہتے ہیں ان کو پورا موقع اس مقصد کی تکمیل کا ملنا چاہیے اس کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ تجربہ خانہ کے ماہر سائنس دانوں اور انجنیروں کے تحت نوجوانوں کو مطالعہ اور کام کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔

شرط یہ ہے کہ طالب علم نے ثانوی درجہ کی تعلیم امتیاز کے ساتھ حاصل کی ہو اور تجربہ خانے میں ۸ برس تک کام کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس کو روزمرہ کی ضروریات کی پابجائی کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے اور نیویارک کے انجنیرنگ کالج کے لئے داخلہ فیس اور تعلیمی فیس بھی دیجاتی ہے۔

دن کے وقت طالب علم تجربہ خانے کے سائنسدانوں اور انجنیروں کے مددگار کی حیثیت سے کام کرتا ہے تجربہ خانے میں طبیعیات، کیمیا اور انجنیرنگ میں تحقیقی کام ہوتا ہے۔ رات کو طالب علم کالج میں حاضری دیتا ہے۔

گلبرٹ ڈکسن ایک ایسا ہی طالب علم ہے جو شعبۂ کیمیا میں کام کرتا ہے۔ اس کو وہاں جدید ترین آلات کے ساتھ ماہرانہ رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تربیت کا یہ پروگرام کوئی سال بھر ادھر جاری کیا گیا ہے جن ملکوں میں سائنسدانوں کی کمی ہے ان کے سرمایہ داروں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ!

حسنِ اتفاق

جب کوئی بات پہلی مرتبہ دہرائی جاتی ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ دوسری مرتبہ پھر ویسا ہی ہو تو ہم ذرا متوجہ ہوتے ہیں۔ تیسری مرتبہ ہم کو حیرت ہونا شروع ہوتی ہے۔ اور اگر مسلسل پانچ مرتبہ کوئی بات ہوتی رہے تو پھر اس کا سبب معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اسپین کے ایک خاندان میں ایسا ہی ہوا ہے۔ الفانسو ویز شہر کے بینک میں ایک افسر ہے۔ وہ ۳۲ برس ادھر ۵ رجولائی کو پیدا ہوا تھا۔ اُس کے یہاں گذشتہ ۵ رجولائی کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ الفانسو کا باپ

زندہ ہے۔ وہ ۶۵ برس ادھر ۵ رجولائی کو پیدا ہوا تھا۔ یونہ کا دادا بھی ۱۰۲ برس ادھر ۵ رجولائی کو پیدا ہوا تھا۔ الفانسو کا چچا بھی ۵ رجولائی ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا تھا۔ الفانسو کا سوتیلا بھائی بھی ۵ رجولائی ۱۹۵۳ء کو ۱۲ برس کا ہوگیا۔ اب آپ اسے حسن اتفاق کہئے یا سوء اتفاق۔ ہے یہ ایک واقعہ۔

دن بڑھ رہا ہے

سر ہیرلڈ اسپنسر جونس برطانیہ کے شاہی منجم ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے لندن کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ دن بڑھ رہا ہے۔ لیکن اس خبر سے گھبرانے کی بات نہیں۔ بڑھنے کی شرح بہت کم ہے۔ یعنی ایک صدی میں ثانیہ کا ہزارواں حصہ بڑھ جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماہران فلکیات اب زمین کو کل وقت پیما نہیں مانتے۔

زمین کی حرکت گردشی میں جو تغیرات ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے نئے آلات کی ایجاد کی ضرورت پڑی ان آلات سے زمین کی بے ضابطگیوں کا علم ہو جائے گا۔

گرینوچ کے اوسط وقت کے نگراں سر ہیرلڈ ہی ہیں۔ وہ سپاہیانہ انداز رکھتے ہیں اور ان کی عمر اس وقت ۶۲ برس کی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں انھوں نے زمین سے سورج تک کا فاصلہ ناپ ڈالا تو جواب میں ۹٬۳۰٬۰۵٬۰۰۰ میل ملے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ اس میں ۹۰۰۰ کی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

شاہی منجم کے ہاتھ پر ایک ایسی دستی گھڑی رہتی ہے جس میں خود بخود کوک بھر جاتی ہے۔ سر موصوف کا کہنا ہے کہ جب سے اُن کے ہاتھ پر یہ گھڑی آئی ہے اب تک رُکی نہیں ہے۔ لیکن اگر رک بھی جائے تو اُن کا ہرج نہیں ہوتا کیونکہ وہ ستاروں سے اتنا واقف ہیں کہ خالی آنکھ سے ستاروں کو دیکھ کر وقت معلوم کر لیتے ہیں۔

چاند پر سونا

چاند تک کا سفر اب ایک امکانی بات سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ نیویارک امریکہ میں ایک شخص مسمی رچرڈ جے ایچ ڈی ٹوش اسکیڈنگ نے ایک کمپنی قائم کی ہے جو چاند پر سونا تلاش کرے گی سونا اگر مل گیا تو اس پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے قبضہ کیا جائے گا۔

نیویارک کی ریاست میں کمپنی کی باقاعدہ رجسٹری ہو گئی ہے۔ اب قانوناً اس کو یہ حق حاصل ہے کہ زمین کے تابع چاند کی سطح پر دھاتوں، معدنیات اور نمکیات کے حقوق قانونی طور پر حاصل کرے

مسٹر اسکیڈنگ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ چاند تک پہونچنے میں ہم کو پچاس برس لگ جائیں۔ خود

شئونِ علمیہ

تجربہ خانۂ ایڈیسن

امریکہ کے مشہور موجد ٹامس الوا ایڈیسن نے ۷۷ برس ادھر ایک تجربہ خانہ قائم کیا تھا۔ یہ تجربہ خانہ امریکہ کے ضلع نیوجرسی میں بمقام وسٹ آرینج میں آج بھی قائم ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جو نوجوان سائنسداں بننا چاہتے ہیں ان کو پورا موقع اس مقصد کی تکمیل کا ملنا چاہیئے اس کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ تجربہ خانہ کے ماہر سائنس دانوں اور انجنیروں کے تحت نوجوانوں کو مطالعہ اور کام کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔

شرط یہ ہے کہ طالب علم نے ثانوی درجہ کی تعلیم امتیاز کے ساتھ حاصل کی ہو اور تجربہ خانے میں ۸ برس تک کام کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس کو روزمرہ کی ضروریات کی پابجائی کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے اور نیویارک کے انجنیرنگ کالج کے لئے داخلہ فیس اور تعلیمی فیس بھی دیجاتی ہے۔

دن کے وقت طالب علم تجربہ خانے کے سائنسدانوں اور انجنیروں کے مددگار کی حیثیت سے کام کرتا ہے تجربہ خانے میں طبیعیات، کیمیا اور انجنیرنگ میں تحقیقی کام ہوتا ہے۔ رات کو طالب علم کالج میں حاضری دیتا ہے۔

گلبرٹ ڈکسن ایک ایسا ہی طالب علم ہے جو شعبۂ کیمیا میں کام کرتا ہے۔ اس کو وہاں جدید ترین آلات کے ساتھ ماہرانہ رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تربیت کا یہ پروگرام کوئی سال بھر ادھر جاری کیا گیا ہے جن ملکوں میں سائنسدانوں کی کمی ہے ان کے سرمایہ داروں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ!

حسنِ اتفاق

جب کوئی بات پہلی مرتبہ دہرائی جاتی ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ دوسری مرتبہ پھر ویسا ہی ہو تو ہم ذرا متوجہ ہوتے ہیں۔ تیسری مرتبہ ہم کو حیرت ہونا شروع ہوتی ہے۔ اور اگر مسلسل پانچ مرتبہ کوئی بات ہوتی رہے تو پھر اس کا سبب معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اسپین کے ایک خاندان میں ایسا ہی ہوا ہے۔ الفانسو لوبز شہر کے بینک میں ایک افسر ہے۔ وہ ۳۲ برس ادھر ۵ رجولائی کو پیدا ہوا تھا۔ اُس کے یہاں گذشتہ ۵ رجولائی کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ الفانسو کا باپ

زندہ ہے۔ وہ ۶۵ برس اور ۵ جولائی کو پیدا ہوا تھا۔ لوبنہ کا دادا بھی ۱۰۲ برس اور ۵ جولائی کو پیدا ہوا تھا۔ الفانسو کا چچا بھی ۵ جولائی ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا تھا۔ الفانسو کا سوتیلا بھائی بھی ۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو ۱۲ برس کا ہوگیا۔ اب آپ اسے حسن اتفاق کہئے یا سوء اتفاق۔ ہے یہ ایک واقعہ۔

دن بڑھ رہا ہے

سر ہیرلڈ اسپنسر جونس برطانیہ کے شاہی منجم ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے لندن کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ دن بڑھ رہا ہے ــ لیکن اس خبر سے گھبرانے کی بات نہیں۔ بڑھنے کی شرح بہت کم ہے۔ یعنی ایک صدی میں ثانیہ کا ہزارواں حصہ بڑھ جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماہران فلکیات اب زمین کو کل وقت پیما نہیں مانتے۔

زمین کی حرکت گردشی میں جو تغیرات ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے نئے آلات کی ایجاد کی ضرورت پڑی ان آلات سے زمین کی بے ضابطگیوں کا علم ہو جائے گا۔

گرینوچ کے اوسط وقت کے نگراں سر ہیرلڈ ہی ہیں۔ وہ سپاہیانہ انداز رکھتے ہیں اور ان کی عمر اس وقت ۶۴ برس کی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں انھوں نے زمین سے سورج تک کا فاصلہ ناپ ڈالا۔ جواب ہیں ۹٬۳۰٬۰۵٬۰۰۰ میل ملے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ اس میں ۹۰۰۰ کی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

شاہی منجم کے ہاتھ پر ایک ایسی دستی گھڑی رہتی ہے جس میں خود بخود کوک بھر جاتی ہے۔ سر موصوف کا کہنا ہے کہ جب سے اُن کے ہاتھ پر یہ گھڑی آئی ہے اب تک رکی نہیں ہے۔ لیکن اگر رک بھی جائے تو اُن کا ہرج نہیں ہوتا کیونکہ وہ ستاروں سے اتنا واقف ہیں کہ خالی آنکھ سے ستاروں کو دیکھ کر وقت معلوم کر لیتے ہیں۔

چاند پر سونا

چاند تک کا سفر اب ایک امکانی بات سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ نیویارک امریکہ میں ایک شخص مسمی رچرڈ جے ایچ ڈی ٹوش اسکیڈنگ نے ایک کمپنی قائم کی ہے جو چاند پر سونا تلاش کرے گی سونا اگر مل گیا تو اس پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے قبضہ کیا جائے گا۔

نیویارک کی ریاست میں کمپنی کی باقاعدہ رجسٹری ہو گئی ہے۔ اب قانوناً اس کو یہ حق حاصل ہے کہ زمین کے تابع چاند کی سطح پر دھاتوں، معدنیات اور تکنائٹ کے حقوق قانونی طور پر حاصل کرے۔

مسٹر اسکیڈنگ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ چاند تک پہونچنے میں ہم کو پچاس برس لگ جائیں۔ خود

موصوف کی عمر اس وقت پچاس برس کی ہے۔

انھوں نے فرمایا کہ، برس ادہران کو مشرق بعید میں ٹکٹائٹ کا ایک ٹکڑا ملا تھا جس میں سونا چاندی اور سیسے کے کچھ نقطے ملے تھے۔

ٹکٹائٹ شیشے کی طرح ایک چیز ہوتی ہے جو آتش فشاں پہاڑوں میں ملتی ہے۔ اس کی نسبت خیال یہی ہے کہ ٹکٹائٹ کی اصل قمر ہی ہے۔

چاند پر اگر سونا، چاندی، سیسا، تانبا یا تابکار دھاتیں مل جائیں تو اُن کو زمین پر واپس لانا بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ اس لیے مسٹر اسکیڈنگ یہ کہتے ہیں کہ چاند تک پہنچنے سے قبل زمین ہی پر ٹکٹائٹ کی تلاش کی جائے گی۔

ویسے کس کو معلوم ہے۔ شاید اس وقت تک مادے کو توانائی اور توانائی کو مادے میں تبدیل کرنے کا "نسخہ" ہاتھ آجائے تو پھر چاند پر مادے کو توانائی میں منتقل کیا جائے گا۔ تو وہ زمین تک روشنی کی شکل میں پہنچے گا یہاں اس کو پھر مادہ بنا لیا جائے گا۔

تبصرے

نقش حیات تقطیع کلاں۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ طباعت و کتابت اعلیٰ۔ قیمت غیر مجلد ۵ روپے۔
پتہ:۔ الجمعیۃ بک ڈپو۔ دفتر جمعیۃ علماء ہند قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔

یہ کتاب حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی خود نوشت سوانح حیات کی، جس کا غلغلہ حضرت مولانا کے عقیدتمندوں کے حلقہ میں ایک عرصہ سے بلند تھا، پہلی جلد ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے خاندانی اور نسبی حالات و کوائف بیان کرنے کے بعد اپنے بچپن سے لیکر اس وقت تک کے حالات قلمبند کئے ہیں جبکہ آپ اپنے والد صاحب مرحوم کے ساتھ مدینہ طیبہ میں مقیم ہو جانے کے بعد تیسری مرتبہ تشریف لاکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دامان ارشاد و ہدایت سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے ہیں اور جب کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسندِ درس و تدریس کو خیرباد کہہ کر دار و رسن کی سعادت و کامرانی کو لبیک کہنے کی تیاریاں شروع کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہر بزرگ کی سوانح حیات اپنے اندر قارئین و سامعین کے لئے عبرت و بصیرت اور موعظت و نصیحت کے گوناگوں روح پرور و باطن افروز اسباق رکھتی ہے۔ اسی طرح مولانا کے سوانح حیات کے اس حصہ کو پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی جو علمی اور عملی، دینی اور اخلاقی خصوصیات اور روحانی فضائل و مکارم ہیں وہ ان کی اپنی ذاتی کوششوں کی ہی مرہون نہیں بلکہ ایک بڑی حد تک موروثی ہیں اور مولانا جس خاندان کے فرزند فرید ہیں وہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے۔

مولانا نے چار سو صفحات کی کتاب میں ڈیڑھ سو صفحات میں اپنے احوال بڑے موثر اور دلنشیں انداز میں بیان کئے ہیں اور اس کے بعد آپ نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں جو انقلاب پیدا ہوا اس کے اسباب و دواعی کیا تھے؟ اس سوال کا جواب آپ نے ڈھائی سو صفحات میں دیا ہے جن میں بڑی تفصیل اور بسط کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ برطانوی سامراج کے

کے مظالم بیان کئے ہیں اور اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے مستند مصنفوں کے حوالے دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ کتاب کا یہ حصہ بجائے خود معلوماتی اور مفید ہے لیکن اب ہندوستان پر یا عالم اسلام پر برطانوی سامراج کے مظالم ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی یا اس پر طویل گفتگو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اس ذیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ یا کم از کم اس کا ایک بڑا حصہ مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بار بار۔ بکرات ومرات بیان فرما چکے ہیں۔ اس بنا پر حضرت مولانا اگر اس کو مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور اس کے متعلقات کا ذکر بھی اسی جلد میں کر دیتے تو عام لوگوں کے لئے جن کو اس اقتصادی زبوں حالی کے دور میں دو جلدیں خریدنا مشکل ہوگا۔ سہولت ہو جاتی اور اس کو پڑھنے کے بعد جو تشنگی محسوس ہوتی ہے وہ محسوس نہ ہوتی۔ بہر حال موجودہ حالت میں کتاب کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے

تنقید کیا ہے

از آل احمد صاحب سرور۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت تین روپیہ۔ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

آل احمد صاحب سرور، سید احتشام حسین صاحب کی طرح اردو کے معروف ادیب اور نقاد ہیں۔ اگرچہ ان کی قوت فیصلہ اس درجہ منضبط نہیں جتنی احتشام حسین کی ہے۔ جو بات کہتے ہیں بڑی احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہیں اور اگرچہ ایک نقاد کے لئے یہ ہنر نہیں۔ تاہم وہ طبعاً مرنج ومرنجاں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کسی شاعر کے کلام اور اس کے عوامل و موثرات کے تجزیہ کی صلاحیت اور اپنے محسوسات کو شگفتہ دلچسپ اور جامع انداز میں بیان کر دینے کی استعداد ان میں غیر معمولی ہے۔ اور یہی ان کا وہ امتیازی وصف ہے جو ان کے تمام مضامین و مقالات میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ میں موصوف کے آٹھ مضامین شامل ہیں جو ادب عالیہ کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں "یادگار حالی" "اکبر کی ظرافت" "شبلی میری نظر میں" "اقبال کے خطوط" اور "تنقید کیا ہے" خاص طور پر بہت مفید اور معلومات افزا ہیں۔

دست صبا از جناب فیض احمد فیض۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ کتابت وطباعت اعلیٰ۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔ پتہ:۔ آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی ملا

جناب فیض مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے فطری شاعر ہونے کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ وہ انگریزی زبان کے ایک ممتاز اخبار نویس ہونے اور عملی دنیا سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو زبان کے بھی ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں رمزیت اور اشاریت کے ساتھ جرأت و بیباکی، سوز وگداز اور خود سپردگی و خود ربودگی کے ساتھ عزم و حوصلہ، حقیقت بیانی اور واقعہ نگاری کے ساتھ بلند تخیل اور نزاکت تخیل یہ سب ملے جلے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ حال کے ترجمان ہیں اور مستقبل کے نقیب، وہ نغمے بھی گاتے ہیں اور طبل جنگ پر تھاپ بھی مارتے ہیں۔ زندگی اُن کے نزدیک جمااور ٹھہرا ہوا پانی نہیں بلکہ ایک بہتا ہوا اور ماضی و حال واستقبال کی پُرپیچ وادیوں سے اچھلتا اور ٹکراتا ہوا گذر جانے والا دریا ہے۔ آج کل کی ترقی پسند شاعری کے نقطۂ عروج تک پہونچنا اور اس کو سمجھنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک فیض کی شاعری کا مطالعہ نہ کیا جائے اس مجموعہ میں موصوف کی غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی اور کچھ قطعات بھی۔ یہ مختصر مختصر ہیں تاہم کیف اور معنی کے لحاظ سے بڑی بڑی طویل غزلوں اور نظموں پر بھاری ہیں۔ اگرچہ فیض کے یہاں صحت زبان و محاورہ کا زیادہ اہتمام نہیں پایا جاتا مثلاً ص ۷، پر "تمہیں کہو رندو محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا" یہاں بجائے کون کے کونسا اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ ص ۱۲ پر "کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم" یہ برفاب کیا؟ تاہم ان خال خال لغزشوں سے اُن کے کمالِ شعری پر حرف نہیں آتا، اور یہ مجموعہ ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے

چنگ و آہنگ از جناب عرش ملسیانی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت تین روپیہ۔ پتہ:۔ مرکز تصنیف وتالیف نکودر (جالندھر)

جناب عرش ملسیانی اپنے والد ماجد جناب جوش ملسیانی کی طرح اردو زبان کے مشہور اور خوش فکر شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں تغزل کا قدیم رنگ بھی پایا جاتا ہے اور عہد حاضرہ کے مسائل و معاملات اور اُن سے پیدا شدہ الجھنوں کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر اُن کی غزلیں جہاں بلند تخیل اور لطیف و نازک احساس

کی امین ہیں۔ ان میں رمز اور اشارہ کے پیرایہ میں اُن احساسات وجذبات کا اظہار بھی ہے جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً آج کل کی دکھی دنیا کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں۔ ان جذبات میں شرافت بھی ہے اور نیکی بھی۔ عالی حوصلگی اور بلند نظری بھی۔ عام انسانی ہمدردی اور غمگساری بھی ہے اور سیر چشمی و خلوص بھی۔ تغزل میں ان کا اسلوب سادہ و بے تکلف ہونے کی وجہ سے بڑا موثر ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ میں اُن کا کلام تین دوروں پر منقسم ہے جس میں غزلیں نظمیں قطعات اور گیت سب ہی کچھ ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش کی فکر جہاں فلک پیما ہے انہیں زبان پر بھی پوری قدرت حاصل ہے اور وہ بڑی سے بڑی فلسفیانہ حقیقت کو سادگی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس مجموعہ کو جو ہماری صاف نفیس شفاف ستھری اور نکھری شاعری کا بہترین نمونہ ہے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

طبی حشریات مولفہ جناب ڈاکٹر سید محمد غوث صاحب ہلتھ افسر سکندر آباد۔ کتابت وطباعت بہتر، چھوٹی تقطیع، صفحات ۱۳۴۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کے پتے:۔ (۱) ڈاکٹر صاحب موصوف (۲) دفتر المسیح بازار نور الامراء۔ حیدر آباد دکن۔

متعدی امراض کی تباہ کاریاں ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی بدولت رونما ہوتی ہیں جن میں مچھر، پسو کھٹمل اور مکھی کو خاص مقام حاصل ہے۔ مجموعی حیثیت سے بھی کیڑے حشریات یا حشرات الارض کہلاتے ہیں مصنف نے ان ہی حشرات سے متعلق معلومات اس کتاب میں جمع کی ہیں۔ کتاب میں جا بجا شکلوں کے ذریعہ مضامین کو واضح کیا گیا ہے۔ عام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب اس حیثیت سے مفید ہے کہ طبی حشریات سے واقفیت حفظ ماتقدم میں مدد دیتی ہے۔ یوں موضوع کے لحاظ سے یونانی اور آیورویدک کالجوں کے طلبہ کے لئے لائق استفادہ ہے۔

فاضل مصنف قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو میں یہ کتاب لکھ کر ایک ضرورت کو پورا کیا۔ کتاب کے آخر میں فہرست اصطلاحات مع اشاریہ دی گئی ہے جو کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتی ہے (ع)

برہان

جلد ۳۱ شمارہ نمبر ۵

نومبر ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ہمارا مسئلہ تعلیم

از سعید احمد

حصول آزادی کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ملک میں تعلیم کا معیار اونچا ہوتا۔ طلباء کی علمی استعداد بہتر اور اونچی ہوتی۔ اُن کے اخلاق بلند اور پسندیدہ ہوتے۔ اور اُن کا کردار و عمل ایک بڑے اور شاندار ملک کی روایات کے مطابق ہوتا۔ لیکن ان توقعات کے برخلاف موجودہ صورت حال یہ ہے کہ علمی اور فنی استعداد زوال پذیر ہے اور اس کا اندازہ یونیورسٹیوں کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈسپلن گویا مفقود ہی ہو گیا ہے۔ بزرگوں کا اور خاص طور پر اساتذہ اور یونیورسٹیوں کے حکام متعلقہ کا ادب و احترام اور اُن کا لحاظ و پاس جو ایک طالب علم کے فرائض اولین میں سے تھا روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے کل قوم کے اصل معمار اور ملک کی کشتی کے ناخدا وہی ہونگے جو آج طالب علم کہلاتے ہیں اس بنا پر اگر آج انھوں نے تعلیم کی برکات سے فائدہ اٹھا کر کیرکٹر نہیں بنایا اور اپنے اندر صالح کردار و عمل پیدا نہیں کیا تو کل یہ ملک کی گرانبار ذمہ داریاں کس طرح اٹھا سکیں گے؟ اور قوم کو اُن کی ذات سے کیا فائدہ پہونچے گا؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔

ہمارے موجودہ تعلیمی مسئلہ میں جو چند در چند گتھیاں پڑی ہوئی ہیں اگر اُن کی تنقیح کی جائے تو حسب ذیل امور غور طلب نظر آئیں گے۔

(۱) تعلیم کا انتظام اس طرح کیونکر کیا جائے جس سے بے روزگاری کے مسئلہ کا حل ہو سکے۔

(۲) اعلیٰ علمی استعداد اور فنی مہارت کیونکر پیدا کی جائے جس کے باعث ہمارے ملک میں مختلف علوم و فنون کے ماہر اور فضلا پیدا ہوں۔

(۳) طلباء میں ڈسپلن اور اخلاقِ فاضلہ کیونکر پیدا کیے جائیں۔

اگرچہ اس سلسلہ میں ضمنی طور پر چند اور سوالات بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں لیکن ملک کو آج جن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن کے پیشِ نظر بنیادی سوالات یہی تین چار ہیں۔ اب آئیے ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کریں۔

(۱) تعلیم یافتہ طبقہ میں بے روزگاری کا ایک یہ سبب تو ظاہر ہی ہے کہ ملک میں جس رفتار سے تعلیم ترقی کر رہی ہے اس رفتار سے ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی نہیں ہو رہی ہے حکومت کے شعبوں میں وسعت پیدا نہیں ہو رہی ہے اور اس طرح گویا ہماری تعلیمی پیداوار کی مثال اس مال اور سامان کی سی ہے جس کو کارخانے تیار تو کر رہے ہوں ایک بڑی مقدار میں مگر بازار میں اس کی مانگ اس کی پیداوار سے کم ہو اور اس بنا پر پیداوار اور مانگ میں تناسب و توازن قائم نہ ہو۔ لیکن در اصل اس عدم توازن کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ یورپ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے برخلاف ہمارے ملک میں تعلیم کا جو نظام قائم ہے اس پر بڑی حد تک "بھیڑ چال" کی مثل صادق آتی ہے یعنی ہمارے نوجوان طلباء اور طالبات جو تعلیم حاصل کرتے ہیں اس میں ان کی ذہنی استعداد اور طبعی صلاحیت اور فطری رجحان و میلان کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لیتے وقت بازار پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں اور جس فن کی قیمت ان میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے اسی کو اپنے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں عملی طور پر پائیدار اور مستقل قدر صرف ڈگری حاصل کرنے کی ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ کسی فن میں کمال اور مہارت پیدا کرنے کی ہی ہو سکتی ہے اور کوئی شخص مہارت اور کمال اسی فن میں پیدا کر سکتا ہے جس کے ساتھ اس کو فطری لگاؤ ہو، طبعی دلچسپی ہو اور جس میں مشغول رہ کر وہ تعب اور تھکان کی بجائے قلبی مسرت اور روحانی لطف و حظ محسوس کرے اس بنا پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون کی بازار میں ہر دلعزیزی اور گراں قیمتی کو دیکھ کر طلبا کی ایک بڑی تعداد اسی طرف دوڑ پڑتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اسی مضمون میں بی اے یا ایم اے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مضمون خواہ کتنا ہی ہر دلعزیز ہو اور اس کی قیمت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو لیکن بہرحال اس کی مانگ محدود ہوتی ہے۔ اس بنا پر جن طلباء نے اپنی فطری صلاحیت و استعداد کے باعث اس مضمون میں امتیاز پیدا کیا ہے ان کی بازار میں کھپت ہو جاتی ہے اور ان کے علاوہ دوسرے طلباء جنھوں نے محض نقالی کی تھی وہ بے روزگاری کا شکار بن جاتے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ ملک میں اقتصادی معاملات و مسائل کا چرچا ہوا تو طلباء اسی کی طرف مائل ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس طالب علم کو دیکھئے اقتصادیات میں ایم اے کر رہا ہے۔ اس کے بعد سائنس کا زور ہوا تو اب حال یہ ہے کہ

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فنون (ARTS) کی کلاسوں میں سناٹا نظر آئے گا اور لڑکا ہو یا لڑکی ہر ایک اپنے فطری رجحان و صلاحیت سے قطع نظر کیے ہوئے بی۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ ایس۔ سی میں پڑھ رہا ہے۔ اس "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اقتصادیات کی طرح سائنس کے مارکٹ میں بھی پیداوار اس کی اپنی اصل مانگ سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

اس صورتِ حال کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب یہی ناکام و نامراد طلبا کسی خاص ایک مضمون کی تکمیل میں اپنی عمر کا بہترین حصہ محنت اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کو ذریعہ معاش بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو اب لامحالہ حصولِ معاش کے لئے انہیں کسی اور طرف کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور اب اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو چونکہ یہ چیز۔ یہ عہدہ۔ یا ملازمت ان کی توقعات سے بہت کم ہوتی ہے اور اس کی انھوں نے تکمیل بھی نہیں کی ہوتی اس بنا پر وہ اس کام کو کرتے بھی ہیں تو بددلی اور بے رغبتی کے ساتھ اور پھر جتنا کچھ کرتے ہیں وہ ناقص بھی ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان لوگوں نے خود اپنے اوپر ہی ظلم نہیں کیا بلکہ اب جس ادارہ میں کام کر رہے ہیں اس پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ چنانچہ آج عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا معیار جو پست ہوتا جا رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان تعلیم گاہوں کے اساتذہ میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے کسی خاص مضمون میں ایم۔ اے کیا تھا اس توقع پر کہ وہ اس کے ذریعہ کوئی اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کر سکیں گے لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو مجبوراً کسی اسکول میں ٹیچر یا کالج میں لکچرر ہو گئے ہیں اس طرح اس غلط نظام تعلیم کے باعث ملک میں صرف بے روزگاری ہی نہیں بڑھ رہی ہے بلکہ مختلف اداروں دفتروں اور کارخانوں میں ناموزوں و نامناسب آدمیوں کی جگہ پا جانے کی وجہ سے ان اداروں کے اصل کام کو بھی کافی نقصان پہونچ رہا ہے جس کا تجربہ اور مشاہدہ آج کل ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا حل کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزوں نے تعلیم سے متعلق جو غلامانہ ذہنیت پیدا کر دی تھی اسے دور کیا جائے اور طلبا اور اُن کے والدین میں اس بات کا یقین اور قومی احساس پیدا کیا جائے کہ برطانوی حکومت کے زمانہ میں تعلیم طبقاتی امتیاز و افتخار حاصل کرنے کا ذریعہ تھی اور اس کا مقصد محدود اور خود غرضانہ تھا یعنی سرکاری ملازمت حاصل کرنا اور اس کے ذریعہ دوسروں سے نمایاں اور ممتاز ہو کر رہنا۔ اس وقت یہ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ ملک کی ضرورتیں کیا ہیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اسے کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے اس کے برخلاف ہر شخص تعلیم کو اپنے ذاتی مفاد اور شخصی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور اسی کے حساب سے اُس کی

قدر و قیمت متعین کرتا تھا وہ تعلیم اس خیال سے حاصل کرتا تھا کہ تعلیم پاکر وہ خود کیا ہو جائے گا۔ اسے اس کی پرواہ ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہو کر ملک کی کیا خدمت کر سکے گا۔ لیکن اب جبکہ ملک آزاد ہے اور اس کو ترقی دینا اور بڑھانا اس کے ہر شہری کا فرض ہے تو اب تعلیم کا مقصد کسی قسم کا طبقاتی امتیاز حاصل کرنا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ طبقاتی امتیاز کو ہی سرے سے مٹ جانا چاہیے۔ پہلے کرسی ذریعۂ امتیاز و افتخار تھی لیکن اب ایک وہ شخص جو کسی دفتر میں اونچی کرسی پر بیٹھ کر کام کرتا ہے اور وزیر کہلاتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی میدان میں یا کھیتی میں کام کر رہا ہے دونوں ملک کے خادم ہیں قوم کے کارندے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کی قوم کو ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ دوسرے کی۔ اس بنا پر دونوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ اور سماجی و معاشرتی معاملات میں کسی ایک کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ روا نہیں رکھنا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ نوجوانوں اور ان کے والدین کے دلوں میں یہ احساس صرف چند لیڈروں کے تقریر کر دینے اور ان میں اخلاقی درس دینے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ ہماری معاشرت اور سماج کا نقشہ یک قلم بدل دیا جائے پرانا ڈھنگ اور پرانے طریقوں کو ختم کر کے معاشرت اور سماج کی تشکیل و تعمیر حقیقی معنوں میں جمہوری اور عوامی نہج پر کی جائے یعنی ایک ہی مجلس کے کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی نسبت یہ محسوس نہ ہو کہ وہ مرتبہ، عزت اور وجاہت میں سب سے بڑے ہیں اور دوسرے اس سے کمتر اور فروپایہ ہیں۔ ان میں اگر کوئی شخص زیادہ معزز ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ وزیر ہے یا مجسٹریٹ یا کسی محکمہ کا افسر اعلیٰ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و عمل اور کردار و کیرکٹر کے اعتبار سے دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ گویا عزت عہدہ کی، منصب کی، یا تنخواہ کی نہیں ہے بلکہ اس کے اپنے علمی و عملی اور اخلاقی کمالات و فضائل کی ہے۔ اگر ہم ایک ایسی غیر طبقاتی سوسائٹی اور ایک ایسا جمہوری و عوامی سماج پیدا کر سکیں تو انگلینڈ، امریکہ، روس اور فرانس وغیرہ کی طرح نوجوانوں میں تعلیم سے متعلق ایک آزاد نقطۂ نظر خود بخود پیدا ہو جائے گا اور وہ تعلیم اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ملک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے حاصل کریں گے۔ نہ کہ کوئی منصبی یا دفتری اعزاز و امتیاز حاصل کرنے کے لئے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آج کل کی طرح ہر نوجوان کو نہ ڈگری حاصل کرنے کی دھن ہوگی اور نہ ہر ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے درپے ہوگا بلکہ اعلیٰ تعلیم وہی حاصل کریں گے جو اس کے اہل ہونگے اور جن کو علم کے ساتھ طبعی دلچسپی اور فطری لگاؤ ہوگا۔ جب حسن پرستی ہر بوالہوس کا شعار نہ بن سکے گی تو لازماً اس کا اثر یہ ہوگا کہ شیوۂ اہل نظر

کی آبرو بھی رہ جائے گی۔ علم کی مثال بارش کے پانی کی سی ہے وہی بوندیں ہیں جو سبزہ زار پر گرتی ہیں تو لالہ وگل پیدا کر کے اُسے گلزار بنا دیتی ہیں اور جب یہی بوندیں کسی عفونت کے ڈھیر پر پڑتی ہیں تو دبی ہوئی بدبو کو اُبھار کر اُسے فضا میں منتشر کر دیتی ہیں علم کے لئے وسیع حوصلہ، عالی ظرف اور بلند نظر درکار ہے۔ ہر ایک شخص اس مے مردافگن کا حریف نہیں ہو سکتا۔

جب تک اس طرح کی سوسائٹی پیدا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ابھی جلد ہی پیدا نہیں ہوگی۔ انتظار نہیں کیا جاسکتا اس لئے ہمیں خود بھی اپنے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے جس پر عمل کرنے سے آج کل کی مشکلات کا حل ہو سکے۔ ترقی یافتہ ممالک میں قاعدہ ہے کہ ثانوی درجہ کی تعلیم کے بعد جو تقریباً ہر ایک کے لئے ضروری ہے طلبا کو دماغی نفسیات کے ماہر ڈاکٹروں کے سامنے معائنہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر بڑے غور و خوض اور توجہ سے طلبار کا امتحان کر کے یہ معلوم کرتے ہیں کہ کس طالب علم کو کس فن کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے اور اس اعتبار سے وہ کس لائن میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ طلبار اور ان کے والدین دونوں کے حق میں ایک قطعی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق طالب علم کو آئندہ تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں جو شخص ہے خوش ہے اور جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اُسے دلچسپی اور خوشدلی سے انجام دے رہا ہے۔ اگر یہ طریقہ ہم بھی اپنے ملک میں جاری کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس پر خاطر خواہ نتائج مرتب نہ ہوں۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی ثانوی درجہ (سیکنڈری ایجوکیشن) کے نصاب میں بھی ایک جامع اور ہمہ گیر تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔ یعنی یہ نصاب ان سب مضامین پر گروپ وار شامل ہونا چاہیئے جن سے کسی بھی طالب علم کو اپنی آئندہ تعلیم میں خواہ کسی قسم کی ہو۔ فائدہ پہونچے۔ اس نصاب کو آرٹس اور سائنس کے مضامین کے علاوہ کسی پیشہ کی تعلیم (Vocational Traning) پر بھی مشتمل ہونا چاہیئے تاکہ جو طلبا ثانوی درجہ کی تعلیم پوری کرنے کے بعد کوئی صنعت و حرفت سیکھنا چاہیں تو وہ اسے سیکھ سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ابھی پچھلے دنوں حکومت کی مقرر کی ہوئی کمیٹی نے سیکنڈری ایجوکیشن پر جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔

اعلیٰ علمی استعداد

دوسرا سوال یہ تھا کہ طلبار میں علمی استعداد جو کمزور ہوتی جا رہی ہے اس کا انسداد کیونکر کیا جائے۔ اس کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ لگایا جائے۔ اس صورتِ حال کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا مقدس فرض جن لوگوں کے

سپرد ہوتا ہے اُن میں ایک کافی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے اس پیشہ کو مجبوراً اور دوسری طرف سے مایوس ہو کر اختیار کیا ہے اُن لوگوں میں خود علم کے صحیح ذوق کا فقدان ہوتا ہے، جب ان میں ذوق نہیں ہے تو وہ اپنے شاگردوں میں اس علم یا فن کا ذوق اور اس سے دلچسپی کس طرح پیدا کر سکیں گے۔ ان اساتذہ میں علم کا ذوق کتنا ہوتا ہے، اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے شوق میں تحقیق اور ریسرچ کا کام کرتے ہیں لیکن جہاں وہ ڈاکٹر ہوئے اور ان کو یونیورسٹی میں صدر شعبہ کا عہدہ ملا بس اب لکھنا پڑھنا سب غائب ہو جاتا ہے تحقیق اور ریسرچ کا کبھی نام بھی نہیں لیتے اور اب ان کا کام صرف ایک اعلیٰ قسم کی زندگی بسر کرنا ہو جاتا ہے۔ اب لکھنے پڑھنے کا اگر وہ کوئی کام کرتے بھی ہیں تو صرف روپیہ کمانے کے لئے تاکہ اُن کی اونچی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں یہ ایک عام حالت تو آزادی سے پہلے بھی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد ایک دوسری مصیبت یہ آئی ہے کہ جو پروفیسر اپنے کام کا ماہر یا اس میں مشہور و نیکنام ہوتا ہے حکومت اُسے کسی نہ کسی ایک محکمہ میں بڑے عہدہ اور بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیتی ہے یا وہ کسی کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا جاتا ہے اور اب اُس کے اوقات کا ایک بڑا حصہ کمیشن کے کاموں میں یونیورسٹی سے باہر صرف ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو علم کا ذوقِ صحیح حاصل ہو جائے وہ مادی مرغوبات اور دنیوی آسائشوں اور لذتوں سے اس درجہ بے نیاز ہو جاتا ہے کہ پھر کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ یونان کے مشہور فلسفی دیوجانس کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سکندر اعظم اس سے ملنے گیا اور جب چلنے لگا تو اُس نے ازراہِ عقیدت و ارادت کہا کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔ دیوجانس نے جو دھوپ کا بہت شوقین اور قدر دان تھا فوراً جواب دیا کہ "بس آپ مہربانی کر کے میری دھوپ چھوڑ دیجئے جسے روک کر آپ کھڑے ہو گئے ہیں مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے۔"

کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ہمارے علمی ذوق کی حقیقت تو بس اتنی ہے کہ جہاں بڑی تنخواہ یا اعزاز کی کوئی نوکری ملی اور پھر جو کچھ پڑھا تھا وہ سب طاقِ نسیاں کی نذر۔ لیکن یورپ میں علمی ذوق کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے لائق دوست شیخ محمد عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور نے خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک روز شام کے وقت وہ لندن میں اپنے اُستاد پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں پروفیسر آرنلڈ نے اچانک سوال کیا "عنایت اللہ! تم فوراً جواب دو کہ اس وقت تمہارے دل میں دنیا کی بڑی سے بڑی کونسی لذت کی

خواہش موجود ہے" شیخ صاحب نے کہا میری تمنا یہ ہے کہ مجھے اتنا روپیہ ملے کہ میں عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا کروں شیخ صاحب کہتے تھے کہ میرا یہ جواب سنتے ہی پروفیسر آرنلڈ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا دانتوں تلے انھوں نے انگلی دبالی اور پھر بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولے کہ " کیا کسی ایک طالب علم کے لئے علم کی لذت سے بڑھ کر بھی کوئی دوسری لذت ہو سکتی ہے ؟

انہیں پروفیسر آرنلڈ کا ایک واقعہ مولانا شبلی نے سفرنامہ مصر روم و شام میں لکھا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے تھے، راستہ میں غالباً عدن کے قریب دفعتہً معلوم ہوا کہ جہاز کے ڈوب جانے کا خطرہ ہے اور کپتان نے خطرہ کی گھنٹی بھی بجا دی ہے۔ مولانا شبلی جو یوں بھی بہت کم دل تھے، بہت گھبرا گئے، اور فوراً بھاگے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے کیبن میں پہونچے وہاں کیا دیکھتے ہیں پروفیسر آرنلڈ بڑے اطمینان سے مطالعۂ کتاب میں مصروف ہیں۔ مولانا نے حیرت سے پوچھا " کیا آپکو خبر نہیں ہے کہ جہاز خطرہ میں ہے ؟ پروفیسر صاحب نے جواب دیا " ہاں مجھے معلوم ہے " اب مولانا نے اس اطمینان کے ساتھ مطالعہ پر حیرت کا اظہار کیا تو پروفیسر آرنلڈ بولے " دیکھئے دو حال سے خالی نہیں یا تو جہاز ڈوب ہی جائیگا یا خطرہ سے باہر نکل آئے گا اگر دوسری صورت اس کے مقدر میں ہے تو پھر خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کیا فائدہ اور اگر خدانخواستہ ڈوبنا ہی اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے تو پھر زندگی کے یہ چند لمحات غنیمت ہیں انہیں کسی بہتر کام میں صرف کرنا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرنے سے بہتر اور دوسرا کونسا کام ہو سکتا ہے۔

عربی کا مقولہ ہے " العلم لا یعطیک بعضہ حتی لا تعطیہ کلک یعنی علم اپنا تھوڑا سا بھی تم کو اس وقت تک نہیں دیگا جب تک کہ تم اپنا سب کچھ علم کے حوالہ نہیں کر دوگے۔ یہ مقولہ جس طرح مشرق پر صادق آتا ہے مغرب پر بھی آتا ہے۔

علم و تحقیق کی راہ میں قربانیاں

تاریخ یورپ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرون وسطیٰ کی ظلمتوں کے بعد سولہویں صدی سے یکے بعد دیگرے ایسے ارباب علم و تحقیق پیدا ہوتے رہے جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ انھوں نے خود جانیں قربان کر دیں لیکن دنیا کو ایک نئی زندگی، ایک نیا فکر، ایک نیا تمدن دے گئے۔ پندرھویں صدی کے نصف آخر میں کوپرنیکس (Copernicus) پیدا ہوا جو ۱۴ مئی ۱۵۴۳ء کو اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس نے ستاروں کی حرکت کا پتہ چلایا لیکن عیسائیت کی تنگ نظری کی وجہ سے

وہ اپنی تحقیقات شائع نہیں کرسکا۔ آخر ٹھیک اس دن جبکہ وہ اس دنیا کو خیر آباد کہہ رہا تھا اس کا رسالہ جسے اُس نے اب سے تیس سال پہلے مکمل کرلیا تھا شائع ہوا۔ جس نے علم نجوم میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کردیا کوپرنیکس کی موت کے سات برس بعد گیارڈانو برونو (Giordano Bruno) نیپلز میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے پیشرو کی تحقیقات کو اور آگے بڑھایا لیکن اس جرم میں اسے پہلے قید و بند کی شدید ترین تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور آخر ۱۷ فروری ۱۶۰۰ء کو اُس نے تختۂ دار پر لٹک کر قیدِ ہستی سے نجات پائی۔ لیکن اس کی جرأت و ہمت کا یہ عالم تھا کہ جب جج نے اُسے سزائے موت کا حکم سُنایا تو اُس نے بھری عدالت میں جج کو مخاطب کرکے کہا "تم جو مجھ کو سزائے موت دے رہے ہو بہ نسبت میرے زیادہ خطرہ میں ہو۔ مستقبل فیصلہ کرے گا کہ فاتح کون ہے میں یا تم۔ میں مر رہا ہوں اور اپنی خوشی سے بزدلی کی زندگی پر بہادری کی موت کو ترجیح دے رہا ہوں۔

اسی زمانہ میں گلیلو (Galileo) نے آفتاب کے اردگرد زمین کی گردش کا نعرہ بلند کیا۔ کوپرنیکس نے علم نجوم میں زہرہ۔ مشتری۔ چاند اور مریخ کی تشکل کی نسبت جدید تحقیقات کرکے جو نئی بنیادیں قائم کی تھیں گلیلو نے دوربین کے ذریعہ انہیں تحقیقات کو اور آگے بڑھایا اور جو چیز پہلے قیاسی تھی اس کا مشاہدہ کرادیا۔ لیکن کلیسا کی حکومت اسے بھی برداشت نہ کرسکی۔ نو سال تک حد درجہ بے کسی کے ساتھ قید و بند کی تکالیف اٹھانے کے بعد آخر قید خانہ ہی میں اُس نے دنیا کو الوداع کہا۔

جس سال یعنی ۱۶۴۲ء میں گلیلو کا انتقال ہوا اسی سال آئزک نیوٹن (Issac Newton) پیدا ہوا۔ اُس نے زمین کی کشش کا سُراغ لگایا۔ زمین کی کشش کا تخیل خود گلیلو بھی رکھتا تھا لیکن نیوٹن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے اسی نظریہ کو اعلیٰ ریاضیات کے اصول و ضوابط پر جانچا۔ پرکھا اور آخر کار اسے مستحکم دلائل سے ثابت کرکے دم لیا۔ نیوٹن نے ریاضی اصول و ضوابط پر روشنی کے اجزائے ترکیبی، کشش اور حرکت کے قوانین اور ان کو ناپنے کے طریقوں سے متعلق جو تحقیقات کی انہیں کا یہ نتیجہ تھا کہ علمائے سائنس ان تحقیقات کی روشنی میں آگے بڑھے اور یورپ میں یک بیک ایک مشینی اور صنعتی و حرفتی انقلاب پیدا ہوگیا۔ اگرچہ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ نیوٹن جس نے عہدِ شباب میں اپنی تحقیقات اور جدید انکشافات سے دُنیا کا رخ بدل دیا اور انسانی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کردیا تھا وہ عمر کے آخری چالیس سالوں میں ایک زاہد متقشف اور خالص کلیسائی متنسک ہوکر بیٹھ گیا اور اُسے خود اپنے مضمون سے

دلچسپی نہیں رہی۔ مرنے سے چند روز پہلے اُس نے کہا کہ "میرے علم وتحقیق کی مثال اُس بچہ کی سی ہے جو کسی ایک بحر زخار کے کنارہ بیٹھا ہوا چند خوبصورت کنکریوں یا سیپ کے خول سے کھیل رہا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ سچائی کا بحر ناپیدا کنار میرے علم وتحقیق کی دسترس سے بہت دور ہے۔

انسانی تہذیب وتمدن کی دنیا میں جس حیرت انگیز انقلاب وتغیر کا بیج سولہویں صدی میں بویا گیا تھا سترہویں صدی میں اس نے برگ وبار پیدا کرنے شروع کئے۔ یہ ہی وہ زمانہ تھا جبکہ علمائے سائنس نے ایک انجمن قائم کرکے باقاعدہ اپنی تنظیم شروع کی اور انجمن کے ہفتہ وار جلسوں میں سائنٹفک موضوعات ومباحث پر تبادلۂ خیالات اور اُن خیالات وآرار کی اشاعت کا سروسامان کیا۔ چنانچہ ولیم ہاروے (William Harvey) نے فزیالوجی میں اور انٹوئن لیوشر (Antoine Lavoisier) نے کیمسٹری میں اور روسو (Rousseau) نے عمرانیات واجتماعیات میں اپنی عمر بھر کی علمی جدوجہد اور تحقیق وکاوش کے ذریعہ فکر ونظر کا ایک نیا باب کھولدیا۔
علم وتحقیق کی راہ کے ان جانباز وبہادر سرفروشوں کو اپنی تحقیق اور علمی زندگی کس درجہ عزیز تھی اس کا اندازہ اس ایک عجیب وغریب واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ۸ رمئی ۱۷۹۴ء کو اکیاون سال کی عمر کے لیوشر کو علم کیمیا میں کلیسا شکن تحقیقات کے جرم میں فرانس کی حکومت نے سزائے موت کا حکم سنایا تو اس شہید علم کو ذرا خوف وہراس نہیں ہوا اور اس نے یہ درخواست کی کہ مجھے پندرہ دن کے لئے زندہ رہنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں پسینہ (Perspiration) سے متعلق جو تحقیقات کر رہا ہوں اسے مکمل کرلوں۔ لیکن ظالم حکومت نے ایک نہ سُنی اور جج نے کہا کہ "جمہوریہ کو علماء اور ماہرین علوم وفنون کی ضرورت نہیں ہے۔ جج کا یہ کہنا تھا کہ جلاد کی تلوار چمکی اور جس نے عناصر سے متعلق انسانی علم وفکر کی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کیا اور جس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن کا سراغ بتاکر انسانی جسم میں زندگی کا نیا خون دوڑایا تھا اُس کا سر یک بیک کٹ کر زمین پر آرہا۔

ان جانباز بہادروں نے علم وتحقیق کی قربان گاہ پر اپنی زندگیاں بھینٹ چڑھادیں۔ حکومت وقت نے ان سے جان مانگی انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی جانیں دیدیں لیکن کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنے کارناموں سے اور اپنے ذہنی ودماغی تخلیقات کے ذریعہ نہ صرف یورپ کا بلکہ ساری دنیا کا نقشہ کس طرح بدل دیا ہے انھوں نے انسانی تہذیب وتمدن کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور فطرت کے اسرار سربستہ کو بے نقاب کرکے فکر ونظر کے لئے وسعتیں اور

نئی فضائیں پیدا کی ہیں۔ آج انہیں لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ سیاسی اعتبار سے ایشیائی اقوام کے تعاون و اشتراک کا خواہ کیسا ہی محتاج ہو لیکن پوری دنیا پر اس کی ذہنی و دماغی اور علمی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ ابھی عرصہ تک اس سے نجات پا جانا ممکن نہیں ہے۔

اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ آج جبکہ ہم آزاد ہیں اور ہمیں اپنے ملک کو ترقی دینا اور اُسے آگے بڑھانا ہے تو ہم سب کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ کسی ملک کی عظمت و رفعت اور اس کی ترقی و سربلندی کا دارومدار اس بات پر نہیں ہوتا کہ اس ملک میں حکومت کیسی ہے؟ اور حکومت کے دفتروں اور محکموں میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ کیسے ہیں بلکہ اس کا دارومدار ایک بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ اس ملک میں علوم و فنون کے ماہر کتنے ہیں؟ انھوں نے اپنی تحقیقات سے ملک کو اور اس کے ذریعہ دوسروں کو کیا فائدہ پہونچایا ہے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے علم و نظر کے ذخیرہ میں کیا اضافہ کیا ہے اور ان کی ذات سے انسانی تہذیب و تمدن کو کیا منفعت پہونچی ہے۔ سیاسی فتح و شکست کا فیصلہ بیشک میدان جنگ میں ہوتا ہے اور کسی ملک کی سرحد میں نگہداشت و حفاظت کا کام فوجیں کرتی ہیں۔ لیکن کسی ملک کی حقیقی عظمت و سربلندی کا پرچم صرف اس ملک کے ارباب علم و تحقیق کے ہاتھوں ہی فضا میں لہرا سکتا ہے۔ اگر ہم لوگ اس نکتہ کو محسوس کرلیں اور اس پر ہمیں یقین کامل بھی پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوگا کہ علوم و فنون کے ماہر اور افاضل کبھی کسی مادی لذت و آسائش سے مرعوب ہو کر اپنے خلوت کدۂ درس و تدریس اور مسند علم و تحقیق کو چھوڑ کر کسی سرکاری محکمہ کے افسر اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھنے کی تمنا نہیں کریں گے اور دوسری جانب حکومت بھی اس کا خیال رکھے گی کہ جن لوگوں نے اب تک اپنی عمر کا بہترین حصہ علم و تحقیق کی راہ میں بسر کیا ہے ان کو حکومت کے شعبوں میں کھینچ کر علم کا نقصان نہیں کرے گی۔ علم بجائے خود ایک مملکت اور سلطنت ہے اس کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ اس کو سیاست کا آلۂ کار و خدمت گذار کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔

بہرحال طلباء میں علمی استعداد کو پختہ و مضبوط اور اس کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ حکومت اور عوام اور یہاں تک کہ خود ارباب علم، علم و تحقیق کے ساتھ انصاف کرنا سیکھیں۔ اس کو وہ مقام دیں جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کی وہ قدر و منزلت کریں جو اس کا اپنا طبعی

حق ہے۔ ہم ایسا کریں گے تو نوجوانوں کے دلوں میں بھی علم کی رغبت اور اس کا صحیح ذوق پیدا کر سکیں گے۔ (باقی آئندہ)

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت اکتوبر

یہ تو "الاسلام" یا "اسلامیت" کی پہلی خصوصیت ہے، اسی کے ساتھ دوسری طرف اسی "الاسلام" کو پیش کرتے ہوئے قرآن میں اس سوال کو اٹھا کر کہ

افلم یدبروا القول ام جاءھم مالم یات اٰباءھم الاولین (المؤمنون) — کیا بات کو وہ سوچتے نہیں، یا ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھی۔

اس سوال کے جواب کو اجمالی رنگ میں کبھی بایں الفاظ

ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ (الاعلیٰ) — قطعاً یہ (جو قرآن میں بیان کیا گیا) پہلے صحیفوں میں بھی بلاشبہ یہی تھا

ہم قرآن میں پاتے ہیں، اسی مقصد کو کہیں

وانہ لفی زبر الاولین (الشعراء) — اور (یہی باتیں) اگلوں کی کتابوں میں تھیں۔

کے عنوان سے ادا کیا گیا ہے۔

اسی اجمال کی گونہ تفصیل کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم و موسیٰ وعیسیٰ الآیۃ (سورہ شوریٰ) — تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جاتا ہے جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی تھی اور اسی کی وحی ہم نے تم پر بھی کی اور اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو بھی کی تھی

گویا رسالات و نبوات کی پہلی مشہور تاریخی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام اور نزولِ قرآن سے پہلے اسی سلسلہ

کی آخری ہستی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ اگلوں کو دیا گیا تھا وہی پچھلوں تک پہونچایا جاتا رہا۔ اسی طرح سورہ الاعراف میں اسی راہ کے چند ممتاز ومشہور بزرگوں کے اسماء گرامی یعنی نوحؑ ابراہیمؑ اسحاقؑ یعقوبؑ داؤدؑ سلیمانؑ ایوبؑ یوسفؑ موسیٰؑ وہارونؑ، ذکریاؑ ویحییٰؑ وعیسیٰؑ والیاسؑ الیسعؑ یونسؑ لوطؑ علیہم السلام کے ذکر کے بعد

ومن آبائهم وذرياتهم و — اور ان ہی کے باپ دادوں میں جو تھے اور انکی اولاد میں جو تھے

اخوانهم۔ — اور اُن کے بھائی

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں بظاہر ان سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس راہ کی ساری برگزیدہ ہستیاں جن میں نسلی تعلق ہو یا نسلی نہیں بلکہ صرف نبوت کی اخوت کا رشتہ قائم ہو[1]۔ اخوانهم (ان کے بھائیوں) کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سارے نمائندے اور اس کے پیغام کو بندوں تک پہونچانے والے خواہ ایک نسل اور قوم سے ہوں، یا مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہوں سب ہی کے متعلق

اولئك الذين هدى الله — یہی وہ لوگ ہیں جن کی رہنمائی اللہ نے کی

کی خبر دینے کے بعد قرآن پر ایمان لانے والوں سے

فبهداهم اقتده (الانعام) — پس چاہیئے کہ جن باتوں کی ہدایت اُن کو کی گئی تھی اُن ہی کی پیروی تم بھی کرو۔

کا مطالبہ کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ "الاسلام" کو قبول کرتے ہوئے ہر مسلمان کو یہ بھی ماننا پڑے گا، اور اس پر بھی بیعت کرنی ہوگی، کہ

امنا بالله وما انزل الينا وما انزل الى ابراهيم واسماعيل واسحاق ويعقوب والاسباط وما اوتي موسىٰ وعيسىٰ وما — مانا ہم نے اللہ کو اور ان چیزوں کو جو ہم پر اتاری گئیں، اور اُترا ابراہیم پر اسماعیل پر اسحاق پر یعقوب پر اور اسباط (اسرائیلی پیغمبروں) پر، اور جو کچھ کہ دیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور

---

[1] معراج کی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ان پیغمبروں سے جب ہوتی جن سے نسلی رشتہ آپ کا تھا تو وہ مرحبا بالابن الصالح کہتے اور جن سے نسلی رشتہ نہ تھا وہ مرحبا بالاخ الصالح کے الفاظ سے آپ کا خیر مقدم کرتے

اوتی النبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون (البقرۃ)

دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کی رب کی طرف سے (سب پر ہم ایمان لائے) اور ان میں سے کسی کو کسی سے ہم جدا نہیں کرتے اور ہم سب (خالقِ کائنات) ہی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں

بعیت کے اس کلمہ میں آپ دیکھ رہے ہیں، نام بہ نام چند خاص بزرگوں کے ذکر کے بعد اقرار لیا جاتا تھا کہ "النبیون من ربھم" یعنی جہاں کہیں جس زمانہ میں بھی اپنے رب کی طرف سے نبی اور پیغمبر بنا کر جو بھیجے گئے ہوں؟ ان کے نام معلوم ہوں یا نہوں لیکن اجمالاً سب ہی پر ایمان لاتا ہوں، ان پر بھی ایمان لاتا ہوں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے وہ لائے اس کو بھی مانتا ہوں اس لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہ سمجھوں گا"

اور یہ چند آیتیں تو گویا بطور مثال کے یہاں پیش کر دی گئی ہیں، ورنہ چاہا جائے تو ایسی قرآنی آیتوں کا کافی ذخیرہ آپ کے سامنے لا کر رکھدیا جا سکتا ہے، جس کا قدر مشترک یہی ہے کہ انسانی زندگی کا یہ قدرتی دستور، جس کا نام "الاسلام" یا "اسلامیت" ہے۔ سارے بنی آدم کا دوامی دستور ہے، خالقِ کائنات کے پاس سے ہر زمانہ میں اس کی پابندی کا مطالبہ ہر اس شخص سے کیا گیا ہے جو آدمی بن کر زمین کے اس کرے پر پیدا ہوا خواہ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی نسل اور قوم سے اس کا تعلق ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود آیت قرآنی

ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران) قطعاً دین اللہ کے پاس وہ الاسلام ہی ہے۔

میں بھی کوئی ایسا لفظ یا اشارہ نہیں پایا جاتا جس کی بنیاد پر خواہ مخواہ بلاوجہ یہ باور کر لیا جائے کہ قرآن کا یہ "اطلاقی اعلان" کسی خاص زمانہ تک محدود ہے۔ اور اس سے پہلے خدا کے پاس سے زندگی کے کسی ایسے دستور کی پابندی کا مطالبہ بھی پیش ہوتا رہا جو "الاسلام" سے مختلف تھا۔

کچھ بھی آپکے سامنے "رہبانیت" اور "نظریۂ شرکت الی مادیت" کے مصنوعی طریقوں کے مقابلہ میں انسانی زندگی کے اسی قدرتی دستور کو پیش کرتا ہوں جس کا قرآنی نام "الاسلام" ہے اور قرآن ہی کی رو سے اسی کی پابندی کا مطالبہ ہر زمانہ میں آدم کی اولاد سے خدا کے پاس سے پیش ہوتا رہا

اس میں شبہ نہیں جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ میں ہم جو کچھ بھی پیش کریں گے قرآن اور قرآن سے جو کچھ سمجھا گیا ہے[1] اسی کی روشنی میں پیش کریں گے، لیکن قرآن ہی کی بنیاد پر ہر پڑھنے والے کو یہ سمجھنا چاہیئے اور اسی نقطۂ نظر کو

[1] گویا اصولی قانون کے ساتھ آئین ہی کے ان حصوں کی نسبت ہوتی ہے جنہیں بائی لاز کہتے ہیں وہی نسبت قرآن کے ساتھ جن چیزوں کی ہے جن کو اصطلاحاً حدیث و آثار و فقہ وغیرہ کہتے ہیں ۱۲۔

سامنے رکھتے ہوئے میں اسلام کو پیش کروں گا کہ اسی قدرتی دستور کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ خدا کے پاس سے چین والوں سے بھی کیا گیا تھا اور اُن سے بھی جو جاپان کے جزیروں میں رہتے تھے' اسی کے مکلف اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے وہ بھی ٹھہرائے گئے تھے' جو ایران میں یا ہندوستان میں' عرب میں یا مصر میں پیدا ہوئے تھے - الغرض ایشیا ہو یا افریقہ' یورپ ہو یا امریکہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں - سامی نسل سے تعلق رکھتے ہوں' یا آریائی گوت سے' تورانی ہوں' یا سلاف اور ٹیوٹانی' خواہ جزائر کے باشندے ہوں یا برہائے اعظم میں اُن کا وطن ہو' کوئی بھی ہوں کہیں کے بھی ہوں' کسی زمانہ میں پیدا ہوئے ہوں' قرآن کے واضح بیانات' اور محکم آیات ہی کا اقتضاء ہے کہ اصولاً سب ہی کے آگے "الاسلام" ہی کی پابندی کا مطالبہ اُن کے خالق کے پاس سے پیش کرنے والے پیش کرتے رہے۔

ممکن ہے کہ نام زندگی کے اس "نظام" کا "الاسلام" نہ ہو - اور ممکن کیا بظاہر عام حالات کے لحاظ سے شاید ممکن بھی نہ تھا. لیکن "نام" نہ سہی' "کام" جو اُن سے چاہا گیا تھا' وہ تو یقیناً "الاسلام" ہی تھا اور اسی کو ہونا بھی چاہیے تھا' آخر نزول قرآن سے پہلے بھی تو زمین کے اس کرے پر آدم ہی کی اولاد آباد تھی وہ بھیڑ بکری تو نہ تھے -

کچھ بھی ہو' موازنہ اور مقابلہ کے میدان کو اپنی اسی کتاب ہی میں کیا بلکہ اصولاً صرف زندگی کے ان ہی دونوں خود ساختہ مصنوعی غیر فطری اور غیر عقلی طریقوں (رہبانیت و مادیت) ہی کی حد تک محدود سمجھتا ہوں' ان دونوں کے مقابلہ میں "الاسلام" یا "اسلامیت" ہی میرے نزدیک آدمی کی زندگی کا قدرتی اور فطری دستور ہے باقی دنیا کے عام مذاہب و ادیان جن کے ماننے والے دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں ان بے چاروں کو دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں' بلکہ کبھی کبھی تو رو پڑتا ہوں - دیکھ رہا ہوں کہ اپنے گھر کی پونجی کو پرائی پونجی باور کرکے ایک ایسے بے بنیاد مغالطہ میں لوگ مبتلا کر دیئے گئے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی کے گذرے ہوئے بزرگوں ان ہی کے اسلاف اور باپ دادوں ہی کا "موروثی سرمایہ" ہر قسم کی اشتباہی آلائشوں سے پاک وصاف ہو کر قرآن کے قالب میں اُن کو واپس کیا گیا ہے' ان ہی کی اپنی چیز ہے جو اُن کے سامنے لائی گئی ہے مگر وہ تو یہ سُننا بھی نہیں چاہتے کہ آخر قرآن کا پیغام کیا ہے' وہ اُن سے کیا کہہ رہا ہے' بدگمانیاں' بے بنیاد قطعاً بے بنیاد بدگمانیاں تھیں کہ سُننے اور سُن کر سمجھنے سے پہلے ہی بدکنے والے بدک رہے ہیں' بھڑکنے والے بھڑکتے ہی چلے جاتے ہیں - ان میں یہ غلط احساس پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کو مان کر اپنے "آبائی ترکہ" سے ہم محروم ہو جائیں گے' اپنے

بزرگوں سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

ہائے! ان کو کیسے سمجھایا جائے کہ جس "موروثی حق" سے محروم کرنے والوں نے ان کو محروم بنا کر چھوڑ دیا تھا، حق داروں تک قرآن اُن کے اسی "موروثی حق" کو پہونچانے ہی کے لئے نازل ہوا ہے۔

بغیر کسی پاس داری کے کھُلے دماغ کے ساتھ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اپنے آباؤ اجداد کے چھوڑے ہوئے "موروثی حق" تک پہونچنے اور پہونچانے کا کوئی ذریعہ قرآن کے سوا آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر باقی نہیں رہا ہے، ستانے والوں نے حق کو ناحق کے ساتھ کچھ اس طرح سان دیا ہے کہ جیسے ناخن کو ممکن ہے گوشت سے چھڑا بھی لیا جائے. مگر اس سلسلہ میں خواہ تنقیح و تصحیح کے سارے عقلی ذرائع اور منطقی کارروائیوں ہی سے کیوں کام نہ لیا جائے صورت حال ہی ایسی ہے کہ اب حق کو ناحق سے جُدا کرنے میں قدرۃً کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب اور دین جس کے متعلق تصحیح کی ضرورتوں کو محسوس کر کے تنقیحی سوالات نہیں اُٹھتے یا نہیں اُٹھائے جاتے اور ترجیحی نتائج جو عموماً عقلی راہوں سے نکالے جاتے ہیں۔ ان ہی پر بھروسہ کر کے جینے والے جی رہے ہیں گویا رہبانیت زہادیت کے مصنوعی طریقوں کی طرح اپنے عقل ساختہ فیصلوں پر وہ بھی بھروسہ کر رہے ہیں۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ تصحیح و تنقیح و ترجیح کے یہ سارے کاروبار جو ہر مذہب کے ماننے والوں ہی کے حدود دائرہ میں جاری ہیں ان میں سے کوئی نہیں بجز اس کے سمجھا جاتا ہو کہ اپنے اپنے دین کے احاطہ کی یہ اندرونی بات ہے۔ لیکن بجائے کسی خاص مذہب اور دین کے نسل انسانی کے سارے مذاہب و ادیان کو اپنے دائرہ بحث میں لا کر عقل کی غیر تشفی بخش راہوں سے نہیں بلکہ وحی و الہام کے مقدس لاہوتی ذریعہ سے تصحیح و تنقیح کی اسی ضرورت کو خود قدرت نے قرآن کی شکل میں جب پورا کر دیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب اور دین کو تصحیح و تنقیح کی ضرورت سے بے نیاز ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنے طرز عمل سے یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کی دینی زندگی کو تصحیح و تنقیح کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ جس کے پاس جس شکل میں بھی جو دین پایا جا رہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد کا صحیح دین یہی تھا اور اُن کے آبائی مذہب یا دھرم کی کوئی شکل اس کے سوا نہ تھی جس شکل میں آج اُن کے پاس وہ موجود ہے حالانکہ وحی و الہام نہیں بلکہ صرف خام عقلی ذرائع سے کسی دین کے ماننے والوں کو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ تصحیح و تنقیح کی ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لئے کوئی کھڑا ہوتا ہے تو عموماً لوگوں کے

کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب نہیں تو ایک طبقہ عقل کے نکالے ہوئے ان منفی نتائج کے تسلیم کرنے پر آمادہ بھی ہو جاتا دنیا کے کسی مذہب پر شاید ہی کوئی ایسی صدی گذری ہو جو اصلاح و ترمیم تصحیح و تنقیح کی آوازوں سے خالی رہی ہو، کل بھی یہی ہوتا تھا، اور آج بھی یہی ہو رہا ہے، جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جس ضرورت کی طرف قرآن نے مذاہب و ادیان کی ماننے والی ہستیوں اور قوموں کو توجہ دلائی ہے کسی زمانہ میں اس کا انکار نہیں کیا گیا ہے اور کون و فساد والی اس دنیا میں بناؤ اور بگاڑ کے اس عام قانون سے کون سی چیز محفوظ ہے، جو آدمی کی دینی زندگی اس قانون کی زد سے بچ سکتی تھی۔[1]

بہر حال ارباب مذاہب و ادیان سے اس کے سوا مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے کہ جو قرآن ہی نے سکھایا ہے یعنی قرآن جس دینی زندگی کے نظام کو تم پر پیش کر رہا ہے یہ وہی طریقہ ہے جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی تھی، ابراہیم و موسیٰ کو بھی اسی کی وصیت کی گئی تھی یعنی وہی سورہ شوریٰ والی آیت شرع لکم من الدین الآیۃ جسے نقل کر چکا ہوں اسی سلسلہ میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ الہامی کتابیں وراثۃً جن لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی وہ اپنی کتابوں کے متعلق شک میں مبتلا ہو کر دبدھے میں پڑ گئے ہیں، آخر میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ

فلذلک فادع، واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل امنت بما انزل اللہ من کتاب و

پس ان ہی وجوہ سے (یعنی اوّل سے آخر تک دین ایک ہی تھا مگر لوگ شک میں مبتلا ہو گئے اسی لیے اسی کھلے دین کی طرف تم پھر لوگوں کو پکارو) اور خود بھی اسی پر ڈٹ جاؤ جیسے تمہیں حکم دیا گیا اور مت پیروی کرو (لوگوں) کی اپنی من مانی خواہشوں کی اور مصنوعی خود ساختہ طریقوں کی

---

[1] خود مسلمانوں کی دینی زندگی جس پر ابھی کل تیرہ صدیاں گذری ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ اس راہ میں ان کن حوادث کی کہاں کہاں نہیں شکار ہوتی رہی۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ مذاہب و ادیان کی تصحیح کا واحد قدرتی "معیار" ہونے کا جو موقف قرآن کو حاصل ہے یعنی اسی پر پیش کر کے چاہیئے کہ اپنی دینی زندگی کی لوگ تصحیح کرتے رہیں اس باب میں مسلم اور غیر مسلم سب ہی کے لئے قرآن مساویانہ نسبت رکھتا ہے محض نام کے مسلمان بنا کر یہ خیال کر اپنی دینی زندگی کو قرآن پر پیش کر کے صحیح کرنے کی ضرورت سے ہم بے نیاز ہیں قطعاً غلط ہے ۱۲۔

امرت لاعدل بینکم — اور کہو کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہم نے تو صرف اسی کو مانا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں (یعنی دینی قوموں کے) درمیان میں فیصلہ کردوں (یعنی حق کو ناحق سے جدا کر کے بتا دوں۔

دنیا کے عام مروجہ مذاہب و ادیان کے درمیان قرآن کا یہی "طبعی موقف" اور "قدرتی مقام" ہے، آیت کو ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ مروجہ مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کو خطاب کرتے ہوئے یہی کہا کرو، کہ

اللہ ربنا و ربکم لنا اعمالنا — اللہ ہی ہمارا پروردگار بھی ہے اور تمہارا پروردگار بھی وہی ہے ہمارے

ولکم اعمالکم لاحجۃ بیننا — لئے ہمارے کام اور تمہارے لئے تمہارے کام کوئی جھگڑا ہمارے تمہارے

وبینکم اللہ یجمع بیننا — درمیان نہیں ہے اللہ ہم سب کو (قدرتی دستور حیات) پر اکٹھا

والیہ المصیر — کرے اور واپسی اسی اللہ کی طرف ہے۔

یہی ہمیں سکھایا گیا ہے۔ چاہیئے کہ عام مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے مقابلہ میں اسی قرآنی نقطۂ نظر کو زندہ اور تر و تازہ رکھا جائے اور میں تو ناامید نہیں ہوں کہ قرآن کی بتائی ہوئی دعا،

اللہ یجمع بیننا — ہم سب (جو دین کے ماننے والے ہیں) سب کو زندگی کے قدرتی دستور پر اللہ اکٹھا کرے

قبول نہ ہوگی، قرآن کے متعلق لوگ غلط فہمیوں کے شکار ہیں، ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو کر رہیگا، وہ کتاب پہچانی جائے گی جو ہر قوم کو اس کے سچے آبائی دین اور دھرم تک پہونچانے کے لئے سب سے آخر میں قدرت کی طرف سے نسل انسانی کو سپرد کی گئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے اپنے ذاتی خیالات و اظہار کے قرآن کو اسی رنگ میں قوموں کے آگے رکھا جائے جس رنگ میں اس نے خود اپنے رب کو پیش کیا ہے آپ اسی کتاب میں بھی دیکھیں گے کہ "الاسلام" یا "اسلامی نظام حیات" کے نام سے جو چیزیں پیش ہو رہی ہیں، ہوں گی تو وہ قرآن اور قرآنیات ہی سے ماخوذ، لیکن دنیا کے عام مذاہب و ادیان کا آپ نے اگر مطالعہ کیا ہے، یا تھوڑے بہت معلومات بھی اس سلسلہ میں آپ کے پاس ہوں گے تو آپ یہ پائیں گے کہ عموماً یہ وہی باتیں ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے دوسرے عام مروجہ مذاہب و ادیان میں بھی ملتی ہیں، نہ جاننے والے اس حال کو دیکھ کر کبھی کبھی پوچھتے بھی ہیں کہ جن باتوں کو لوگ پہلے ہی سے انتہ چلے آرہے ہیں اب وہی باتیں اسلام میں بھی منوائی جاتی ہیں اور ان ہی کی پابندی کا مطالبہ بھی "اسلام"

میں کیا جاتا ہے تو اپنے پرانے دین کو چھوڑ کر اس نئے دین کو لوگ آخر کیوں مانیں حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو ریسرچ اور تحقیق کی داد بھی اس قسم کی کتابیں لکھ لکھ کر کچھ دن ہوئے حاصل کی ہے۔ انھوں نے مذاہب و ادیان کی کتابوں کو الٹا پلٹا اور ان ہی سے نکال نکال کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں بتائی جاتی۔

مگر تحقیق و تلاش کے ان پیشہ وروں سے یہ کون پوچھے کہ دین کی ساری کتابوں کے ساتھ تم نے قرآن کا بھی مطالعہ کر لیا تھا اس کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس کو بھی تم نے منقح کیا تھا۔ قرآن کسی "نئے دین" اور "نئی تعلیم" کی دعوت ہی کب دیتا ہے وہ تو قوموں کو ان کے آباء اولین (گذشتہ باپ دادوں) ہی کے دین اور دھرم کو تازہ ترین مکمل شکل میں اشتباہی آلودگیوں سے پاک کر کے پیش کرنے کا مدعی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "الاسلام" اور اسلامی زندگی کے اجزاء کو پیش کرتے ہوئے اگر چاہا جاتا تو قرآن کے سوا بھی عام اور مروجہ مذاہب و ادیان کی کتابوں کو فراہم کر کے اس کتاب میں ہم درج کر سکتے تھے۔ تاکہ معلوم ہو کہ روحانیت اور مادیت کے مقابلہ میں "اسلام" یا "اسلامیت" نفسانی زندگی کا کوئی نیا دستور و آئین نہیں ہے بلکہ اول سے آخر تک یہی قدرتی مطالبہ خالقِ کائنات کی طرف سے پیش ہوتا رہا، مذہبی نمائندوں یعنی حضرات انبیاء و رسل علیہم السّلام کی یہی مشترک تعلیم ہے۔

لیکن ایک ہی "آئین دستور" کا تازہ ترین الہامی مکمل (جامع و حاوی ایڈیشن) جب ہمارے پاس موجود ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے قطعاً پاک ہے اس کی تاریخی زندگی پر شروع سے آخر تک تاریخ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا ہے جس میں ردّ و بدل کی بدگمانیوں کی گنجائش کا ہلکے سے ہلکا احتمال بھی پیدا ہو سکتا ہو۔ ایسی صورت میں اسی دستور کے ان نسخوں کے استعمال کی ضرورت ہی کیا تھی جن کے ورق ورق میں شکوک و شبہات کے کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ خود اُن کے ماننے والے بھی جانتے ہیں کہ کن تاریخی حادثوں سے ان کتابوں کو گذرنا پڑا ہے۔ اور ان حادثوں میں ان کتابوں پر کیا کچھ نہیں گذر چکی ہے ان ہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ تائیدی شہادتوں کے ساتھ ساتھ ان ہی مشکوک و مشتبہ نسخوں سے تردیدی شہادتوں کو بھی لوگ پیش کر سکتے ہیں[1]۔

---

[1] دور کیوں جائیے عیسائی مذہب کا شمار بھی ان ہی ادیان میں کیا جاتا ہے جو عقیدۂ توحید کے حامی ہیں، انجیل توحیدی شہادتوں سے بھری ہوئی بھی ہے۔ لیکن اسی انجیل سے "تو" ایک تین ہے تین ایک ہے" کا معمہ بھی نکالا جاتا ہے تورات میں خدا کے جلال و جمال کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اس کا کون انکار کر سکتا ہے مگر اسی تورات میں خدا کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کی گئی ہیں جن کے بعد خدا مشکل ہی سے خدا باقی رہتا ہے۔ یہی حال ان تمام مذاہب و ادیان کا ہے جنھیں بڑی بھلی شکلوں میں لوگ مانتے چلے جاتے ہیں والقصہ بطولہا ۱۲۔

اب اپنی اس تمہیدی گفتگو کے بعد انسانی زندگی کے اسلامی نظام کو پیش کرتا ہوں۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

اچھی طرح سے اس مسئلہ کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ قرآن کی طرف عملی زندگی کے اس نظام کو جو میں منسوب کرتا ہوں تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ آج آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر اسی کتاب میں آدمی کی عملی زندگی کے اس نظام کے کلیات تر و تازہ حالت میں ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہوکر اپنی مکمل ترین شکل میں پائے جاتے ہیں جن سے اس سلسلہ میں رہتی دنیا تک کی پیش آنے والی ضرورتوں کے متعلق احکام اور نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ ورنہ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں دنیا کے عام مذاہب و ادیان جنہیں منسوب کرنے والے خالق کائنات کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اسی کی پابندی کا مطالبہ کیا گیا ہے یعنی حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کی طرف منسوب ہونے والی امتوں میں جو دین اور دھرم پایا جاتا ہے اصولاً اسی "اسلامی نظام" ہی کی وہ پرچھائیاں ہیں جن میں کافی رد و بدل ترمیم و اضافہ کے باوجود اب بھی بہت سے عناصر و اجزاء اسی "اسلامی نظام زندگی" کے پائے جاتے ہیں۔

اگر یہ سمجھا جائے کہ "مادیت" اور "روحانیت" کے مقابلہ میں دنیا کے سارے مذاہب و ادیان کی ترجمانی اور وکالت کا فرض ادا کیا جارہا ہے گویا دنیا کی عام مذہبی قوموں اور پیغمبروں کی امتوں کی ایک صف بنا کر ہم "مادیت" اور "روحانیت" کے طریقوں کو چیلنج کر رہے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ عملی زندگی کے یہ دونوں ناقص خاکے انسانی فطرت کے جبلی مطالبات کو تشنہ اور غیر تشفی یافتہ حال میں چھوڑ دیتے ہیں ان کے مقابلہ میں "الاسلام" یا "اسلامیت" ہی عملی زندگی کا ایسا کامل و مکمل نظام ہے جس میں آدمی کی جبلت کے تمام تقاضوں کے لئے مناسب خوراک مہیا کی گئی ہے۔ صحیح معنوں میں دلوں کی آسودگی اور اطمینان کا کوئی ذریعہ "اسلامی زندگی" کے سوا نہ پہلے سوچا گیا ہے اور نہ آئندہ سوچا جاسکتا ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ "مادیت" یا مادی زندگی گذارنے والوں کا عملی پروگرام جبلت کے جن تقاضوں پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے پست سے پست اور بلند سے بلند تر نصب العین جنہیں "مادیت" کی راہوں میں پیش کرنے والے وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں ان پر بھی تصدیق و تصحیح کی مہر "اسلامیت" میں ثبت کی گئی ہے اور عملی زندگی میں ان کو شریک کرلیا گیا ہے اسی طرح فطرت کے جن احساسات پر "روحانیت" کی بنیاد قائم ہے اسلام میں بھی عملی زندگی کی تعمیر اسی کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے۔ الغرض "مادیت" اور "روحانیت" دونوں ہی کے لئے مناسب اور موزوں غذائیں اسلامی

نظام ہیں چونکہ خود بخود مہیا ہو جاتی ہیں اس لئے عملی زندگی کے اسلامی نظام کے قبول کرنے سے مذاہب و ادیان کی کشمکش کے قصوں سے جیسے فرصت مل جاتی ہے، اسی طرح "مادیت" اور "روحانیت" کی نہ ختم ہونے والی آویزش کی داستانوں کو بھی یہ واقعہ ہے کہ الاسلام یا "اسلامیت" کے مسلک نے بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے، کیونکہ مادّی زندگی کے سارے مطالبوں کی تکمیل کا سامان بھی اس میں موجود ہے اور "روحانیت" میں جو کچھ چاہا جاتا ہے اس کو بھی پورا کر دیا گیا ہے ہر ایک کو اس کا مناسب حصہ اس مسلک میں خود بخود مل جاتا ہے اور یوں اپنے اپنے فطری مقام پر اسلامی نظام زندگی کے چوکھٹے میں مادیت و روحانیت دونوں ہی فٹ ہو کر کھپ جاتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس اساسی نقطۂ نظر کے زیر اثر اسلامی زندگی منظم ہوتی ہے اس کے قدرتی منطقی نتائج و ثمرات کو سامنے رکھ کر اگر سوچا جائے تو یہ واقعہ ہے کہ حق کا یہ پورا نظام ہی ایک مکمل دائرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک ایسا دائرہ جس میں نہ کہیں خلا ہی باقی رہتا ہے اور نہ کس لئے کے سوال کا کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے، یہی دائرہ ہے جس کا نام اپنی خاص اصطلاح میں میں نے "دائرۃ الایمان" رکھ چھوڑا ہے، اردو کے عصری میلان کے رو سے آپ کا جی چاہے تو "دھوم چکر" کے نام سے بھی اس کو آپ موسوم کر سکتے ہیں۔ ولا مشاحۃ فی التسمیہ والاصطلاح

میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ کوئی شاعری، یا کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جس کے لئے غیر معمولی مطالعہ اور نئے معلومات کے حاصل کرنے کی ضرورت ہو، بلکہ عام مذاہب و ادیان خصوصاً "الاسلام" کے متعلق اجمالی معلومات بھی جن کے پاس ہیں ان ہی معلومات کا معمولی جائزہ لیتے ہوئے ہلکی سی منطقی ترتیب ان میں پیدا کر لینے کے ساتھ ہی وہی سب آپ کے سامنے بھی آجائیگا جسے میں پا رہا ہوں۔

آخر خالق کائنات کے تخلیقی مظاہر، جسے ہم عالم اور کائنات کہتے ہیں اس سے استفادہ کے حق کا آپ ہی بتائیے کہ دنیا کے کس مذہب اور دین میں انکار کیا گیا ہے۔ قرآن کا تو ورق ورق اسی "حق" کے اجازت ناموں اور لائسنسوں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد پر خود اس کی ذات اور صفات کا بھی حق ہے، اس پر اس کے بال بچوں، بیوی ماں باپ بھائی بہن الغرض خاندان والوں کا بھی حق ہے۔ جن لوگوں میں آدمی زندگی بسر کرتا، رہتا سہتا، جیتا مرتا ہے ان کا بھی یعنی اپنی قوم اور وطن والوں کا بھی اس پر حق ہے اور آخر میں یہ کہ سارے انسان، خواہ اس وقت موجود ہوں، یا آئندہ پیدا ہونے والے ہوں، قطع نظر اس سے کہ عام انسانی ہمدردی کی تعلیم سے شاید ہی دنیا کا کوئی مذہب و دین خالی ہو، قرآن میں اُمّت

اسلامیہ کو مخاطب بناکر

کنتم خیر امت اخرجت للناس ۔ تم بہترین اُمت ہو جو عام انسانوں کی نفع رسانی کے لئے باہر لائی گئی ہے ۔

کا اعلان کرتے ہوئے "جہاد" کے نام سے ایک مستقل قانون ہی نافذ کیا گیا ہے، جس کے متعلق نہ جاننے والے خواہ جن غلط فہمیوں کے شکار رہوں اور بنانے والوں نے اس لفظ کو جتنا بھی وحشت ناک و مہیب بنا دیا ہو جس میں اسلام کے بعض نادان دوستوں کی دوستی نما دشمنی کو بھی دخل ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنے رب کو، اپنی قوم کو باقی رکھنے کے لئے مادی ذہنیت رکھنے والوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو فنا کے گھاٹ اُتارنا ضروری قرار دے رکھا تھا۔ یہی "تنازع للبقاء" کا قانون تھا جس کے زیر اثر دنیا میں لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں، جنگ و حرب کی صفیں قائم ہو رہی تھیں "تنازع للبقاء" کا یہ قانون انسانی آبادیوں کا نہیں بلکہ جنگل کے حیوانوں کا قانون تھا۔ اس جنگلی غیر انسانی قانون کو "جہاد" کے انسانی قانون سے اسلام میں بدل دیا گیا ہے۔ جسے چاہا جائے تو بجائے تنازع للبقاء کے "تنازع للابقاء" کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ جس میں دوسروں تک ابدی زندگی اور بقاء دوام کی ضمانت پہونچانے کے اور ان کو باقی رکھنے کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ موت کا خطرہ بھی سامنے آجائے تو اس خطرہ کو بھی قبول کر لینا چاہیے یعنی دوسرے زندہ ہو جائیں اس لئے خود کو مرنے پر راضی کر لینا بھی جہاد کے اس قانون کی جوہری روح ہے۔ تفصیلی بحث تو اس پر مستقل باب میں کی جائے گی۔ سردست میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عام انسانی ہمدردی کا نصب العین جو گویا مادی زندگی کا آخری سب سے بڑا نصب العین سمجھا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ "قانون جہاد" کو نافذ کر کے اسلامی نظام زندگی کا قرآن اسی نصب العین کو صدیوں پہلے ایک اہم ترین جز بنا چکا ہے۔ بہرحال ہو ہو بنی (عام انسانیت) کے فلاح و بہبود کے نصب العین کو پیش کر کے "مادیت" اپنا دم توڑ دیتی ہے لیکن یہ بات کہ دنیا کی ساری پیداواروں کے مقابلہ میں کرۂ زمین کی یہ پیداوار جس کا نام "انسانیت" ہے خود اس کے وجود کی غرض و غایت کیا ہے عرض ہی کر چکا ہوں کہ "مادیت" اس کے جواب میں بھوت بن کر رہ جاتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ مادیت میں انسانیت اور ساری سرگرمیاں دیوانہ کا بے نتیجہ خواب بن کر رہ جاتی ہے ۔

اسلامی زندگی میں اسی سوال کا جواب

يا قوم اعبدوا الله ما لكم من اله غيره — اے قوم پوجو اللہ کو نہیں، تمہارا معبود (الٰہ) اس کے سوا

دیا گیا ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ پیدا کرنے والے خالق نے انسان کو خود اپنے لئے، اپنی عبادت کے لئے، اپنی مرضی پر چلنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں اسی مطلب کو کبھی

ان هذه امتكم امة واحدة و — یہ ٹولی (انسانوں کی) ایک ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار

انا ربكم فاعبدون — ہوں تو مجھی کو تم پوجتے رہیو۔

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، اور کبھی انسانی وجود کے اسی نصب العین کو سمجھاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ

ان هذه امتكم امة واحدة و — یہ ٹولی (تم انسانوں کی) ایک ہی ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار

انا ربكم فاتقون۔ — ہوں پس مجھی سے ڈرتے رہنا۔

صرف یہی نہیں کہ "مادیت" کے جوہری نقص کا ازالہ اس جواب سے ہو جاتا ہے بلکہ خود بخود "روحانیت" کا مسلک بھی اسلام کے عملی نظام کے قوام میں کچھ اس طرح سے گھل مل جاتا ہے کہ "مادیت" اور "روحانیت" کے سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے یہ دو مختلف نظریے ایک بسیط نظریہ کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ "روحانیت" کے مسلک کا سلبی و منفی جز یعنی یہ جو مانا جاتا تھا کہ آدمی تو خدا کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن خود آدمی کے لئے دنیا کی کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی ہے، یہی ہے دنیا گریز رجحانوں کی حوصلہ افزائی "روحانیت" کی سب سے بڑی خصوصیت ہر زمانہ میں ٹھہرائی گئی ہے جس حد تک دنیا کی چیزوں سے بے نیاز، اور ان کی دست نگری سے اپنے آپ کو آزاد دکھانے میں جو کامیاب ہوئے ہیں اسی حد تک روحانیت کی راہوں میں وہ قدر و عزت کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اقوام و امم کی تاریخ کا یہ ایک مشترک نقطۂ نظر بن گیا ہے جس کے اثر سے ہم کسی مذہب یا دین کو مشکل ہی سے مستثنیٰ کر سکتے ہیں خود مسلمانوں کے اندر بھی مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انتہائی غالیانہ شکلوں میں نہ سہی لیکن کسی نہ کسی رنگ میں لوگ اس کو مانتے چلے آئے ہیں جس پر عنقریب ہم بحث کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس سلسلہ میں جہاں تک فقیر نے غور و فکر سے کام لیا ہے اور جس کے نتیجے تک پہنچا ہے اس کے ذکر سے دل اگرچہ ہچکچاتا ہے لیکن دل میں جو بات آئی ہے اسے پیش کئے دیتا ہوں، ضرور نہیں کہ حقیقت میں بھی واقعہ یہی ہو۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عام خدا کی مخلوقات کے متعلق جہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے

اس کو جس قالب میں پیدا کیا ہے سمجھا جاتا ہے کہ یہی اس کا قدرتی قالب ہے۔ پتھر پتھر ہی ہے۔ درخت درخت ہی ہیں۔ بھیڑ بکریاں بھیڑ بکریاں ہی ہیں، یہی لوگ جانتے بھی ہیں اور یہی مانتے بھی ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کب اور کیوں، کن اسباب و وجوہ کے زیر اثر کائنات عالم کی پیداواروں کے جھمیلے میں ایک آدم کی اولاد بنی نوع انسان کے متعلق خدا ہی جانتا ہے فرض کرنے والوں نے کسی زمانہ میں یہ فرض کر لیا کہ گو پیدا تو ہوئے ہیں وہ انسانی قالب میں لیکن واقع میں وہ انسان نہیں، بلکہ "ملائکہ" یا "فرشتہ" یا "دیوتا" تھے۔ ملکوتی وجود پر انسانیت کی جھول اوپر سے اڑھا دی گئی ہے، اسی لئے آدمی کا فرض ہے کہ باہر سے اڑھائی ہوئی اس جھول کو پھاڑ کر اپنے آپ کو وہی بنا لے جو درحقیقت وہ ہے، یعنی فرشتہ بن جانے میں کامیاب ہو جانا، سمجھا جاتا ہے کہ یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سب کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بڑے مشہور مذاہب میں اسی عجیب و غریب "مفروضہ" کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ خدا کی بندگی اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کا ثمرہ اور انجام آدمی کے سامنے اس شکل میں آئے گا کہ وہ ملک یعنی فرشتہ بن جائے گا، بالفاظ دگر اس کا مطلب یہی ہوا، اور یہی سمجھایا بھی جاتا ہے کہ انسانی فطرت کے سارے طبعی مطالبات سے آدمی کو محروم کر کے ملکوتی زندگی اس کو بخشی جائے گی۔ اس باب میں "عیسائی مذہب" کے ماننے والوں کے رجحانات نے اس حد تک ترقی کی کہ عام مذاہب و ادیان میں بہشتی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، قرآن میں بھی اسی نقشہ کی تجدید کی گئی ہے اس کو بجائے "انسانی جنّت" کے عیسائیت کے ماحول میں "حیوانی جنّت" کے نام سے موسوم کر کے اس بہشتی زندگی کا مضحکہ اڑایا گیا، تضحیک و تحقیر کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "عیسائیت" کے دائرے کو توڑ کر دوسرے مذاہب و ادیان کی ماننے والی امتوں میں بھی حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض طبقات تک زیادہ تر غیر شعوری طور پر نہ معلوم کیوں اس عیسائی عقیدہ سے اس حد تک متاثر نظر آتے ہیں کہ کافی طنز و طعن، بلکہ ناقابل برداشت خشک قرینوں سے عام مسلمانوں کے قلوب کو مجروح کرنے کا گویا رواج سا ہو گیا ہے۔

آج بھی اگر ڈھونڈا جائے تو "قرآنی جنت" کا استہزائی الفاظ میں تذکرہ کرنے والے نثر میں نہیں نظم ہی کے لباس میں تلمیحات و کنایات سے کام لینے والوں کی کافی تعداد آپ کو مسلمانوں میں مل جائیگی اس میں شک نہیں کہ بجائے خود فکری کے اس قسم کی باتیں بنانے والے زیادہ تر تقلیدی روایات ہی سے

سنا ترہیں، کچھ سن لیا اور لے اڑے اس سے زیادہ ان کے اشاروں اور کنایوں کی تہ میں اگر تلاش کیا جائے تو کچھ نہ ملے گا، ان بے چاروں کو اس کا قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کی بنیاد کیا ہے اور کس تخم سے یہ درخت پھوٹ کر نکلا ہے

بہرحال یہ بات کہ پانی پانی ہی ہے، مٹی مٹی ہے، الغرض جو چیز جو کچھ بن کر پیدا ہوئی ہے واقع میں بھی وہ وہی ہے۔ ہر چیز کے متعلق اس کلیہ کو مانتے ہوئے اچانک آدمی صرف آدمی کے متعلق یہ دعویٰ کہ واقع میں وہ فرشتہ ہے جو دنیا میں آدمی بن کر پیدا ہو گیا ہے۔ اس عجیب و غریب مفروضہ کی بنیاد کیا ہے؟ کم از کم باوجود انتہائی غور و فکر کے کوئی قابل قبول جواب اب تک سمجھ میں نہیں آیا فقط اس لئے کہ خالق کائنات نے آدمی کو اپنے لئے پیدا کیا ہے، محض اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی آدمی نہیں، بلکہ درحقیقت وہ فرشتہ ہے اس مفروضہ کے فرض کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی اس نصب العین کی تکمیل کے لئے آدمی کا آدمی ہونا کیا کافی نہ تھا؟

بلکہ اگر سوچا جائے تو نظر آتا ہے کہ "ملکوتیت" یا فرشتہ ہونے کا یہ بے بنیاد نظریہ جو بنی آدم کے متعلق گڑھ لیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اس مفروضہ نے تو سارے قصہ ہی کو ختم کر کے رکھ دیا۔

قصہ سے میری مراد یہ ہے کہ خدا نے عالم کو کیوں اور کس لئے پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں جیسے ضرورت اور حاجت کو پیش کرنا، خدا کی خدائی کے منافی ہے۔ یعنی خدا نے اس دنیا کو اس لئے پیدا کیا کہ (معاذ اللہ) وہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کا محتاج اور ضرورت مند تھا، بھلا اس قسم کی احمقانہ گستاخی کی کون جرأت کر سکتا ہے، اس طرح یہ کہنا کہ خدا کا یہ سارا تخلیقی کاروبار محض بے نتیجہ، لاحاصل و عبث ہے اس سے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ خدا ہی کا انکار کر دیا جائے، بے معنی، بے مطلب کاموں کے کرنے والوں کو جب آدمیوں کے جرگے سے نکال کر دیوانوں اور پاگلوں میں شریک کر دیا جاتا ہے تو آپ ہی سوچیے کہ اسی جنون اور دیوانہ پن کو خدا کی طرف منسوب کرنے والے درحقیقت خود ہی پاگل ہونے کے سوا کچھ اور بھی ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ صرف وہی تیسرا احتمال رہ جاتا ہے جس سے عموماً انسانی اعمال و افعال کی بھی توجیہ کی جاتی ہے، یعنی ناگزیر لابدی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، غور کیا جائے تو زیادہ اس کی تہ میں کارفرما یہی قدرتی قانون نظر آتا ہے[1]

---

[1] مقصد یہ ہے کہ اپنی خاکی زندگی میں آدمی کی پہلی ضرورت ہوا کی ہے جس میں وہ سانس لے، قدرت کی طرف سے اس کی تقسیم کا مفت انتظام کر دیا گیا، یعنی کسی قسم کی قیمت ادا کئے بغیر ہوا ہر جینے والے کو میسر آ رہی ہے، دوسری ضرورت پانی کی ہے ہوا کی طرح

(باقی آئندہ صفحہ پر)

یعنی نمود ظہور، یہی ہر کمال کی فطرت ہے۔ اسی قدرتی قانون کی تعبیر عارف شیراز نے اپنے اس مشہور شعر میں کی ہے۔

من از اں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

جس کا مطلب یہی ہے کہ حسن کا جو کمال یوسف میں پایا جاتا تھا وہ ظہور و نمود اس جمالی کمال کا فطری تقاضا تھا اور اسی فطری اقتضا نے اپنے ظہور و نمود کے لئے عشق زلیخا کو پیدا کیا، لیکن آئینہ بہرحال آئینہ ہے اگر وہ ٹوٹ جائے یا سرے سے پیدا ہی نہ ہو، تو اس سے حسینوں کے حسن میں ظاہر ہے نہ کوئی عیب ہی پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی بٹہ لگتا ہے۔ اسی مفہوم کو حافظ ہی نے اپنی غزل کے دوسرے شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

ز عشقِ بے کمالِ ما جمالِ یار مستغنی ست
بہ آب و رنگ خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اور حافظ تو خیر حافظ ہی ہیں، ہماری زبان کے شعراء بھی مختلف وادیوں میں بھٹکتے ہوئے کبھی کبھی الٰہیات کی وادی میں بھی نکل آتے ہیں۔ مرزا داغ مرحوم کا یہ شعر کہ۔

حاشیہ متعلق بہ صفحہ (۲۸۲) مفت تو نہیں ملتا لیکن اسی قدر ارزاں ہے کہ آمدنی کے ہر پیمانے پر بآسانی یہ ضرورت بھی ہر شخص کی پوری ہو رہی ہے۔ ضرورتوں میں تیسرا درجہ غذا کا ہے، خواہ کسی رنگ اور شکل میں ہو، پلاؤ قورمہ ہو یا نانِ جویں، واقعہ یہ ہے کہ اپنی اپنی آمدنی کے پیمانے کے لحاظ سے اپنی خوراک کو لوگ فراہم ہی کر لیتے ہیں ان ضرورتوں کے بعد لباس و مکان کا مسئلہ ہے، سچ پوچھئے تو ہر شخص کی ذاتی ضرورتیں اسی نقطہ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب آمدنی کے چھوٹے سے چھوٹے پیمانہ پر کسی نہ کسی شکل میں یہ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو پھر ساری انسانی سرگرمیوں کی توجیہ حاجت و ضرورت سے خود ہی سوچنا چاہیئے کہ کہاں تک درست ہو سکتی ہے بلکہ واقعہ یہی ہے کہ کمالات جنھیں لے کر آدمی پیدا ہوتے ہیں یا حالات و واقعات جن کمالات کو پیدا کرتے رہتے ہیں زیادہ تر یہ ان ہی کے ظہور و نمود کی شکلیں ہیں۔ شعری رجحانات والے اپنی شاعری سے خطابت کی صلاحیت رکھنے والے اپنی خطابت سے ہندسی مناسبتوں کے رکھنے والے ریاضی و الجبری سے اسی قبیل اسی قسم کے فطری ملکات کے ظہور کی یہ ہنگامہ آرائیاں ہیں یا ورزش کر کے جو اپنے بازوؤں میں غیر معمولی طاقتوں کو ابھارتے ہیں یا مال و جاہ کی راہ سے جن کے اختیار و اقتدار کے دائروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے ان ہی کمالات کی یہ نیا نمائش گاہ ہے۔ بہترین سواریوں، اونچی عمارتوں، طمطراق کے دوسرے ساز و سامان کی یہ ہیں اگر غور کیجئے گا تو کبھی نظر آئے گا کہ اپنے اپنے اختیار و اقتدار کے دائروں کی وسعت و کشادگی کو ان ہی ذرائع سے لوگ نمایاں کر رہے ہیں ۱۲

منہ سے بولے تو کہا آئینہ
کھیل کھیلے تو خود آرائی کا

اس میں "کھیل کھیلے" کے نامناسب لفظ کو بدل کر دوسرے مصرعہ کو اگر یوں پڑھا جائے کہ

تھا تقاضا یہ خود آرائی کا

تو یہ واقعہ ہے کہ "کمالات" کے اس نظریہ کی یہ بھی ایک دل آویز و دل نشین تعبیر ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید اور ترجمہ وتفسیر

از

(جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب)

(۴)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان اگست ۵۳ء)

قول غیر صحابی ہیں اولاً تابعین وتبع تابعین، پھر سلف صالحین یعنی ائمہ مجتہدین وفقہائے مفسرین کے اقوال قابل تسلیم ہونگے اور اسی ترتیب پر اُن کے مدارج ومراتب تسلیم کئے جائیں گے۔ اُن میں سے تابعین کا رتبہ تبع تابعین اور مابعد علماء سے بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ صحابہ رضو کے تعلیم یافتہ اور بیک واسطہ فیض نبوت حاصل کرنے والے ہیں لیکن اُن کے تاویلی اقوال وارشادات کو بھی اصول وقوانین کی تاویل سے تصحیح وتنقید کرنا پڑے گا اور دلائل وشواہد سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا حسب موقع وضرورت کام کرنا ہوگا۔ تنقید اور تصحیح وترجیح کا یہ کام علمائے مجتہدین اور فقہائے مفسرین کے ذمہ ہے عام اہل علم یا جمہور اہل اسلام کا یہ عہدہ اور منصب نہیں۔

اگر صحابی کی تاویل اور قرآن مجید کے متعلق کسی قول کے بارے میں دوسرے صحابی بھی متفق ہیں تو وہ تاویل قطعی اور واجب القبول ہوگی اور اگر دوسرے صحابی کی رائے مختلف ہوئی تو اُن میں سے ہر ایک کی رائے کے اتباع کا حق حاصل ہوگا جس کو چاہے اختیار اور قبول کر سکتے ہیں اس میں اپنی طرف سے ترمیم یا کم اور زیادہ کرنے کا اُمت کو کوئی حق نہیں پہونچتا۔

قواعد عربیت:۔ اس سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں (۱) زبان عرب کے اصول وقوانین (۲) کلام عرب کا اسلوب اور انداز بیان جو اُن کے طرز تخاطب، روزمرہ، محاورات، تحریر وتقریر اور نظم ونثر میں برتا جاتا ہے۔

عربی زبان کے اصول وقواعد میں علمائے ادب اور ماہرین السنہ نے چند علوم لازمی اور ضروری بتائے ہیں جن کے

بغیر عجم اور غیر عرب کو بلکہ اہل عرب کو بھی عربی زبان کی تحریر و تقریر پر وہ ملکہ راسخہ اور قدرت و مہارت حاصل نہیں ہوتی جو کسی زبان کے سیکھنے کے لئے ضروری ہے۔

عربی زبان میں لیاقت و کمال پیدا کرنے اور اس زبان پر اہل زبان اور اہل ذوق اصحاب کی مانند قابو پانے اور مہارت تامہ حاصل کرنے کے لئے جن اصول و قواعد کی پابندی ضروری ہے اور جن قوانین کو محفوظ اور مستحضر کر کے اس زبان کے مذاق بھی میں دخل پاکر کوئی شخص بار سوخ اور ماہر بنتا ہے وہ علوم یہ ہیں۔

لغت، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، ادب۔ کہ ان سات علوم کے بغیر کسی کو عربی زبان آہی نہیں سکتی اور قرآن مجید کے فہم اور ترجمہ و تفسیر و تاویل کے لئے ان علوم سبعہ کے علاوہ۔ قرأت و تجوید، اسباب نزول، تاریخ و قصص و اخبار، ناسخ و منسوخ، فقہ و اصول فقہ، اصول دین یعنی علم کلام و اصول کلام، حدیث و اصول حدیث، فرائض اور تصوف و اخلاق و سیاست مدن وغیرہ علوم کا جاننا بھی ضروری ہے۔

یہ سب علوم کسبی و اکتسابی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک علم کے بارے میں نصاب کی کتابیں مدون و مقرر ہیں اور درس و تعلیم میں داخل ہیں۔ ان کسبی علوم کے علاوہ ایک اور علم بھی ہے جس کو علم وہبی یا علم لدنی کہتے ہیں۔ یہ علم حق تعالےٰ کی طرف سے علم پر عمل کرنے والے کے دل میں انفار و الہام ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک عطیہ خداوندی اور انعام ربانی ہے جو عامل خیر اور صاحب تقویٰ عالم کو ودیعت فرمایا جاتا ہے اس کو علم موہبت بھی کہتے ہیں۔

حدیث نبوی (مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ اَوْرَثَہٗ (یا۔ وَرَّثَہٗ) اَللّٰہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ) میں اسی علم وہبی کی طرف اشارہ ہے۔ غرضکہ علوم کسبی کے حصول و تحصیل کے بعد بھی کتاب اللہ (اور اسی طرح سنن و احادیث و آثار) میں دخل دینے اور آیات و نصوص قرآنی یا متون حدیث کے معنے و تفسیر بیان کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں پہونچتا تاوقتیکہ کامل دیانت اور تقویٰ و طہارت قلب کے ساتھ علم پر عمل نہ کرے۔

اکتسابی علوم میں مہارت و کمال اور ایمان و عمل صالح پر قرآن مجید کے فہم و معانی کا انکشاف ہوتا ہے اور اسی پر کلام الٰہی کی تفسیر و تشریح کا استحقاق حاصل ہوتا ہے گویا یہ علم وہبی مترتب ہوتا ہے علوم کسبی کے حصول اور عمل صالح پر۔

قواعد عربیت سے کسبی اور وہبی دونوں قسم کے علوم مراد ہیں اور ان دونوں کے بغیر قرآن مجید کی تفسیر قت

بشری سے باہر ہے۔ اور انسانی سعی سے خارج۔ انسان کی قدرت میں نہیں ہے کہ کلام الٰہی کے معانی کی حقیقت اور قرآن مجید کے مفہوم و مراد پر ان علوم کسبی و وہبی کے بغیر اطلاع پا سکے۔

علوم کسبی تو ظاہر اور غیر محتاج دلیل ہیں کہ کیوں ان کا معلوم کرنا اور سیکھنا قرآن مجید کے فہم اور تفسیر و تاویل و ترجمہ کے لئے ضروری ہے اور اُن کے بغیر کیوں کلام الٰہی کی تفسیر نہیں کی جا سکتی اور اس کا فہم حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ علم وہبی کے تفسیر کا موقوف علیہ ہونے میں بظاہر شبہ پیدا ہوتا اور تردد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اس شبہ کو اہمیت کے ساتھ ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے۔

اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ علوم کسبیہ تفسیر کا مدار علیہ ہیں۔ ان کے حصول کے بغیر عجم و غیر عرب بلکہ اہل عرب کو بھی کلام اللہ کی تفسیر اور اس کے معارف و حقائق کی تشریح معلوم نہیں ہو سکتی۔ لیکن علم وہبی پر تفسیر کو موقوف کرنا یا رکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ علم وہبی۔ انسان کے بس کی چیز نہیں۔ اس کے قدرت و اختیار سے باہر اور اس علم کا اکتساب و حصول ناممکن تو تفسیر کا (جو کہ اہم ضروریات دین سے ہے) اس علم وہبی پر توقف و انحصار کیسے۔ ایسے غیر مقدور بشر فعل پر کلام الٰہی کی تفسیر کا (جو کہ ضروریات بدیہیہ و منبہیہ میں سے ہے) موقوف رکھنا کلام الٰہی کو چیستان اور معما بنا دینے کے مرادف ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں اور ہے بھی حقیقت یوں ہی کہ علوم وہبی اور معارف لدنی مقدور بشر نہیں مگر اُن کے حاصل کرنے اور پالینے کا طریقہ تو انسان کے قدرت و اختیار میں داخل، اور اس کی سعی اور کسب و اکتساب پر موقوف ہے اور ہماری مراد یہاں علم وہبی سے یہی ہے کہ عمل صالح۔ زہد و تقویٰ خشیت و ورع اور مکارم اخلاق جیسے اسباب و عوامل کا ارتکاب و اکتساب کیا جائے جس کے نتیجہ میں بطور وراثت انبیاء مبدء فیاض کی طرف سے علم لدنی اور علم وہبی کا فیضان و ورود اور کلام الٰہی کی تفسیر و تاویل اور اس کے فہم و تفقہ کے لئے نور فراست حاصل ہو۔

اور ظاہر ہے کہ علم لدنی کا فیضان اور علم وہبی کا ورود۔ علم پر عمل کرنے والے اور تقویٰ و عمل صالح کرنے والے انسان پر قدرت کی طرف سے فائض و وارد ہوتا ہے اور گو یہ نعمت و موہبت انسان کے اپنے قدرت و اختیار سے باہر ہے مگر اس کے ذرائع و اسباب اور وسائل و عوامل کا حصول تو ممکن اور داخل قدرت و سعی انسان ہے۔

علوم کسبیہ کے حصول کے بعد اگر تقویٰ اور عمل صالح کے ذرائع و اسباب اختیار نہیں کیے گئے تو یہ صحیح کہ زبان عرب اور اسلوب عربیت سے کماحقہ آگاہی ہوگی مگر کلام الٰہی کی مراد، اس کا فہم اور اُس کے ترجمہ و تفسیر میں غیبی امداد اور نور ہدایت حاصل نہ ہو سکے گا اور دین و شریعت کے نقلی، عقلی بنیادی اصول کے مطابق نئے نئے مضامین و مطالب نکالنے اور استنباط و استخراج کی توفیق نہ ہو سکے گی جس کی بنا پر مراد الٰہی کی حقانی حقیقت روشن اور واضح نہ ہو سکے گی۔

صاحب برہان سے علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں نقل کیا ہے کہ معانی وحی کا فہم اور اسرار وحی کا کشف و ظہور اس آدمی کو نہیں ہو سکتا جس کے دل میں

۱۔ کسی قسم کی بدعت (احداث فی الدین) کا خیال جاگزیں ہو۔ یا

۲۔ اس میں تکبر کی بو ہو۔ یا۔ (۳) وہ خواہش نفس کو ترجیح دینے کا خوگر ہو۔ یا۔ (۴) دنیا کی محبت اس کے دل میں ہو۔ یا۔ (۵) وہ کسی گناہ پر مصر ہو۔ اگرچہ وہ گناہ حقیر اور معمولی ہی درجہ کا ہو۔ یا۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ وحی پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یعنی سرے سے ایمان ہی نصیب نہ ہو۔ یا اگر ہو تو کمزور درجہ کا ہو۔ یا۔ ۷۔ ایسے شخص کے قول پر عمل کر بیٹھے (الف) جس کو حقیقت میں اس کا علم ہی نہ ہو۔ یا (ب) جو اپنی عقل پر بھروسہ کیے ہوئے ہو۔

یہ سب امور، وحی الٰہی کے معانی و اسرار اور اس کے فہم و کشف مراد اور ایضاح و انشراح کے لیے حجابات و موانع ہیں ایک دوسرے سے زیادہ سخت اور مؤکد۔

البتہ جو شخص علوم کسبی کے حصول کے بعد تقویٰ اور عمل صالح اختیار کرے وہ علوم وحی کا مورد و محل بنتا ہے۔ اس سے یہ تمام رکاوٹیں اور حجابات و موانع دور کر دیئے جاتے ہیں اور اسی شخص پر فراست ایمانی اور انشراح صدر کے ساتھ کتاب اللہ کے اسرار اور فہم و مطالب واضح و منشرح ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے ہی لوگوں کو فہم کی توفیق ملتی اور عالم غیب سے ان ہی کی دستگیری ہوتی ہے۔

"بحسب طاقت بشری" کی قید کا مطلب۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ وہ علوم و معارف اور حقائق و بصائر جو انسان کی طاقت سے برتر و بالا ہیں۔ یعنی انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خاص علوم اور مخصوص ادراکات جو کہ منصب نبوت و رسالت کی وجہ سے ان کو عالم الغیب والشہادۃ

کی طرف سے ملتے ہیں اور عام انسانی علوم سے نہیں بلکہ افاضل عقلائے زمانہ اور یکتائے روزگار داناؤں کے علوم سے بدرجہا بلند و برتر ہوتے ہیں اس تعریف سے نکل جائیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ ادنیٰ اور کمتر درجے کے علوم جو طاقتِ بشری کی حد تک نہیں پہونچتے بلکہ ان سے کم اور بہت کم ہوتے ہیں۔ اس علم کی تعریف میں داخل نہ ہونے پائیں۔ جیسے ان لوگوں کے علوم جو عوام الناس و جہال اور عقل و دین سے بیگانہ لوگ ہیں، بنیے بقال وغیرہ۔ چونکہ علم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ الٰہی اور بشری۔ الٰہی وہ علوم جن کا مبدء فیاض و علام الغیوب کی طرف سے فیضان و وُرُود ہوتا ہے۔ آسمانی صحیفے اور کتابیں وحی و الہام القاء و عرفان و کشف اسی میں داخل ہیں۔ اور اس میں انسانی عقل و ادراک اور قواعد و اسباب کے کسب و اکتساب کو کچھ دخل نہیں ہوتا یہ محض الٰہی فیضان اور ربانی تعلیم ہے اسی کو سمعیات و نقلیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ انبیاء و رسل کی نسبت اسی علم سے ہے۔

بشری وہ علوم جن کا مبدء و منشا انسان کی اپنی ذات ہے۔ یعنی وہ علوم اگرچہ انسان کو قدرت کی دی ہوئی قوتوں ادراک سے ملتے ہیں۔ مگر ان میں قدرت الہیہ کا وہ فیضان و وُرُود نہیں جو اس کے علم اور اس کے کلام کا تقاضا ہے۔ یہ علوم آلات جسمانی اور حواس خمسہ ظاہری و باطنی سے مدرک و محسوس اور معلوم و مشاہد ہوتے ہیں۔

چونکہ انسان کے پاس اس علم کے حاصل کرنے کے دو ذریعے یا واسطے اور طریقے ہیں۔ ایک حواس (ظاہری) جس میں باصرہ، سامعہ، شامہ۔ ذائقہ اور لامسہ کی قوتیں، اور سمع و بصر، ذوق و سمع، و لمس کے قویٰ و مشاعر کا کام کرتے ہیں۔ دوسرے قوتِ ادراک و تعقل۔ حواس باطنی۔ لیکن علم کے حصول کا ان دونوں سے اعلیٰ اور صحیح ترین طریقہ وہ ہے جس کو خبر صادق یا نقل و سمع کہتے ہیں۔ یہ علم حواسِ ظاہری و باطنی کے علوم و ادراکات پر غالب و محیط ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اس مدبر و صانع حکیم مطلق کا علم ہے جو ماہیات و حقائق اور نفس الامری معلومات پر غالب و محیط اور اُن کا مالک و خالق ہے۔ اسی نے انسانوں کے اعلیٰ ترین مخصوص طبقہ کو جن کو انبیاء و رسل کہا جاتا ہے اپنا یہ علم بتایا اور سکھایا ہے۔ یہ خاص درجہ علم کے کمال کا درجہ ہے جو انبیاء و رسل کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد صدیقین کا مرتبہ ہے اور پھر عام صلحاء و مومنین کا حسب مراتب عقل و فہم ذہنیت و استعداد، علم الٰہی ہر انسان کی تمام ذمہ داریوں اور شرعی احکام کی تعمیل کا دار و مدار ہوتا ہے اسی ذمہ داری کو زبانِ شرع میں "تکلیف" کہتے ہیں۔ خدا کا کلام اور اس کے معانی دنیا کی ان نعمتوں میں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں بہترین اور اعلیٰ ترین نعمتیں ہیں۔ حقانی علوم اور شرعی تعلیمات ان ہی سے وابستہ ہیں

عادت اللہ اور ارادۂ الٰہی عالم کے تمام امور میں ایک خاص نظم وتنظیم سے جاری ہے اور ایک امرِ محکم اور اصولِ مستقیم پر یہ تمام سلسلہ قائم دبرپا اور اسی ایک مرکز ومحور پر گھوم رہا ہے۔ کلام اللہ اور اس کے مطالب ومفاہیم بھی اسی نظم وضبط اور معقول ومستحکم طریق پر ہیں۔ ان کے فہم وعلم اور اخذ وحصول کے لئے سلیم عقل۔ صحیح سلیقے اور ذوق انسانی کے مناسب حال تربیت کی ضرورت واحتیاج ہوتی ہے جو انبیاء ورسل کی سیرت اور ان کے اقوال وافعال واحوال سے حاصل ہوتی ہے۔

دنیا کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت حاصل کرے اور اس کی معرفت حاصل کر کے اس کی عبادت کرے اور اس کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ اور دنیا کی تمام اشیاء انسان کی اطاعت وخدمت کے سلئے اور اس کے نفع واعانت کے لئے وجود میں لائی گئی ہیں۔ معرفت وعبادت کا طریقہ جو انسان کے مناسبِ حال اور لائقِ شان طریقہ بر حسب آیات ونصوص وہ ہے جو خدا نے انسان کی طبیعت اور استعداد وفطرت میں رکھ دیا ہے۔ انسانوں میں معرفتِ ربانی اور عبادتِ الٰہی کا ظہور انبیاء ورسل اور اُن کے صحیفوں اور کتابوں کے ذریعے ہوا ہے۔ اگر انبیاء ورسل اور ان کی کتابیں اور صحیفے نہ ہوتے تو انسان معرفت وعبادت کے طریقوں سے واقف نہ ہوتے اور نہ راہِ معرفت وعبادت پر مستقیم ہو سکتے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد خدا کی معرفت وعبادت اور اس مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ کتاب اور نبی ورسول ہے۔ قیامت تک اس دور کی آخری اور کامل کتاب قرآن مجید اور آخری نبی سید الموجودات ہادی عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ نص صریح ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ۔ اور اسی آیتِ پاک کی گویا تفسیر ہے اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ

(موطاء مشکوٰۃ) آیتِ پاک کا ترجمہ یہ ہے کہ اے دنیا کے لوگو اور تمام انسانو! تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کر سکتے ہو، حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول موجود ہے۔ اور حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ ہادیِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے دنیا کے انسانو! میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ ان دونوں کو تم جب تک مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ "اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت" انبیاء ورسل اور کتب وصحائف کی تعلیم شریعت الٰہیہ ہے اور یہی حکمت حقہ ہے۔ کتب وصحائف میں الٰہی معرفت وعلم ہوتا ہے اور

اس الٰہی معرفت وعلم کی عملی صورت، انبیاء ورسل کی سیرت اور اُن کے اقوال وافعال واحوال ہوتے ہیں۔ جو حکمتِ حقہ کہلاتی ہے۔ اسلام میں۔ قرآن مجید اور سنتِ نبوی[۱]۔ ان دونوں چیزوں کو دنیا کے آخر اور قیامت تک، انسانوں کی ہدایت کا سرچشمہ بنایا گیا ہے

کتاب اللہ متن دین ہے، اور سنت ہے شرح اس کی

تمسک ان کا جان ودل سے لازم ہے ہر انسان کو

اس حکمتِ حقہ اور شریعتِ الٰہیہ میں کوئی فرق نہیں اور یہ حکمت، شریعت کے مخالف ومتضاد نہیں بلکہ دونوں ایک ہیں اور دونوں کا مقصود بھی ایک یعنی حق تعالےٰ کی معرفت وعبادت۔ یہی معرفت وعبادت اگر وحی والہام سے حاصل ہو علم کے درجہ میں ہو تو رسالت ونبوت ہے اور اگر کسب وسلوک سے حاصل ہو۔ سعی وعمل سے حاصل ہو تو حکمت۔ "یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ"۔ یعنی شرائع اور اس کے اسرار وحِکَم کی تعلیم وتفہیم، سیرت نبوی اور اسوۂ حسنۂ نبویہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

رؤس ثمانیہ وہ آٹھ باتیں جن کو دوسرے علوم وفنون میں مقصد سے قبل ذکر کیا جاتا ہے اس علم میں حسب تفصیل ذیل ذکر کیجاتی ہیں۔

۱۔ غرض خاص۔ یعنی اس علم کے حاصل کرنے میں کیا خاص فائدہ ہے۔ تاکہ یہ علم حاصل کرنے والے کی نظر میں بیکار نہ معلوم ہو، علم تفسیر کی خاص غرض یہ ہے کہ قرآن مجید اور نظم کلام اللہ کے معانی ومطالب سے ہر انسان معرفتِ تامہ اور علم کامل حاصل کر کے دنیا کی زندگی میں فلاح یاب اور آخرت میں سعادتِ حقیقی کے ساتھ کامیاب ہو سکے۔

۲۔ منفعت عام۔ یعنی اس علم کا عمومی فائدہ جس کی وجہ سے عام انسانوں کی طبیعتوں کو اس علم کے حاصل کرنے کا شوق اور اس کی تحصیل میں مشقت برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو۔

اس علم کی منفعتِ عام یہ ہے کہ ہر انسان اپنی دینی ودنیاوی ذمہ داریوں کو، اپنے فرائضِ زندگی کو قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں صحیح طریقہ پر ادا کر سکے۔ برائیوں سے بچ سکے۔ بھلائیوں اور خوبیوں سے متصف ہو سکے۔ دنیا اور دین دونوں کو بگڑنے سے بچائے اور دنیا وآخرت میں فلاح پا کر دائمی مسرت اور ابدی راحت سے ہم کنار ہو جس کے لئے تفسیر وتاویل کلام اللہ

---

[۱] یعنی۔ شریعت الٰہی اور حکمت حقانی۔ ۱۲

کا سمجھنا اور معلوم کرنا کسی نہ کسی صورت سے ضروری ہو۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی دی ہوئی قوتِ عقلی و عملی کو اس کے کلام اور اس کے بتائے اور سکھائے ہوئے اصول و تعلیمات کے مطابق کام میں لائیں

۳۔ عنوان کتاب، یا عنوانِ علم۔ جس سے اس کتاب یا علم کے مضامین کا اجمالی علم اور فی الجملہ بصیرت ہو۔

(الف) عنوانِ کتاب کے اعتبار سے قرآن مجید انذار و تبشیر اور ان کے اصل اصول یعنی توحید کی کتاب ہو جیسا کہ سورہ کہف کی ابتدائی چند آیات سے ثابت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝

ماحصل یہ ہے کہ قرآن پاک خود بتلاتا ہے

سب تعریفیں اسی اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اپنے خاص اور مقرب بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب اتاری، جس میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی افراط و تفریط ہے جس کی تعلیم نہایت معتدل، صحیح اور ہر زمانہ، ہر رنگ اور ہر طبیعت کے مناسب ہے۔ یہ کتاب کجی سے خالی، پہلی آسمانی کتابوں کی اصولی تعلیم کی تصدیق کرنے والی اور ان کو دنیا میں قائم کرنے والی ہے۔ یہ کتاب اس سخت آفت سے جو دنیا یا آخرت میں انسانوں پر آنے والی ہے ـــــ آگاہ اور خبردار کرتی ہے۔ اور ایمان لانے والوں کو جو کہ نیک کام کرتے ہیں دائمی خوشی اور ابدی راحت کی خوش خبری دیتی ہے اور جو لوگ خدا کی توحید اور اس پاک ذات کی شانِ تنزیہ و تشبیہ میں بدیہی البطلان باتیں کہتے ہیں ان کو ڈر سناتی اور خوف دلاتی ہے۔

(ب) اور عنوانِ علم کے اعتبار سے قرآن مجید "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" اور اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ کی نصوصِ صریحہ کی بنا پر مخلوق کو جہالت کی ظلمت سے نکال کر علم کی روشنی میں لانے والا۔ انسانوں کو ان کی جسمانی و روحانی ہدایات دینے والا۔ خیر و شر، برائی بھلائی، نیکی بدی، ہدایت و ضلالت ایمان و کفر اور دنیا و آخرت کی تمام باتوں کو صاف اور واضح طور پر بتلانے والا ہے۔ گویا کتاب اور علم دونوں اعتبار سے قرآن مجید کا اولین مقصد انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلانا۔ معتدل اور متوسط راہ پر قائم کرنا۔ اور اس مقدس نورانی کلام کے ذریعہ ہر مرد و عورت اور نر و ناری کو اپنی صفتِ علم و نورانیت کا مظہر بنانا ہے تاکہ دنیا میں فلاح

اور آخرت میں نجات سے بہرہ ور ہوجائیں ۔ علم قرآن میں " توحید " ام العلوم ہے اور انذار و تبشیر ۔ ڈرانا اور خوشخبری دینا ۔ یا تعمیل امر و نواہی، احکام شرعیہ اور حکمت حقانیہ اس کی طویل الذیل اور کثیر الشیوع شاخیں ہیں ۔ قرآن مجید کا اساسی مقصد علم و تعلیم، اور قرآن مجید کی تلاوت، اس کا فہم اور اس پر عمل یہ اس اساسی مقصد کے کامل کرنے والے اجزاء و فروع ۔ ایک دوسرے پر موقوف و مبنی ۔ علم و تعلیم اور تلاوت و فہم کا اصل مقصد عمل اور صرف عمل ہے ۔ حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ جو بشتیہ بزرگوں کے سرتاج اور حضرات محدثین کرام کے نزدیک نہایت مستند و معتمد ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ " قرآن مجید اول سے لیکر آخر تک اللہ کا کلام اور تمام کا تمام ہماری طرف اس کا پاک پیغام ہے ۔ ہمارے لئے دنیا کے مصائب میں اس سے بڑھ کر اور کونسی مصیبت ہوسکتی ہے کہ ہم اس پاک کلام اور پیغام کو دن رات پڑھیں اور اس پر عمل نہ کریں "

(آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام سے جن امور کے متعلق پرسش ہوگی قرآن مجید والوں اور اس کے محافظوں سے بھی ان ہی باتوں کے متعلق سوال ہوگا ۔ کیونکہ قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو حکم یہ ہے کہ اس کے کسی حکم میں کوتاہی اور سستی نہ کریں ۔ تمام احکام پر دل و جان سے عمل کریں)

(اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن پاک کا مرتبہ یہ نہیں ہے اور یہ کتاب اس درجہ کی نہیں ہے کہ اس کا پڑھنے والا اور حفظ کرنے والا اللہ کی نافرمانی اور گناہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے ۔ قرآن پاک کا ہر ایک لفظ بلند آواز سے پکار رہا ہے کہ ۔ اے انسان ۔ تجھے تیرے پیدا کرنے والے کا واسطہ ۔ جب تو نے مجھے پڑھا اور حفظ کیا تو اب میری مخالفت نہ کر ۔ اس لئے قرآن پڑھنے والے اور حافظ قرآن کو مناسب نہیں کہ وہ غافل اور لاابالی لوگوں کے ساتھ لہو و لعب اور واہیات و خرافات میں شریک ہو ۔)

(آپ کے صاحبزادے خواجہ علیؒ بن فضیلؒ کہتے ہیں کہ ۔ قرآن مجید سے فقط تلاوت مقصود نہیں بلکہ عمل اور صرف عمل مقصود ہے ۔ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہے اور اس کو ختم کرکے خوش ہوجاتا ہے لیکن اس کے نصائح و زواجر اور بصائر و عبر میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی اپنے نفس کا مواخذہ نہیں کرتا ۔ خود آپ کی کیفیت قرآن پاک کی تلاوت کے وقت یہ ہوتی تھی کہ جب آپ تلاوت کرتے تو اس قدر روتے کہ سورت کو ختم نہیں کرسکتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو آدمی قرآن شریف پڑھے اور تلاوت کے وقت اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں پر آنسو نہ بہائے وہ معذور ہے

(باقی)

جزیرۂ قوصرہ

از مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسۂ عالیہ کلکتہ

اسلامی تاریخ میں اندلس، صقلیہ، اقریطش، اور سردانیہ جیسے وسیع وعریض جزیروں کا ذکر نہایت جلی اور روشن عنوانوں کے تحت نظر آتا ہے لیکن انہیں جزیروں کے آس پاس کئی ایک چھوٹے جزیرے بھی ہیں جن کی طرف ہماری توجہ عموماً ضمنی طور پر ہی منعطف ہوتی ہے حالانکہ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی عربوں کی سطوت وحکومت کے زریں نقوش ہماری نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک چھوٹے جزیرہ سے آیندہ سطروں کا تعلق ہے جس کا نام موجودہ جغرافیہ میں بہ ظاہر کچھ سے کچھ ہو چکا ہے، عرب مورخین وجغرافیہ نویس اس کا نام قوصرہ بتاتے ہیں اور اب اسی جزیرہ کو بنطلاریہ (PANTELLARIA) کہتے ہیں۔

تیونس کے ایک نامور محقق حسن حسنی عبدالوہاب باشانے اس جزیرہ کی اسلامی تاریخ وتمدن اور یہاں کی موجودہ نسل کی زبان، تہذیب اور کلچر پر عرب فاتحین کے اثرات کی جستجو میں ایک مختصر لیکن مفید ومحققانہ مقالہ شائع کیا تھا[1] اسی عربی مقالہ کا خلاصہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں لیکن اصل خلاصہ پیش کرنے سے پہلے اس جزیرہ کے نام، جغرافیائی موقع، اور عربوں سے قبل یہاں کی تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

نام کے متعلق خود مقالہ نگار کی تحقیق یہ ہے کہ قوصرہ عربی زبان میں زنبیل کے معنی رکھتا ہے جزیرہ کی ہیئتِ ارضی کو زنبیل سے جو صوری مناسبت ہے اسی بنا پر اس کو قوصرہ کا نام دیا گیا عربوں کے ورود سے پیشتر اس کا نام (COSSYRA) تھا جس کے معنی یونانی میں بھی زنبیل کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عربی میں یہ لفظ یونانی سے آیا ہو، گو کہ حضرت علی بن ابی طالب کی طرف منسوب ایک بیت میں اس لفظ کا استعمال زنبیل یا ٹوکرے کے معنی میں ملتا ہے۔

افلح من کانت لہ قوصرہ   یاکل منہا کل یوم مرہ

---

[1] المجلة التاريخية المصرية : ج ۲ ع ۲ ص ۵۵ - ۷۰۔

ایک لغوی احتمال یہ بھی ہے کہ قوصرہ کا اشتقاق فنیقی زبان کے لفظ " قصرۃ " کی تصغیر " قیصرۃ " سے قرار دیا جائے اور بہت ممکن ہے کہ واقعہ بھی یہی ہو اس لئے کہ فنیقی زبان بحر روم کے جزیروں اور شمالی افریقہ میں عام تھی اس لفظ کے معنی فنیقی میں بھی وہی ہیں۔ غرض اس نام کا قصہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ موجودہ نام (PANTELLARIA) جو عربوں کے زوال کے بعد اسپین کے فاتح عیسائیوں کا رکھا ہوا ہے اس کے معنی بھی زنبیل یا ٹوکرے کے ہیں۔ قوصرہ کے املا سے متعلق یاقوت نے مشہور لغوی ابن القطاع کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ وہ قوصرا الف سے لکھتا تھا۔

یہ جزیرہ صقلیہ اور تونس کے درمیان بحر متوسط میں (کیپ گرانی ٹولا سے ساٹھ میل جنوب اور کیپ بون سے ۴۵ میل مشرق) واقع ہے۔ اس کا رقبہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے ۴۵ مربع میل بیان کیا ہے زمین زرخیز لیکن صاف پانی سے محروم ہے۔ یہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے برکانی جزیرہ ہے چنانچہ اس کے تیز دھاروں کے چشمے اب تک برکانی عوامل کے اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کے خاموش آتش فشاں کا دہانہ سطح آب سے ۲،۷۴۳ فٹ بلند ہے۔

یہاں کی تاریخ میں قرطاجنہ سے پہلے بنی نوع انسان کے کسی اور جتھے کا سراغ نہیں ملتا۔ ۲۱۷ء ق۔م میں رومن امپائر کا قبضہ ہوا اور رومن شہنشاہیت کے دور میں شاہی خاندان کے ارکین اور معزز شخصیتوں کو اسی جزیرہ میں جلا وطن کیا جاتا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں قوصرہ کے مضمون نگار نے ابن تغری بردی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تاریخ اسلام کا مشہور شقی ابن ملجم اسی قوصرہ میں[1] جلا وطن تھا۔ بہرحال قوصرہ کی قسمت بڑی حد تک جزیرہ صقلیہ سے وابستہ رہی اور دونوں جزیرے زیادۃ اللہ الاول اغلبی کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ واقتدار میں آگئے۔ ویسے

---

(۱) النجوم الزاهرة: ج ۱ ص ۱۳۷ (لیڈن ۱۸۵۵ء)۔ ابن ملجم کے متعلق مورخین کا متفقہ کلمہ یہ ہے کہ حضرت حسن نے اس کو قتل کروا دیا تھا اور لوگوں نے اس کی لاش کو چٹائی میں لپیٹ کر یا کسی ٹوکرے میں بھر کر جلا دیا تھا۔ طبری کے الفاظ ہیں کہ:۔ فأدرجوه فی بواری ثم احرقوه بالنار (ج ۳ ص ۱۱۲ الاستقامۃ ۱۹۳۹م) ابن الاثیر کے الفاظ بھی تقریباً یہی ہیں۔ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ (ج ۷، ص ۳۳۰) میں مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے آخر میں یہ لکھا ہے کہ:۔ ثم قطعوا لسانہ ثم قتلوہ ثم حرقوہ فی قوصرۃ۔ یہاں قوصرہ سے مراد جزیرہ بنطلاریہ نہیں بلکہ اس کے معنی ٹوکرا کے ہیں۔ النجوم الظاہرہ جلد اول مجھے نہیں مل سکی تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس میں بھی عبارت کی یہی نوعیت ہوگی جو ابن کثیر کے یہاں ہے اور بہت ممکن ہے کہ قوصرہ کے مضمون نگار سے ابن تغری بردی کا بیان سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو۔

اسلامی حملوں کی ابتدا ان جزیروں پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت ہی سے ہو چکی تھی۔ ابن الاثیر[۲] ۲۲۰ھ۔ ۸۳۴ء میں جزیرہ قوصرہ پر مسلمانوں کے ایک حملہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس حملہ کا مقصد مفتوح قوم کی باغیانہ سرگرمیوں کو ختم کرنا ہوگا اس لئے کہ قوصرہ پر اسلامی قبضہ کا زمانہ یقیناً جزیرہ صقلیہ پر مسلمانوں کے تسلط سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۶۱۶ھ ہجری (۲۳-۱۲۲۲م) میں جب عیسائیوں کی مہم جزیرۂ صقلیہ کی بازیابی میں کامیاب ہوئی تو جزیرۂ قوصرہ سے بھی مسلمانوں کی عملداری بتدریج ختم ہو گئی۔ پھر اس جزیرہ میں مسلمانوں کا وجود کب تک باقی رہا اور آخر میں اُن کا کیا حشر ہوا۔ یہ تمام باتیں اصل مضمون کے خلاصہ میں آپ کے ملاحظہ سے گذریں گی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس جزیرہ پر عرب حکمرانوں کے اثرات کہاں تک باقی ہیں۔ جے۔ ایچ۔ کریبرس صاف لفظوں میں اعتراف کرتا ہے کہ قوصرہ یعنی موجودہ پنطلاریہ کے ایطالوی لب و لہجہ پر عربی زبان کا اثر و رسوخ زمانہ حال تک قائم رہا اور عربی زبان اٹھارہویں صدی مسیحی کے اواخر تک یہاں مستعمل رہی۔ مزید تفصیل خود حسن حسنی عبدالوہاب پاشا کی زبانی سُنیں۔

بحر متوسط (روم) کے مغربی ساحل سے قریب کئی ایک جزیرے ہیں۔ ان میں سے بعض کی مساحت افریقہ کے طول و عرض سے بڑھ جاتی ہے۔ اور بعض اتنے چھوٹے ہیں کہ تونسی اضلاع میں سے کسی ایک کی مساحت کو نہیں پہونچتے، یہ چھوٹے بڑے جزیرے جو نیلگوں سمندر کی سطح پر نقطوں کی شکل میں نظر آتے ہیں عرب فاتحین کی عقابی نظروں سے اوجھل نہیں تھے۔ عرب اپنے ترقی و عروج کے عہد میں ان جزیروں سے اچھی طرح واقف تھے اور یہاں ان کی حکومت طویل عرصہ تک قائم رہی۔ ان جزیروں میں عرب جتھوں اور نومسلم بربروں کی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں اور تمدن و تہذیب کے جملہ وسائل ان غیر آباد علاقوں میں اختیار کئے گئے تھے۔

سردانیہ۔ کرسکہ اور اندلس کے مشرق میں میورقہ، منورقہ، یابسہ۔ ان میں سے کہاں فرزندان توحید کے قدم نہیں پہونچے تھے۔ بحر متوسط کا مشہور جزیرہ صقلیہ جس کی وسعت ممالک افریقہ سے تین گنا زیادہ ہے، پیہم حملوں کے بعد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں دولت اغالبہ قیروان کے قلمرو میں شامل ہوا۔ چھوٹے جزیروں میں سے مالٹا اور اس کے قرب و جوار پر بھی عربوں کا قدم ایسا مضبوط جم گیا تھا کہ آج بھی ان جزیروں میں مشرقیت کی روح باقی ہے اور ایک چھوٹا جزیرہ تونسی علاقہ سے قریب ہی شمال مشرق کی سمت واقع ہے جہاں کی موجودہ نسل میں فاتح مسلمانوں کے عروج و اقتدار کے باقی ماندہ نقوش زمانہ حال تک مشاہدہ میں آتے ہیں۔ یہ جزیرہ اب پنطلاریہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) الکامل - ج ۶ - ص ۲۳۹ (یورپ) — ج ۵ ص ۱۸۸ (المنیریہ)

قوصرہ کا موقع

جزیرہ قوصرہ، افریقہ اور صقلیہ کے بیچ راستہ میں واقع ہے۔ اس کی مساحت تقریباً ۴۵ مربع میل ہے اور آبادی دس ہزار سے زیادہ نہیں۔ اس طرح یہ جزیرہ تونس کے درمیانی درجہ کے شہر المہدیہ یا نابل کے برابر ہے۔ جزیرہ میں ایک محفوظ بندرگاہ ہے جو قریبی زمانہ میں اطالیہ کی فضائی طاقت کا زبردست مرکز تھا۔

یہاں کے باشندوں کے مختلف شعبۂ زندگی پر عربوں کے جو اثرات غالب تھے ان کی تشریح سے پیشتر اس جزیرہ کے متعلق عرب جغرافیہ نویسوں کے معلومات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں کا بیان

چھٹی صدی ہجری کا مشہور مغربی جغرافیہ داں الادریسی[1] اس جزیرہ کو افریقہ کے حصن اقلیبیہ کے موازات میں صقلیہ کے مشہور شہر الشاقہ (Sciacca) اور مازرہ (Mazara) کے درمیانی خط فاصل کی سیدھ میں بتاتے ہوئے یہاں کی زرخیزی کی شہادت دیتا ہے، زیتون اور جنگلی بکروں کی کثرت کا ذکر کرتا ہے اور جزیرہ کے جنوبی حصہ میں ایک محفوظ بندرگاہ کا پتہ دیتا ہے۔

یاقوت حموی[2] اس جزیرہ کا موقع المہدیہ اور تونس کے درمیان بتانے کے بعد لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے عہد میں اس کو فتح کر لیا تھا اور تھوڑی مدت تک اُن کے قبضہ میں رہنے کے بعد ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے زمانہ (ساتویں صدی ہجری) میں یہاں خوارج کی ایک جماعت وہبیہ کے وجود کا ذکر کرتا ہے۔

ابن سعید غرناطی[3] المتوفی ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) کہتا ہے کہ جزیرہ قوصرہ جہاں سے انجیر اور نفط کی برآمد ہوتی ہے اور جہاں مصطگی کے درخت پیدا ہوتے ہیں، صقلیہ کے فرنگیوں کے ماتحت رہنے والے مسلمانوں کا جزیرہ ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ یہیں سے مسلمانوں نے جزیرہ صقلیہ کو فتح کیا تھا۔

ابوالفداء (م ۷۳۲ھ / ۱۳۳۲ء) تقویم البلدان میں اس جزیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں مصطگی کا درخت ہوتا ہے اور یہیں سے انجیر اور روئی کثیر مقدار میں برآمد کرتے ہیں۔

ابن فضل اللہ العمری[4] کتاب مسالک الابصار میں لکھتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی جماعت مقررہ ٹیکس ادا

---

(۱) نزہۃ المشتاق

(۲) معجم البلدان : ج ۷، ص ۱۸۳ - طبعۂ مصر

(۳) نورالدین علی بن سعید : کتاب بسط الارض فی طولہا وعرضہا - مجموعہ اماری ص ۱۳۴

(۴) مسالک الابصار فی ممالک الامصار - ابن فضل اللہ - نسخۂ جامع زیتونہ۔

کر کے عیسائیوں کے ذمی کی حیثیت سے رہتی بستی ہے اور ایسے مسلمان جو فرنگیوں کے ماتحت رہیں بلادِ مغرب میں مدجنین کے نام سے مشہور ہیں۔

اسلامی بحریہ بحر متوسط میں

توصرہ کے متعلق اسلامی جغرافیہ نویسیوں کے معلومات کا خلاصہ بہم پہونچانے کے بعد ہم عربوں کے تسلط و استیلاء کی تاریخ کی طرف ناظرین کی نگاہ پھیرتے ہیں کہ بلادِ افریقہ میں جب عربوں کے قدم مضبوط جم گئے اور خاص طور پر افریقہ کے اہم مرکز قرطاجنہ کو بزنطینی حکومت کے ہاتھوں سے چھین لینے میں قرنِ اول کی اخیر چوتھائی (ساتویں مسیحی کے اواخر) میں کامیاب ہونے کے بعد تو عربوں کے لئے ضروری تھا کہ افریقہ اور یورپ کے درمیانی جزائر کی تسخیر کی مہم شروع کریں ورنہ دولت بزنطینیہ زمین کا جو رقبہ کھو چکی تھی اس کی بازیافت کے لئے بھی آئے دن کوشاں تھی۔ لہذا رومی حملوں سے اسلامی قلمرو کے اطراف و جوانب کو بچائے رکھنا اور ساتھ ہی بحر روم کے ماورار ملکوں پر اسلامی قبضہ و اقتدار کا قائم کرنا ان جزیروں کی تسخیر کے بغیر ناممکن تھا جہاں رومیوں کی دفاعی طاقت مورچے جمائے تھی۔ انہی دواعی کے ماتحت اموی وُلاۃ کی توجہ افریقہ پر کلی غلبہ حاصل کرتے ہی جہاز سازی کے کارخانہ (دارالصناعۃ) کے قیام کی طرف منعطف ہوئی اور اسلامی تاریخ میں قرطاجنہ کا دارالصناعۃ اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا بحری کارخانہ تھا جسے عربوں نے کسی اتفاقی امر کی بنا پر نہیں بلکہ اموی اربابِ تدبر و سیاست کے اشارہ سے قائم کیا تھا۔ اس دارالصناعۃ کی بنیاد تقریباً ۸۰ھ ۶۹۹ء میں حسان بن النعمان غسانی نے ڈالی اور اس کے لئے تمام ضروری سامان اور عملہ فراہم کئے۔ مصر سے ایک ہزار قبطی مع اہل و عیال اسی کارخانہ کو چلانے کے لئے افریقہ لاکر بسائے گئے۔ اور یہ سب کچھ خلافت بنی امیہ دمشق کی پالیسی اور دنیائے اسلام کے مدبرین و ماہرین سیاست کی رائے کے مطابق انجام پا رہا تھا۔

دارالصناعۃ کے کھلتے ہی عربوں کی بحری سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا چنانچہ افریقہ کے جنگی بیڑے بحر متوسط کی لہروں سے کھیلتے اور جزائر و سواحل کے فرنگیوں سے ٹکراتے نظر آنے لگے اور بحری غزوات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا رومیوں کے بہت سے جنگی مرکزوں پر اسلامی عملداری قائم ہو گئی اور اسلامی بحریہ کا رعب مسیحی بیڑوں پر ایک مدت تک چھایا رہا ابن خلدون اس موقع پر لکھتا ہے۔

"مسلمانوں کو دولت اسلامیہ کے عہد میں اس سمندر (بحر متوسط) پر کامل اقتدار و غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور ان

کی عظمت و شوکت سطح آب پر نمایاں ہوگئی تھی۔ اسلامی بحری بیڑوں سے ٹکر لینا عیسائیوں کے بس سے باہر ہوگیا۔ بحری معرکوں میں عربوں کی نمتمندی اور مالِ غنیمت سے بہرہ وری کے واقعات روشن ہیں۔ چنانچہ ساحل سے الگ تمام جزیروں مثلاً میورقہ، منورقہ، یابسہ، سردانیہ، صقلیہ، قوصرہ، مالطہ اقریطش، قبرص وغیرہ کے مالک بن بیٹھے۔ اور اس بحر بیکراں کے اکثر حصوں پر مسلمانوں کا تسلط رہا اسلامی بیڑے بے خطر نقل و حرکت میں مصروف رہتے اور اسلامی فوجوں کی آمد و رفت صقلیہ سے سامنے کی خشکی (افریقہ) کو برابر جاری رہتی۔ یہ فوجیں عیسائی مملکتوں پر اکثر چھاپہ مار جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے برعکس مسیحی قومیں اپنے بیڑوں سمیت شمال مشرق کی جانب ہٹ آئیں اور فرانس، ایطالیہ اور روماینہ کے جزیروں میں سمٹ کر رہ گئیں۔ ان کے لئے ان حدود سے باہر نکلنا دوبھر ہوگیا۔ غرض اسلامی بیڑوں کی صولت عیسائیوں پر ایسی قائم ہوئی جیسے شیر نیستان کی دھاک شکار پر جمی ہوتی ہے۔"

(مقدمہ: ص ۲۱۲)

قوصرہ پر اسلامی اقتدار

قوصرہ اور آس پاس کے جزیروں پر پہلا حملہ عبدالملک بن قطن الفہری نے (۸۸ھ - ۷۰۷ء) کیا تھا اس وقت افریقہ کی ولایت پر مشہور اموی قائد موسیٰ بن نصیر مامور تھا۔ بحری جنگوں میں تونس ہی کے دارالصناعۃ کے تیار کردہ بیڑے استعمال کئے جاتے تھے پھر ابن الحجاب کے دورِ ولایت میں حبیب بن ابی عبیدۃ الفہری کے حملہ (۱۱۸ھ - ۷۳۶ء) کا ذکر ملتا ہے۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ ۱۳۰ھ ۷۴۸ء میں مسلمانوں کا کامل اقتدار اس جزیرہ پر قائم ہوگیا تھا۔ اور فتحمندی کا سہرا عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری کے سر تھا جو افریقہ کے مشہور فاتح عقبہ بن نافع کی اولاد سے تھا اور جس نے مشرق میں دولتِ امویہ کی زبوں حالی دیکھ کر افریقہ اور بلادِ مغرب میں خود مختار حکمراں کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ بہرحال قوصرہ پر مسلمانوں کا قبضہ بنو الاغلب کے حملے سے اسّی بیاسی سال پیشتر ہی قائم ہوچکا تھا۔ پھر ۲۱۲ھ ۸۲۷ء میں جب جزیرۂ صقلیہ پر قاضی اسد بن الفرات کے زیر قیادت اغالبہ کو فتح حاصل ہوئی تو اس حملہ کے دوران میں اسلامی بحریہ کا اہم اسٹیشن جزیرۂ قوصرہ ہی بنا رہا۔ جہاں صبح شام اغلبی بحریہ کی آمد و رفت رہتی تھی اور اسی جزیرہ میں اغالبہ نے خبر رسانی کا محکمہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ چنانچہ اہم خبریں یہیں سے نامہ بر کبوتروں (حمام الرسائل) کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں۔

مخلوط نوآبادی

چونکہ جزیرۂ قوصرہ کا موقع صقلیہ اور بلادِ افریقہ کے بیچ میں ہے۔ لہذا صقلیہ کی فتح کے سلسلہ میں عربوں کو اس جزیرہ سے زبردست فائدہ پہونچا۔ جزیرہ کا مضبوط و بلند بندرگاہ اور اس کا زبردست قلعہ اہلِ افریقہ کے لئے بہترین پناہ گاہ تھا جنگی نقطۂ نگاہ سے اس جزیرہ کے موقع کی اہمیت واضح تھی۔ اسی بنا پر بنوالاغلب نے اپنی خاص توجہ اس جزیرہ کی تعمیر و ترقی کی جانب مبذول کی۔ اس وقت یہاں مختصر سی آبادی تھی۔ زیادہ حصہ افتادہ۔ غیر آباد اور سنسان تھا۔ غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے میں اغالبہ نے ایسی سرگرمی کا مظاہرہ کیا کہ پورے جزیرہ میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ صقلیہ سے عیسائیوں کے گروہ لاکر بسائے گئے جن کو منتقل کرنے میں بنوالاغلب کی بادبانی کشتیاں کام آئیں۔ قوصرہ کی زرخیز زمین ان نووارد عیسائیوں میں تقسیم کردی گئی کہ زراعت سے اپنی ضرورتیں پوری کرلیں۔ پھر تیونس کے ساحلی علاقوں سے کاشتکاروں کی ایک جماعت بھیجی گئی جس میں عرب بھی تھے اور افریقی بھی۔ یہ جماعت ایطالیہ کے عیسائیوں کے قرب و جوار میں بسائی گئی۔ اس طرح قلیل عرصہ کے بعد ہی اس غیر آباد جزیرہ میں ذمی مسیحیوں اور عرب و افریقی مسلمانوں کی زبردست آبادی نظر آنے لگی۔ مخلوط معاشرت و ہم وطنی کی وجہ سے ان سب کا بلا تفریق مذہب و ملت ایک مستقل کلچر پیدا ہوگیا جس پر اسلامی تہذیب و تمدن کا قالب چڑھا ہوا تھا۔ عربی طرزِ معاشرت کے علاوہ سب کی زبان بھی مشترک طور پر لغۂ عربیہ تھی۔

یہیں سے واضح ہوجاتا ہے کہ اغالبہ کو سیاسیات میں کیسی مہارت تھی اور ان کو عمرانی تقاضوں اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھنے کا کتنا سلیقہ تھا۔ بلاشبہ اغالبہ نے استعماریت کے باب میں اپنے عمل سے ایک مفید طریقِ کار کا آغاز کیا تھا جس کی نظیر ماقبل کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ ہمارے خیال میں دولتِ اغالبہ سے پہلے کسی اور حکومت کے متعلق یہ دعوے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مختلف عناصر کی آمیزش سے کوئی ایسی نوآبادی قائم کرپائی ہو جس میں کسی خاص جنسیت اور کسی خاص اعتقاد و ملت کی رعایت و جانبداری کا شائبہ مطلق نہ ہو۔

اغلبی امراء ہی کی تاریخ سے مخصوص یہ بات بھی ہے کہ انہیں کی توجہ والتفات سے صقلیہ، مالٹہ اور خصوصاً قوصرہ میں زراعت کو ترقی نصیب ہوئی۔ قوصرہ کی سنگلاخ زمین میں کاشت کے مناسب ذرائع اور ضروری اسباب و وسائل پہلی دفعہ اغلبی دور میں اختیار کئے گئے۔ روئی کی کاشت اغلبی عہد سے پیشتر یہاں نہیں ہوئی تھی لیکن اغالبہ کی حکومت میں یہاں اس کی کاشت بھی شروع ہوئی جو آج تک باقی ہے۔ اس بارہ میں ابوالفداء کا بیان گزر چکا ہے روئی کی کاشت

کا اصل مرکز افریقیہ تھا جہاں اس کی ابتدا عربوں نے کی تھی۔ قابس اور بلاد الجرید میں روئی خاص طور پر پیدا ہوتی تھی۔ بعد میں بنو الاغلب نے اس کی کاشت کو اپنے مقبوضات میں رواج دیا۔

قوصرہ موجودہ زمانہ میں بھی روئی پیدا کرتا ہے اور نفع اندوز ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جو اصطلاحی الفاظ موجودہ قوصرہ میں بولے جاتے ہیں وہ عربی ہی کے ہیں۔ مثلاً دُھنی ہوئی روئی عربی زبان میں محلوج کہلاتی ہے۔ اہل قوصرہ کی زبان میں اس کا تلفظ Malugiu ہے۔ یا سوت کاتنے کا ایک آلہ عربی زبان میں ردانہ کہلاتا ہے عربی میں رار مفتوح ہے۔ یہ لفظ بعینہٖ یہاں مستعمل ہے۔ صرف اس تغیر کے ساتھ کہ یہاں کی زبان میں Ruddana بضم الرار بولتے ہیں۔

غرض اغلبی عہد ہی سے قوصرہ ایسی نو آبادی بن گیا تھا جس پر عربیت کا رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ چڑھا ہوا تھا۔ قیروان کی حکومت کا یہ ایک اہم جنگی مرکز بھی تھا جہاں خبر رسانی کا محکمہ قائم تھا۔ بعد میں جب اغالبہ کی حکومت پر دولتِ عبیدیہ کا قبضہ ہوگیا تو اس عہد میں بھی قوصرہ کی اہمیت میں کچھ فرق نہ آیا۔ اہل افریقہ ترک وطن کر کے جوق در جوق قوصرہ کی طرف اُمنڈے آرہے تھے علی الخصوص دعوتِ فاطمیہ کی ابتدا ہوئی تو بربر کے خوارج دور دراز علاقوں کے علاوہ اسی جزیرہ میں پناہ لیتے تھے۔

اسلامی اقتدار کا خاتمہ

پانچویں صدی ہجری کے نصف میں بحر متوسط پر "نورمان" مسیحیوں کی طاقت کا ظہور ہوا۔ اور صقلیہ اور دوسرے جزیروں سے اسلامی اقتدار کا خاتمہ بتدریج ہونے لگا۔ ادھر افریقہ میں دولت بنی زیری (صنہاجہ) کی حالت دگرگوں تھی۔ بنو ہلال اور بنو سلیم کی یورشیں افریقہ کی حکومت کو کھوکھلی کر چکی تھیں۔ تاہم المعز بن بادیس نے آخری کوشش کی کہ صقلیہ اور اس کے قرب و جوار کے جزیروں کو مسیحیت کے پنجہ سے ایک بار پھر چھڑا لے، لیکن بے سود۔ ابن بادیس کے بحری بیڑے جو صقلیہ کے زبوں حال مسلمانوں کی مدد کو (۴۴۲ھ/۱۰۵۲ء) روانہ ہوئے تھے، قوصرہ کے مقابل ہی پہنچے تھے کہ سمندری طوفان میں گھر کر تہ و بالا ہوگئے۔ غرض اس نواح کے تمام جزائر ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء تک یکے بعد دیگرے نارمن بادشاہ راجر کی مملکت میں داخل ہوتے گئے جس نے صقلیہ میں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔

نارمن عہد میں مسلمانوں کے ساتھ ایک گونہ رواداری برتی گئی۔ مسلمانوں کے مذہب و عقیدہ کی حرمت کا خیال رکھا

گیا، عرب فضلاء کی قدر و منزلت بھی نارمن دربار میں تھی چنانچہ مسلم اصحابِ قلم نے نارمن فرمانرواؤں کے لئے عربی زبان میں کتابیں لکھیں اور شعراء نے اپنے قصائد میں ان کی ثناخوانی کی۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے نارمن عہد میں ایک خاص اعتماد حاصل کر لیا تھا جس کی شہادت مشہور سیاح ابن جبیر اندلسی کے سفر نامہ میں ملتی ہے۔

صقلیہ کا نارمن فرمانروا تونس کے سواحل پر بھی اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا چنانچہ اسی مقصد کے لئے راجیر (Comte Roger) نے ایک عظیم الشان فوج ترتیب دی اور اس کے بحری بیڑے افریقہ کے دار الحکومہ المھدیہ کی طرف بڑھے۔ یہ امراء صنہاجیہ کا اخیر زمانہ تھا (۵۱۷ھ - ۱۱۲۳ء) صقلیہ کے مسیحی قلعہ دیماس کے قریب اتر پڑے یعنی موجودہ قریہ بقالطہ کے حدود میں۔ یہیں صنہاجی فوج کا مقابلہ ہوا اور ایک سخت معرکہ کے بعد عیسائی شکست فاش سے دوچار ہوئے۔ اسی فتح کے موقعہ پر صقلیہ کے شاعر کبیر عبد الجبار بن حمدیس نے آخری صنہاجی حکمران حسن بن علی کی مدح میں وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع درج ذیل ہے۔

ابی اللہ الا ان یکون لک النصر وان یھدم الایمان ما شادہ الکفر

شکست خوردہ راجر نے دوبارہ حملہ کی تیاری کی اور ۵۴۳ھ (۱۱۴۸ء) میں المھدیہ اور تونسی سواحل پر قابض ہو گیا۔ حسن بن علی الصنہاجی بلادِ مغرب کی طرف نکل گیا جس کی تفصیل خاص تونس کی تاریخ سے متعلق ہے۔

قوصرہ سے مسلمانوں کی ہجرت

صقلیہ، مالطہ اور دوسرے جزیروں کی طرح قوصرہ بھی برابر نارمن حکومت کے زیر اقتدار رہا یہاں تک کہ ایک جرمن خاندان ہوہنشطوفن (Hohenslaufen) نے نارمنوں سے حکومت چھین لی اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ یکسر بدل گیا۔ مسلمانوں پر ناقابل برداشت مظالم کا آغاز اسی خاندان کی حکومت سے ہوتا ہے۔ بالآخر جرمنوں اور ان کے بعد آنجو (Anjou) کے جانشینوں کی ستم رانی سے تنگ آ کر ان جزائر کے مسلمانوں نے افریقہ اور تونس کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت افریقہ میں موحدین اور بنو حفص برسر اقتدار تھے۔ ان ستم رسیدہ مہاجرین کا استقبال گرمجوشی سے کیا گیا اور ان کی آبادکاری کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت بہم پہونچائی گئی۔ ان مہاجرین میں ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔ چنانچہ سپاہیانہ جوہر رکھنے والوں کو افریقہ کی فوج میں، زراعت پیشہ لوگوں کو زراعت کے میدانوں میں اور علوم و فنون کے ماہرین کو افریقہ و تونس کے علمی حلقوں میں کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ انہیں میں ادریسیوں کا ایک مشہور خاندان آل الصقلی بھی تھا جو تونس میں فن طب کے مخصوص ماہرین

کا خاندان تھا اور بہت ممکن ہے یہ خاندان مشہور علامہ الشریف الادریسی کی ذریت ہو۔

مدجنین یا مسلمانوں کی باقیماندہ جماعت

مہاجرین جو تونس اور افریقہ میں پناہ لینے آئے تھے ان میں زیادہ تر مستطیع اور متمول خانوادے تھے ورنہ نادار و کمزور مسلمانوں کا طبقہ تو اپنے قدیم وطن ہی میں عیسائیوں کے ظلم و تعدی کا نشانہ بنا ہوا بے بسی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

ان ضعفائے مسلمین ہی کے خیال سے امرائے دولت حفصیہ اپنی قوت و شوکت کے دور میں ان جزیروں کے سیاسی امور میں مداخلت کرتے رہے۔ اور عیسائی فرمانرواؤں کو ان کی مسلم کش پالیسی پر برابر تنبیہہ و تہدید سے کام لیتے رہے۔ یہاں تک کہ اخیر میں ابوزکریا الاکبر اور فریڈرک ثانی کے مابین ۵ ار جمادی الآخرہ ۶۲۸ھ مطابق ۲۰ر اپریل ۱۲۳۱م کو ایک معاہدہ ہوا جس کی مدت دس سال کے لیے تھی۔ اس معاہدہ کی رو سے دولت حفصیہ نے جزیرہ قوصرہ پر فریڈرک کی بالادستی اس شرط پر تسلیم کی تھی کہ قوصرہ کا نصف محصول سالانہ، تونس کی (اسلامی) حکومت کو ملتا رہے۔ نیز اس صلحنامہ کی صریح دفعہ یہ تھی کہ فریڈرک کے قلمرو میں جو مسلمان مقیم ہیں ان کے مذہبی اور دینی عقائد کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور مسلمان شرعی عرفی احکام و رسوم کی ادائگی میں بالکل آزاد ہونگے۔ امیر ابوزکریا کی زندگی تک اس معاہدہ کے دفعات کے مطابق برابر عمل ہوتا رہا یہ معاہدہ امیر موصوف کی تاریخ حیات کا نہایت روشن کارنامہ تھا۔ امیر ابوزکریا کی وفات کے ساتھ ہی عیسائیوں کی روش مسلم رعایا (مدجنین) کے ساتھ یکسر بدل گئی اور معاہدہ کی خلاف ورزی شروع ہوگئی چنانچہ ابن خلدون اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ

"امیر ابوزکریا کی وفات [1] - ۲۳ر جمادی الاخری ۶۴۷ھ - ۱۲ر اکتوبر ۱۲۴۹ء - کی خبر جب صقلیہ پہنچی تو یہاں کے مسلمان جو شہر بلرمو میں آباد اور سلطان موصوف اور فرمانروائے جزیرہ کے معاہدہ کی رو سے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے، سلطان کی وفات کی اطلاع پاتے ہی اہل مسیحیت ان پر ٹوٹ پڑے اور مسلمانوں کو قلعوں اور محفوظ مقامات میں سمٹ آنا پڑا۔ ان لوگوں نے بنو عبس کے ایک جوشیلے بہادر کو اپنا سردار بنا لیا۔ شاہ صقلیہ نے اس قلعہ بند مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا اور آخر الامر ان کو قلعہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس جماعت کو سمندر پار ایک مقام لوجارہ [2] (Lucera) میں رکھا گیا اس کے بعد

---

(1) تاریخ ابن خلدون: ج ۱ ص ۴۰۹ (الجزائر)

(۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا بیان ہے کہ بیس ہزار عرب، لوجارہ پہونچائے گئے تھے۔ شروع میں ان کو اپنے مذہب پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن ۱۳۰۰ء میں اکثر و بیشتر قتل کر دیئے گئے اور ان میں سے جو لوگ مجبوراً عیسائی ہو گئے وہی باقی بچے (دیکھو ج ۱۴ ص ۵۰۸ ۲۹ واں ایڈیشن - لفظ LUCERA)

مالطہ اور قوصرہ کے مسلمان بھی پکڑ کر یہیں لائے گئے۔ صقلیہ اور ان چھوٹے جزیروں پر عیسائی مستولی ہوگئے اور یہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔"

ابن خلدون کے مذکورہ بیان کے بعد قارئین کو یہی گمان ہوگا کہ ان جزیروں اور علی الخصوص ہماری بحث کے اصل موضوع جزیرہ قوصرہ سے مسلمانوں کے تعلقات بالکلیہ ختم ہوگئے ہونگے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان نو آبادیوں سے اہل افریقہ کے روابط مذکورہ بالا خونچکاں وقائع کے بعد بھی کسی نہ کسی جہت سے باقی رہے تھے۔ جب تک دولتِ حفصیہ کا وجود باقی رہا افریقہ کے مسلمان قوصرہ میں اقامت اور وہاں کی آمد و رفت سے باز نہ رہے۔ چنانچہ ہماری تائید ابن فضل اللہ العمری کے اس بیان سے ہوتی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔ اور اس کے الفاظ ہم مکرر پیش کرتے ہیں۔ وبھا جماعۃ من المسلمین تحت الذمۃ علی مقرلہم۔ یعنی قوصرہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت مسیحیوں کے ماتحت جزیہ دیکر رہتی تھی۔ اس سے پیشتر ابن سعید غرناطی جس کے زمانہ میں ان جزیروں کے مسلمانوں پر عیسائیوں نے مظالم برپا کر رکھے تھے اس کا بیان بھی یہی ہے۔ کہ قوصرہ کے مسلمان صقلیہ کے فرنگیوں کے ماتحت رہتے تھے اور انہی مسلمانوں کو افریقہ کے مسلمان مدجن اور اسپین کے عیسائی Mudejare کہتے تھے۔ پھر نویں صدی ہجری میں قاضی ابوالقاسم بن ناجی القیروانی (م رجب ۸۳۹ھ = جنوری ۱۴۳۶ء) کے ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی قوصرہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی۔ اس وقت اس جزیرہ پر اسپین کے عیسائیوں کا قبضہ تھا اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے دینی اور شرعی احکام کے فیصلہ کے لئے ایک قاضی کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ قوصرہ کے مسلمان افریقہ کے بندرگاہوں اور خصوصاً مشرقی ساحل کے شہروں مثلاً سوسہ، المہدیہ، صفاقس، قابس وغیرہ تک آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن ناجی کے بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اسلامی قلمرو کے علماء غیر مسلم مملکتوں میں ان مسلمانوں کی بود و باش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ قاضی موصوف کی اصل عبارت درج ذیل ہے:۔

"وجرٰی لی،[1] وانا قاضی بجربۃ - حدود سنۃ ۸۰۰ھ (۱۳۹۸م) أن قدم لی رسم فیہ شہادۃ قاضی قوصرۃ یذکر حق شہود	جربہ میں منصب قضا پر مامور رہتے ہوئے ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) کے لگ بھگ کی بات ہے کہ میرے پاس ایک فتویٰ پہونچا جس میں توصرہ کے قاضی نے ذاتی علم کی بنا پر دعویٰ دائر کرنے والوں کے

(۱) شرح رسالہ ابن ابی یزید: ص ۲۰۶ طبع مصر ۱۳۳۲ھ

من علمه - فطلب منی العارض أن اوقع على خطه فلم امكن صاحبه من ذلك لانهم (أى مسلم قوصرة) قادرون على التحليل فى الخروج منها وربما يخرج بعض من فيها ويعود اليها وهم تحت حكم الكفار

حق میں شہادت دی تھی۔ فتویٰ پیش کرنے والا چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے دستخط کر دوں لیکن میں باز رہا اس لئے کہ قوصرہ کے مسلمانوں کے لئے وہاں سے نکل آنا ممکن ہے چنانچہ وہاں کے بہتیرے مسلمان اسلامی علاقوں کا سفر کرتے ہیں اور پھر کافروں کی حکومت میں رہنے کے لئے واپس لوٹ جاتے ہیں۔

ابن ناجی کے بیان کی تصدیق تونس کے مشہور مفتی امام ابو القاسم محمد بن احمد البرزلی (م ۸۴۱ھ ۔ ۱۴۳۸ء) کے ایک فتویٰ سے ہوتی ہے جس میں مفتی صاحب موصوف کے الفاظ یہ ہیں:-

" ومثله[۲] عندنا بافريقية اهل قوصرة، فانها تحت ايالة الكفر وقد اختار بعضهم الاقامة بها فمن غلب على امره منهم فله مندوحة وليست بجرحة فى حقه لانه كالمكره ومن كان باختياره فهو جرحة وحكم ماله يجرى على ما سبق وهو - أى مسلمو قوصرة - ونحوهم من اهل الاندلس يسمون بالدجن "

" یہی مثال ہمارے یہاں افریقہ میں قوصرہ کے مسلمانوں کی ہے جو کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں۔ ان میں سے جو مغلوب و مجبور ہو کر رہ گئے ہیں ان کے لئے تو گنجائش نکل آتی ہے۔ لیکن جو وہاں سے منتقل ہو سکتے ہیں پھر بھی وہیں رہنا گوارا کرتے ہیں ان کے ساتھ مطلق رعایت نہیں۔ اور ان کے اموال کا وہی حکم ہوگا جو مذکور ہوا۔ قوصرہ اور اسی طرح اندلس میں جو مسلمان رہ گئے ہیں وہ " مدجن " کہلاتے ہیں۔

دفتری نظم ونسق

قوصرہ پر عربی استیلاء کے دور میں یہاں نظام حکومت کی کیا شکل تھی، پیش نظر تاریخی مصادر سے اس مسئلہ کی وضاحت نہیں ہوتی۔ افریقہ کی اسلامی سلطنت یہاں کے لئے مستقل والی کا تقرر کرتی تھی یا جزیرہ صقلیہ و مالطہ کے والیوں میں سے کسی ایک کے ذمہ یہاں کی نگرانی ہوا کرتی تھی۔ ان میں سے کسی شق کے متعلق بھی ہماری تاریخ کوئی قطعی ثبوت بہم نہیں پہنچاتی۔ البتہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اغلبی امراء کو اپنے قلمرو کے ہر ہر خطہ سے بڑا گہرا لگاؤ رہتا تھا اور ان کو اپنے ملک کی ترقی و تہذیب اور آبادکاری کے مسائل سے خاص

(۱) المعیار الونشریسی طبع فاس [illegible] نیز جامع مسائل الاحکام قلمی نسخہ محمود حسنی عبدالوہاب باشا۔

دلچسپی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ ملک کے حالات بذات خود گھوم کر جائزہ لیتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ امیر محمد ثانی جس کا لقب ابو الغرانیق تھا ایک دفعہ سوسہ کے بندرگاہ سے سوار ہو کر جزیرۂ قوصرہ پہنچا اور کئی دن یہاں ٹھہرا تاکہ جزیرہ کے حالات اس پر عیاں ہو جائیں۔ اسی طرح دوسرے سلاطین بھی قوصرہ اور باقی جزیروں مثلاً مالطہ اور صقلیہ کا سفر اسی ارادہ سے کیا کرتے تھے کہ رعایا کی شکایتیں سن پائیں اور ملک کی حالت سدھار سکیں۔

مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر بعید نہیں اگر قوصرہ کے لئے مستقل عامل کا تقرر ہوتا رہا ہو جس کے ذمہ داخلی نظم و نسق اور حربی و اجتماعی فرائض و واجبات کو انجام دینا ہو۔ بہر حال یہاں کے قاضی شرعی کا منصب تو مستقل تھا جس کا تقرر مرکزی حکومت قیروان اور بعد میں المہدیہ سے ہوا کرتا تھا۔ قوصرہ سے جب اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تو مقامی مسلمانوں کی جماعت خود ہی قاضی کا انتخاب کیا کرتی تھی جس کو نئی حکومت تسلیم کر لیتی تھی اور اسی کے جاری کردہ شرعی احکام کو نافذ کرواتی تھی۔ اس سلسلہ میں علامہ ابن ناجی کا مذکورہ بالا اقتباس ثبوت کے لئے کافی ہے۔

نویں صدی ہجری تک اس جزیرہ میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اسی نظم کے ساتھ ہوتی رہی اور شاید دسویں صدی ہجری میں بھی اسی قسم کا انتظام رہا ہوگا لیکن نویں صدی کے بعد یہاں کے مسلمانوں کا حال انتہائی تاریکی میں ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دسویں صدی ہجری اور مابعد زمانہ میں یہاں کے "مدجنین" کا انجام کیا ہوا۔ اتنا تیقن ہے کہ جیسے جیسے دولت بنی حفص کی قوت پر اضمحلال کا غلبہ ہوتا گیا۔ افریقہ سے جزیرۂ قوصرہ کو جو مادی و معنوی امداد وقتاً فوقتاً پہنچتی رہتی تھی اس میں نہ صرف کمی ہی آ گئی بلکہ آخر میں اس کا سلسلہ سرے سے منقطع ہو گیا اور جزیرہ کے بے یار و مددگار مسلمانوں پر کلی اضمحلال طاری ہو گیا ایسا کہ پھر ان کا حشر معلوم نہیں کیا جا سکا۔ گمان غالب ہے کہ قوصرہ پر جب اہل اسپین کو غلبہ حاصل ہوا تو جس طرح بلاد اندلس میں ان مسلمانوں کو جو ترک وطن کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جبراً عیسائی بنا لیا گیا، اسی طرح قوصرہ کے مسلمانوں کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور کیا گیا ہوگا۔

قوصرہ سے قریب دو جزیرے

قوصرہ کے قرب و جوار کے جزیرے لمبدوشہ (Lampedusa) اور لنوشہ (Linosa) جو بلاد تونس سے پورب میں واقع ہیں بظاہر قوصرہ کے ماتحت تھے اور یہاں کی مسلم آبادی کے متعلق وہی باتیں کہی جا سکتی ہیں جو خود قوصرہ کے مسلمانوں کے بارے میں

اوپر گزر چکی ہیں۔ ان دونوں جزیروں کے متعلق ہمیں اسلامی مصنفین کے یہاں تمام معلومات یکجا نظر نہیں آتے البتہ ان کے نام ضمنی طور پر کتابوں میں آجاتے ہیں۔ ابو عبید البکری اپنی تصنیف المسالک میں ان دونوں کے نام پر اکتفا کرتے ہوئے ان کی جگہ تونسی جزیرہ قرقنہ کے سامنے یعنی مشرق میں بتاتا ہے۔ عرب جغرافیہ نویسوں میں سے ادریسی کا بیان سب سے زیادہ مفصل ہے۔ لیکن اس کے بیان سے ان دونوں جزیروں کی تاریخ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ امام محمد بن علی المازری (م ۵۳۶ھ) کے ایک فتوی میں ضمناً لنبدوشہ کا ذکر آگیا ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں المہدیہ سے اسکندریہ تک بادبانی جہازوں کے ذریعہ بحری سفر کیا کرتے تھے اور اس بحری راستہ میں کشتیوں کا ایک اسٹیشن یہی جزیرہ تھا۔

قوصرہ اور عثمانی ترک

اہل اسپین کی حکومت قوصرہ سے آل عثمان کی بحری طاقت کے ظہور کے ساتھ زائل ہونے لگی۔ ترکوں نے بحر متوسط پر غلبہ و استیلاء حاصل کر کے اسلامی بیڑے کا رعب سطح بحر پر دوبارہ قائم کر دیا۔ ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) میں مشہور ترکی امیر البحر طورغود باشا نے جس کو اہل تیونس اپنے لہجہ میں درغوث کہتے ہیں جزیرہ قوصرہ کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کے بحری مقبوضات میں شامل کر لیا اور ترکی بحریہ میں اہم مرکز بنا دیا تھا۔ جب تک ترک المہدیہ پر قابض رہے قوصرہ بھی ان کے زیر اقتدار رہا۔ یہاں کے مالٹا کے سواروں کی جماعت یعنی استباریہ اس جزیرہ پر قابض ہوگئی اور انگریزوں کی آمد تک یہاں اہل مالٹا کا تسلط قائم رہا۔ انگریزوں کا قبضہ مالٹا اور اس کے ملحقات پر ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں قائم ہوا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آخری ادوار میں مسلمانوں کی جماعت یہاں باقی بھی رہی تھی یا سب کو اسپینی مسیحیوں اور استباریہ کے زیر اثر تبدیل مذہب پر مجبور ہونا پڑا۔ بظاہر آخری شق کا احتمال غالب ہے لیکن یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس جزیرہ کے بسنے والوں کی زبان مسیحیت کے اقتدار مطلق کے باوجود عربی زبان تھی اور ان لوگوں کا لباس تو نزدیک زمانہ تک تونسی علاقوں کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔

قوصرہ اور لغۂ عربیہ

سترھویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی سیاح جان بونی (Jean Bonnet) مراد ثالث کے عہد میں ۱۶۶۹ء سے ۱۶۷۱ء تک (۱۰۸۰ھ - ۱۰۸۲ھ) تونس میں گرفتار رہا پھر بندرگاہ سوسہ سے ایک بادبانی جہاز پر سوار ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں

تونسیوں کے قید سے فرار کی داستان سناتے ہوئے جزیرۂ قوصرہ (سنطلاریہ سے گزرنے کا ذکر کیا ہے۔ قوصرہ پہلا فرنگی مقبوضہ تھا جہاں اس کو تونس سے فرار ہونے کے بعد دم لینے کا موقعہ ملا تھا۔ یہاں اسے ایک ترجمان کی ضرورت پڑ گئی چنانچہ مالطہ کے ایک شخص نے اس خدمت کے لئے آمادگی ظاہر کی اس لئے کہ قوصرہ کی زبان عیسائیوں کے عہد میں بھی مالطہ کی زبان سے مشابہ تھی۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عربی زبان قوصرہ کے مسیحیوں میں بارہویں صدی ہجری کے اوائل تک رائج رہی اور اہل قوصرہ کے بول چال کی زبان، عربی کے سوا کوئی اور یورپین زبان نہیں بن سکتی تھی۔ اگرچہ ان کی عربی ویسی ہی محرف شکل کی ہو گئی ہوگی جیسی مالطہ میں زمانۂ حال تک مستعمل رہی ہے۔ یا ممکن ہے کہ قوصرہ سے بلادِ تونس کی قربت کا یہ اثر ہو کہ وہاں کی عربی اہل مالطہ کی زبان کی بہ نسبت لغۂ فصحیٰ سے قریب تر رہی ہو

قوصرہ کے بہت سے مقامات کے نام اصلاً عربی زبان کے ہیں بلکہ اسّی فیصدی ناموں کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہے۔ ہمارے بعض ایطالوی دوستوں کو حیرت تھی کہ تقریباً سات سو برس سے لاطینی بولنے والے عیسائیوں کا قبضہ اس جزیرہ پر ہے اس کے باوجود یہاں کے مقامات کے نام بالعموم عربی ہی ہیں۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ عربی فتح کا اثر کچھ اتنا پائدار اور گہرا ہوا کرتا تھا کہ آج جہاں عربوں کا نام ونشان مٹ چکا ہے وہاں بھی مقامی باشندوں کی تہذیب وثقافت اور زبان وتمدن پر عربیت کا اثر حال تک مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور تنہا قوصرہ ہی پر موقوف نہیں بلکہ صقلیہ، اندلس، مالطہ اور مابقی جزیروں میں بھی عربوں کے اثرات ہویدا ہیں۔ ذیل میں قوصرہ کے بعض مقامات کے ناموں کی ایک فہرست ملاحظہ فرمائیں۔

— المرسی ، (Limarse)

— بیت المرسی، آج کل کے استعمال میں لاطینی املا و تلفظ کے مطابق (Beccimursa) ہے

— الشرف ، (Scirafe) بلند مقام

— جبل ، (Gibele) اس جزیرہ کے سب سے بلند مقام کا نام

— جبل احمر ، (Gelkhamar)

— الشمالیۃ ، (Limillia) ایک مقام شمالی جہت میں۔

— العنیۃ ، (Mugna) باغ وبوستان کے معنی ہیں، اس جزیرہ کے جغرافیائی ناموں میں یہ لفظ اکثر آتا ہے

—— الحمہ (Khamma) ایک چھوٹا گاؤں جس میں گرم پانی کا ایک چشمہ بیچ جزیرہ کے برکانی آثار میں سے ہے اسی چشمہ کی مناسبت سے یہ نام ہے۔

—— کدیۃ الحمۃ (Cuddia-di-Khamma)

—— حروشہ (caruscia) ایک سنگلاخ قطعۂ زمین کا نام۔ تونس میں سنگلاخ زمین کو "حوش" کہتے ہیں۔

—— سلوم (Sollume) صحیح شکل عربی کی۔ سلم۔ ہے، پہاڑ پر چڑھنے کا راستہ۔ واو کا اضافہ تونسی لب و لہجہ کی پوری طرح غماز ہے۔

—— خربۃ (Harbe)

—— زیتۃ (Zita)

—— کدیۃ (Cuddia) ہر بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ کئی ایک مقاموں کے نام کا جز ہے۔

—— الحجر (Khagiar)

—— أبو قرۃ (Buccura) گمان یہ ہے کہ کسی شخص کے نام پر اس مقام کا نام پڑا۔

—— کدیۃ ابن سلطان (Cuddia Bonsultan)

—— بنی قائد (Beni cuad)

—— بو یرۃ (Buria) لفظ بِر کی تصغیر ہے تاء تانیث کے ساتھ

—— بلاطۃ (Balata)

—— حنقۃ (Hanaka) موجودہ استعمال میں "حنکہ" ہے دو پہاڑوں کے درمیان تنگنائے۔

—— الحلقۃ (Lia galcha)

—— کدیۃ التنورۃ (Cuddia attalora.)

—— سداری (Sidere.)

اس فہرست کو مزید طول نہیں دیا جاتا ہے کہ مقامات کے نام سیکڑوں کی تعداد میں عربی الاصل ہیں۔ موجودہ

بنطلاریہ (قوصرہ) میں عربی مفردات کی کیا شکل ہوگئی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست سے ہوگا اگر ان تمام عربی کلمات کو جمع کیا جائے تو لغت کی ایک مستقل تالیف تیار ہو سکتی ہے۔

—— زبیب (Zelibo) خشک انگور (کشمش)

—— بیفراۃ (Befra) انجیر کا پھول۔ اہل تونس کی زبان میں بیفرۃ ہے یعنی نا کے بجائے تا بولتے ہیں۔ تلفظ کی دونوں صورتیں صحیح ہیں یہ لفظ یونانی الاصل ہے۔

—— سواقی (Sciwachi) پانی کے بہنے کی جگہ۔ اصل میں ساقیہ کی جمع ہے۔

—— دکانۃ (Duccana) چبوترہ

—— سکارۃ : اہل قوصرہ سکالۃ۔ بولتے ہیں قفل کے معنی ہیں۔ ایک تونسی مثل ہے:
کیف ببیب کیف سکالۃ — یعنی ردی دروازہ کے لئے ردی قفل۔

—— جحا (Giufa) ایک مجہول شخصیت[1] کا نام جس کی طرف مضحک حکایات اور نکاہی قصے منسوب ہیں۔ اہل قوصرہ حائے حلقی کے بجائے فا کا تلفظ کرتے ہیں یعنی جفا بولتے ہیں اور کئی کلمات میں بھی حا کو فا سے بدل دیتے ہیں

—— داموس (Dumusso) ہر قوس نما عمارت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اسی معنی میں اہل تونس بھی بولتے ہیں۔

—— ساسی (Sicci) عربی لفظ اساس کی بگڑی ہوئی صورت۔ ہر سنگی بنیاد کو اہل بنطلاریہ Secci کہتے ہیں۔ جزیرہ سردانیہ میں یہ لفظ قدیم عمارات کے لئے بولا جاتا ہے۔

—— حریوشہ۔ گندھے ہوئے میدہ کی ٹکیا بنا کر گرم گرم خاکستر میں ڈالکر پکاتے ہیں۔ اسی کو تونس کے زراعت پیشہ "خزاملۃ" کہتے ہیں۔

—— مطیرہ : وہ قطعہ زمین جس کو ہل چلانے سے پہلے سیراب کر لیتے ہیں۔

(۱) اس مجہول الحال شخص کا ذکر عربوں کے نکاہی قصوں کہانیوں میں عام تھا چنانچہ ابن الندیم کتاب الفہرست میں ایسی ہی کہانیوں کے ایک مجموعہ کا ذکر کرتا ہے جس کا نام کتاب نوادر جحا ہے۔ دیکھو ص ۴۳۵ طبع رحمانیہ مصر۔

—— حفیان : اس کا تلفظ - حفیانو - (Afiano) کرتے ہیں - جو ننگے پاؤں ہو۔

مذکورہ بالا الفاظ کے علاوہ بکثرت عربی الاصل الفاظ یہاں کی زبان میں داخل ہیں جن کی تحقیق اور اصل عربی شکل کو معلوم کرنا کچھ دشوار بھی ہے - بہرحال ہماری مختصر فہرست پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عربی زبان قوصرہ میں قریبی زمانہ تک مستعمل رہی چنانچہ ہمارا دعویٰ گذر چکا ہے - بعد میں یہاں کی عربی پر اطالوی زبان یا یہ کہیے کہ صقلیہ کی زبان کا غلبہ ہوا پھر بھی کچھ الفاظ عربی کے باقی رہ گئے -

قوصرہ کی معاشرت پر عربی اثر

یہاں تک تو زبان کا معاملہ تھا جہاں تک معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اہل قوصرہ تھوڑی مدت پہلے تک اہل افریقہ کے رسوم و عادات کی تقلید کرتے رہے تھے اور اُن کی زندگی کے مختلف شعبوں پر افریقی اور بربر عربوں کا اثر باقی رہا تھا، انکے لباس میں خاص تونسی وضع کی ٹوپی عام تھی - تونسی سواحل اور جزیرہ شریک کے اونی لبادے (قشابیہ) عموماً رائج تھے - تقریباً گذشتہ ایک صدی کے اندر قوصرہ اور تونس کے تجارتی تعلقات ختم ہو گئے تو تونسی وضع قطع کی جگہ ایطالوی طرز و وضع نے لے لی : جزیرہ جربہ کے بنے ہوئے مٹی کے برتن مثلاً مٹکے، گھڑے، آبخورے وغیرہ یہاں کے گھروں میں عموماً مستعمل تھے - قوصرہ کی خواتین زمانہ حال تک پردہ میں نکلتی تھیں، کسی کام سے گھر سے باہر نکلنا ہوتا یا کلیسا کی حاضری ہوتی تو سیاہ گھیم میں اچھی طرح لپٹی ہوئی نکلتیں اور چہرہ کا کوئی حصہ بجز آنکھوں کے نظر نہیں آتا تھا - تونسی ساحل کی عورتیں بھی جب گھر سے باہر نکلتی ہیں تو اسی سیاہ بانے میں علی الخصوص شہر سوسہ کی عورتیں تو اسی وضع کی پابند ہیں

اسلامی عہد کے آثار قدیمہ

قوصرہ کے سواحل اور ویرانوں سے خاصہ تعداد عربی سکوں کی برآمد کی گئی ہے - یہ سکے مختلف اسلامی حکومتوں یعنی اغالبہ، عبیدیہ اور دولت حفصیہ کے عہد کے ہیں - ان سکوں کی ڈھلائی افریقہ کے دار الضرب میں ہوئی تھی - اثری تحقیقات کے سلسلہ میں رخام اور معمولی پتھر کے الواح اور کتابے بھی جمع کئے گئے ہیں یہ کتبے اسلامی دور کی قبروں پر نصب تھے - اثری تحقیق کے سلسلہ میں اماری اور اورسی (Orsi) کی کارگزاریاں علمی دنیا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں ،

اس مختصر مضمون کو پڑھ کر آپ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہو گی کہ اہل قوصرہ وضع قطع، زبان و بیان، صنعت و حرفت غرض زندگی کے اکثر شعبوں میں افریقہ کے عرب اور بربر مسلمانوں کے مرہون منت رہے ہیں اور اسی جزیرہ کی کیا خصوصیت ہے، صقلیہ، مالٹہ اور سابقی جزائر بحر روم کو بھی عربوں کے ورثہ میں بہت کچھ ہاتھ آیا جس کا اعتراف ان یورپ کے اہل تحقیق صریح لفظوں میں کرنے لگے ہیں - انتہی

ادبیات

نعت

جناب مخمور دہلوی

وہ جھوٹا ہی جو اس منصب کا دعویدار ہو ساقی — خدا شاہد کہ میخانے کا تو مختار ہے ساقی
بہت تھے دیکھنے والے مگر سمجھا نہیں کوئی — تجھے پہچاننے کو بھی نظر درکار ہے ساقی
مبارک سب کو تیرا رحمت للعالمیں ہونا — تری رحمت دو عالم میں بروئے کار ہے ساقی
بہشت آرزو ہے تیرے کوچے کی زمیں مجھکو — مری جنت تو تیرا سایۂ دیوار ہے ساقی
یہ خود پیاسے رہیں اوروں کو تشنہ لب نہیں رکھتے — ترے رندوں میں کتنا جذبۂ ایثار ہے ساقی
قیامت تک نہ اس ظلمت کدہ میں روشنی ہوتی — تری ذات گرامی مظہر انوار ہے ساقی
حفاظت میں جو تیری آئے وہ محفوظ رہتا ہے — تلاطم ہو کہ طوفاں اس کا بیڑا پار ہے ساقی
تو ہر افضل سے افضل ہے تو ہر بہتر سے بہتر ہے — تری عظمت سے عالم میں کسے انکار ہے ساقی
ترے قدموں میں آ کر معصیت دم توڑ دیتی ہے — ترا دامن گنہ گاروں کا پردہ دار ہے ساقی
غم دنیا و ما فیہا سے فرصت مل گئی گویا!! — وہ اچھا ہے جو تیرے عشق کا بیمار ہے ساقی
ترے در کے سوا اس کو کہیں سے کچھ نہیں ملتا — طلب سے جس کو نفرت مانگنے سے عار ہے ساقی
کبھی کا کاروانِ کیف و مستی لٹ گیا ہوتا — یہاں سب سو رہے ہیں ایک تو بیدار ہے ساقی

نہیں مخمور ہی پر منحصر یہ کیف کا عالم
جسے دیکھو محبت میں تری سرشار ہے ساقی

"جسے دیکھو امیرِ کارواں ہے"

(جناب بسمل شاہجہاں پوری)

جنوں کون و مکاں پر حکمراں ہے ۔۔۔ خردِ صیدِ غمِ کون و مکاں ہے

یہاں حسنِ نظر کا امتحاں ہے ۔۔۔ یہ نادانو! جواہر کی دوکاں ہے

جدھر تم ہو اُدھر سارا جہاں ہے ۔۔۔ تمہارے دم قدم سے گلستاں ہے

بڑی کمزور شاخِ آشیاں ہے ۔۔۔ ذرا اے طائرانِ وقت ہشیار

نکل اے نیرِ تاباں کہاں ہے ۔۔۔ سحر کو ظلمتیں گھیرے ہوئے ہیں

کہ اس میں آپ کی بھی داستاں ہے ۔۔۔ مرے افسانے کو شہرت نہ دیجے

مری قسمت ہی مجھ پر مہرباں ہے ۔۔۔ فریبِ دوست تجھ سے کیا شکایت

کہ جن پر انحصارِ گلستاں ہے ۔۔۔ وہ کلیاں بن کھلے مرجھا رہی ہیں!

اب اس کے بعد تیرا امتحاں ہے ۔۔۔ مری بربادیوں پر ہنسنے والے

بہت بیکل مریضِ ناتواں ہے ۔۔۔ نسیمِ صبح آہستہ گذرنا!!!

جسے دیکھو امیرِ کارواں ہے ۔۔۔ الٰہی خیر میرے کارواں کی

شبِ فرقت ستاروں کی چمک بھی!

دلِ بسمل پہ ضربِ ناگہاں ہے

شئون علمیہ!

توانائی جب کسی انجن یا جسم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں توانائی ہے تو اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں کام کرنے کی صلاحیت یا قابلیت ہے یہاں "کام" اصطلاحی معنوں میں ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ وہ جسم خود حرکت کر سکتا ہے یا دوسرے جسموں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔

ایک متحرک جسم کی حرکت دوسرے جسم کو حرکت میں لا سکتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ ریل کا ایک متحرک ڈبہ ساکن ڈبے سے ٹکراتا ہے تو ساکن ڈبہ بھی حرکت میں آجاتا ہے۔ اس کی مثالیں کثرت سے دی جا سکتی ہیں۔

یہ توانائی وہ ہوئی جو جسم میں اس کی حرکت کی وجہ سے ہے اس لئے اس کو توانائی بالفعل (کائنیٹک انرجی) کہتے ہیں لیکن جو جسم "حالت سکون" میں ہوتے ہیں ان میں بھی توانائی ہوتی ہے یہ توانائی ان کے مقام یا وضع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ پانی کسی بلند مقام پر کسی حوض میں جمع ہو تو اس سے کام لیا جا سکتا ہے یعنی وہ پانی پہیوں کو حرکت دیتا ہے جس سے بالآخر بجلی تیار کی جا سکتی ہے ڈائنامائٹ میں بھی توانائی ہوتی ہے کیونکہ بھڑکانے پر وہ دوسری چیزوں میں حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح لکڑی کوئلہ، پٹرول اور ان جیسی دوسری چیزوں میں توانائی ہوتی ہے۔ ایسی توانائی کو توانائی بالقوہ (پوٹنشل انرجی) کہتے ہیں۔

ہماری غذاؤں میں بھی توانائی ہوتی ہے۔ ہماری غذائیں پیچیدہ کیمیاوی مرکبات ہوتی ہیں جن میں کاربن، ہائڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن خاص اجزا ہوتے ہیں۔ غذا کے ہضم ہونے کے یہ معنی

ہیں کہ یہ پیچیدہ مرکبات تبدیل ہو کر سادہ مرکبات بن جاتے ہیں یہ سادہ اشیا حل پذیر ہوتی ہیں اس لئے آنتوں کی دیواریں ان کو جذب کر لیتی ہیں، اور خون میں ان کو پہنچا دیتی ہیں۔ خون ان چیزوں کو ہمارے جسم کی بافتوں (ٹشوز) تک پہنچا دیتا ہے۔ وہاں خلیوں کے اندر یہ چیزیں آکسیجن سے ملتی ہیں۔ یہی عمل تکسید (آکسیڈیشن) ہے اس کے نتیجے میں پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ حاصل ہوتے ہیں اور توانائی نمودار ہو جاتی ہے۔ یہی عمل تنفس ہے تو گویا ہماری غذا جسم کے اندر جلتی ہیں جس سے ہم کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اور چونکہ جہاں کہیں احتراق یا جلنے کا عمل ہوتا ہے وہاں حرارت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ہماری غذاؤں پر عمل تکسید ہوتا ہے تو حرارت خارج ہوتی ہے۔ یہ حرارت ہمارے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے۔ اسی کو حرارت غریزی کہتے ہیں دوران خون اس کو قائم رکھتا ہے۔ اس طرح ہمارے جسم کی تپش (ٹمپریچر) برقرار رہتی ہے۔

جسم میں جو حرکتیں ہوتی ہیں خواہ اندرونی ہوں مثلاً حرکت قلب تنفس خواہ بیرونی ہوں مثلاً چلنا کام کرنا وغیرہ سب کے لئے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیرونی حرکتوں کے لئے ہمارے جسم میں پٹھے ہوتے ہیں۔ ہر حرکت کے لئے کم از کم دو پٹھوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک تو پھیل کر یا سکڑ کر حرکت پیدا کرتا ہے اور دوسرا بدن کے اس حصے کو اپنی جگہ پر لے آتا ہے۔

ہمارے بدن میں توانائی کے خزانے چربی وغیرہ کی شکل میں موجود رہتے ہیں۔ بر وقت ضرورت یہ خزانے کام میں آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ زندہ اجسام کا خاصہ ہی یہی ہے کہ وہ غذا کی توانائی کو حرکت کی توانائی میں تبدیل کر دیں۔

قوموں کے جوہری اسرار

جامعہ بان کے ۸۰ سالہ پروفیسر دولف گانگ ریسلر کا کہنا ہے کہ فضا میں جوہری ذروں کی تلاش کر کے امریکہ اور روس نے ایک دوسرے کی جوہری سرگرمیوں پر برسوں سے نظر رکھی ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں پروفیسر ریسلر نے پروفیسر ژولیو کیوری کے سائیکلوٹرون پر کام کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کرہ ہوا کی جانچ سے پتہ چل سکتا ہے کہ کس ملک نے کس قسم کا جوہری

بم (ایٹم بم) استعمال کیا ہے۔ کہاں وہ پھٹا اور کب۔

جب کوئی جوہری بم پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے سے جو ذرات نکلتے ہیں وہ آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں جہاں وہ کرہ ہوا میں موجود گرد کے ذرات سے چمٹ جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ مرکزی (NUCLEUS) کے مادے کے ان نابکار ذروں کی "عمر" محدود ہوتی ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان ذروں کے مختلف حصوں کے تعلقات میں فرق آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب ہوا میں یہ نابکار ذرے موجود ہوتے ہیں وہ زمین کے گرد گھومتی رہتی ہے اس حرکت کی رفتار پیمائش کی جاسکتی ہے پس اگر اس ہوا کو چھان کر اس کی جانچ کر لی جائے اور نابکار ذروں کا تجزیہ کر لیا جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قسم کا بم چلایا گیا۔ کہاں چلایا گیا اور کب۔ چنانچہ اگر جرمنی میں یہ معلوم کرنا ہو کہ امریکہ نے کس قسم کا بم چلایا ہے تو تقریباً ۱۰۰ مکعب میٹر ہوا کو چھان کر اس کا تجزیہ کرنا ہوگا جب جاکر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

پروفیسر ریسلر اگرچہ خود کسی جوہری بم یا ہائڈروجن بم پہ کام نہیں کر رہے ہیں تاہم ان کو یقین ہے کہ روس کے جوہری اسلحہ کے سلسلے میں معلومات اسی طرح حاصل کی گئی ہیں۔ ہائڈروجن بم جب پھٹتا ہے تو ریڈیو کاربن ۱۴ کے ہمجا (ISOTOPES) حاصل ہوتے ہیں جو ہوا میں آسانی سے شناخت کئے جاسکتے ہیں ایسے بموں کے پھٹنے سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کا محو کر دینا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ زلزلہ نگار والے طریقہ سے یہ طریقہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔

چار ہزار برس پرانی کتاب ۱۳ برس کی محنت کے بعد امریکہ کے عالموں نے اس طبی کتاب کا ترجمہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے جو ۴۰۰۰ برس پرانی ہے یہ کتاب مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی تھی جو ۵۰ برس اُدھر عراق میں دریافت ہوئی تھیں۔ کتاب سمری رسم الخط میں ہے۔ یہ کتاب طب سے متعلق دنیا میں سب سے پرانی کتاب ہے۔

ن۔ا۔ع

ایک نامۂ اخلاص و مودت

"دفتر میں آئے دن دوستوں اور مخلصوں کے اس طرح کے خطوط آتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کو شائع کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آتا تھا، مخلص دوست ظ انصاری صاحب کا یہ نامۂ اخلاص جیسے ہی ہم دست ہوا معلوم نہیں کیوں اس کو شائع کر دینے کا ارادہ ہونے لگا، پھر بھی سوچتا رہا یہاں تک کہ مضامین کی ترتیب میں ایک خلا سامنے آ گیا اور قدرتی طور پر اس کو پُر کرنے کی فکر ہوئی۔ اس چھوٹے سے "خلا" میں کوئی مضمون نہیں آ سکتا تھا اس لئے رجحان یہی ہوا کہ اخلاص و مودت کی ان شعاؤں کو ناظرین برہان تک پہونچا ہی دیا جائے۔ (ع)

محترم مفتی صاحب۔ تھوڑی دیر ہوئی ڈاک سے بُرہان آیا۔ میں کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں ایک یاد دہانی کا عریضہ روانہ کروں گا۔ اور اس میں مجھے آپ سے یہ عرض کرنا تھا کہ:-

(۱) آپ نے بُرہان میں 'ورق ورق' کتاب پہ تبصرہ نہیں فرمایا۔

(۲) آپ نے وہ تین چار نثر پارے جو میں نے دفتر میں محض حافظے کی مدد سے لکھ دیئے تھے (اپریل ۵۳ء) 'ورق ورق' کے زیر عنوان' وہ بھی شائع نہیں فرمائے، میرے پاس ان کی کوئی نقل نہیں ہے' اگر وہ برہان میں یا کہیں شائع نہ ہوئے تو بس گویا ضائع ہو گئے۔

لیکن یہ خط میں کئی روز سے لکھنا چاہتا تھا اور نہیں لکھا گیا۔ پھر بھول گیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ برہان آیا تو اُس کے اڈی ٹوریل میں ندوۃ المصنفین کی حالت پڑھی۔ اور جس دردمندی کے ساتھ پڑھنے والوں کو متوجہ کیا گیا ہے، اس کا احساس ہوا۔ میں آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کی کوئی تمنا نہیں ہے کہ آپ کے ادارے سے مجھے کوئی فیض ہی پہنچے، لیکن جیسا آپ کا ادارہ ہے، اور جیسے آپ خود ہیں، ایسے اداروں اور ایسی ہستیوں کی (جو ایک دوسرے کا حصہ ہیں) تعداد ملک میں آدھی درجن بھی نہیں اور ایک مذہبی آدمی نہ ہونے کے باوجود میں یقین رکھتا ہوں اور کہیئے تو اس یقین کو علی الاعلان لکھوں بھی کہ آپکی محنت کے اس ثمر کو اور آپکے مشن کو جیسا وہ ہے اسی لائن پر باقی رہنا چاہیئے -- زندہ رہنا چاہیئے۔ اور کل جب معاشی تنگیوں کا طوق گلے سے اتر چکے گا تو ایسے صاحب نظر اور روشن فکر لوگ ضرور موجود ہونگے جو اسے سماجی سرپرستی کے ساتھ زندہ رکھنے کا تمام انتظام کریں گے۔

ہاں — یہ مسئلہ آج کا ہے — بتائیے — میں کیا کروں ؛ بے غرض جو کام مجھ سے ہو سکتا ہو وہ آپ ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجئے، تعمیل کر دوں گا۔ یہ محض لفاظی نہیں ہے۔ پانچ ممبر بنانے کا جو آپ نے مشورہ دیا ہے وہ اگر واجب کفائی نہیں ہے تو انشاء اللہ میں اگلے مہینے کے خاتمے سے پہلے پانچ ممبروں کی فیس بھجواتا ہوں مگر اس سے مجھے تسکین نہ ہوگی ۔

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دو کتابیں جو چلنے والی ہیں اور یقیناً مقبول ہوں گی دو نامور پبلشروں کو دے چکا ہوں اگر اجازت ہو (محض اجازت) تو وہ دونوں وہاں سے واپس منگوانے کے لئے، آپ کا جواب آتے ہی خط لکھ دوں۔ ایک انجمن ترقی اردو کے پاس ہے، دوسری مکتبہ اردو لاہور کے پاس۔ آپ انھیں میرا ہدیہ سمجھئے، اور انھیں شائع کر دیجئے۔ مکتبے کی طرف سے اور اس کی رائلٹی سے میں (پہلے ہی) آپ کو فارغ خطی بھیجے دیتا ہوں۔ جو بھی رائلٹی ہو وہ اسی مکتبے میں میرا چندہ سمجھی جائے۔ بالکل رضاکارانہ۔

اگر مکتبہ برہان یا ندوۃ المصنفین جیسے صرف آدھے درجن پبلشر اور علمی ادارے ملک میں قائم ہو جائیں یا باقی رہ جائیں تو میں سمجھتا ہوں اس کی بدولت ہم بدبختوں میں اور اس زبان میں جس کے ہم عاشق ہیں علمی اور ادبی کام کا ایک معیار بنا رہے گا۔ ورنہ اس لائن میں جو اخلاقی دیوالیہ پن پایا جاتا ہے وہ اس درجہ شرمناک ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف سے چند اداروں کا نام بھی غیروں کے سامنے نہیں لے سکتے۔ یہ سوال ایک ذات یا ایک ادارے کا نہیں۔ بلکہ ایک زبان کے اشاعتی معیار۔ اور وہ بھی معیار اخلاق کا ہے۔ میں اس زبان کے ایک خادم کی حیثیت سے اپنا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ اگر قبول ہو۔ یا جو حکم؟ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ ۹ اکتوبر ۵۳ء

تبصرے

محمد حسن کالج میگزین کا سہیل نمبر

تقطیع کلاں ضخامت ۲۱۵ صفحات کتابت طباعت بہتر قیمت بلعہ
پتہ - محمد حسن انٹر کالج جونپور (یوپی)

جناب اقبال احمد خاں صاحب سہیل اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے نامور اور صاحبِ فن شاعر ہیں غزل اور نظم دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے - اگرچہ غزل میں جو سوز و گداز، جذب و مستی اور درد و کیفیات حسن و عشق کی محاکات ہونی چاہیئے اس سے ان کا کلام بڑی حد تک خالی ہے اور اس کی وجہ آل احمد صاحب سرور نے اپنے مقالہ میں خود سہیل صاحب کی زبانی یہ بیان کی ہے کہ " میں کسی پر عاشق تو ہوا نہیں اور تصوف کا دلدادہ ہونے کے باوجود صوفی بھی نہیں ہوں - میں نے تو غزل میں سیاسی حقائق بیان کئے ہیں " سہیل صاحب نے دراصل ان فقروں میں اپنے کلام پر خود بہت مناسب اور جامع تنقید کر ڈالی ہے - چنانچہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے جن کا ایک آٹھ صفحہ کا مقدمہ اس مجموعہ میں شامل ہے، بالکل درست کہا ہے کہ " غزل سے ان کو کم مناسبت ہے لیکن اسمیں بھی ان کی انفرادیت قائم ہے " بالفاظ دیگر سہیل صاحب نے غزل سے بھی نظم کا کام لیا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی بعض نظموں میں تغزل کا بھی رنگ پایا جاتا ہے - وہ اگرچہ اپنے بقول کسی پر عاشق نہیں ہوئے لیکن اس مجموعہ میں ان کی جو نعتیہ نظمیں شامل ہیں وہ صاف بتا رہی ہیں کہ ان کا دل عشق نبوی کا مخزن ہے اور اسی بنا پر ان نظموں میں عرفی کے نعتیہ قصائد کی طرح غزل اور نظم دونوں کی حلاوت و چاشنی موجود ہے - نعتیہ نظموں کے علاوہ موصوف کی دوسری نظمیں جو سیاسی، مذہبی، ادبی موضوعات پر یا کسی کی وفات، یا کسی خاص تقریب کے موقع پر اُردو یا فارسی میں لکھی گئی ہیں وہ سب شاعر کی طباعی و ذہانت، مہارتِ فن قدرتِ کلام اور پختہ مشقی کی دلیل ہیں - سہیل صاحب کے لاابالی پن کی وجہ سے ان کا کلام منتشر پڑا ہوا تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ گم ہو جائے اس بنا پر محمد حسن کالج کے اساتذہ اور طلبا اُردو شعر و ادب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کالج کے میگزین کی ایک اشاعت صرف کلام سہیل کے لئے وقف کر دی اور بڑے اہتمام سے اس کو جمع اور مرتب کر کے ایک دیوان کی شکل میں شائع کر دیا - شروع کے تقریباً پچاس صفحات میں سہیل صاحب کے بعض ذی علم اور مشہور احباب نے موصوف کے حالات و

سوانح اور ان کی شاعری اور دوسرے کمالات پر مقالات لکھے ہیں اس اعتبار سے یہ مجموعہ ادبی اور شعری دونوں حیثیتوں سے ارباب ذوق کے لئے قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔ تقطیع متوسط ضخامت تین سو صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد نو روپے۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

کئی سال ہوئے جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جبکہ وہ علیگڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے میگزین کا غالب نمبر اس اہتمام سے شائع کیا تھا کہ اسے علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اس کے بعد انجمن ترقی اردو علیگڑھ نے اس نمبر کو کتاب کی صورت میں چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں غالب نمبر کے مضامین و مقالات کی دوبارہ ترتیب کا کام جناب آرزو صاحب کے سپرد کیا تو موصوف نے چاہا کہ اس موقع اور حوصلہ افزائی سے فائدہ اٹھا کر غالب سے متعلق ایسا مواد اور معلومات فراہم کر دیئے جائیں جو غالب نامہ کا پہلا کام ذیں چنانچہ انجمن کے شوق سے انھوں نے مرزا پر تقریباً ایک ہزار صفحات کی کتاب تین جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنا لیا اور اس کے لئے بڑے انہماک اور خلوص سے کام شروع کر دیا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں مشاہیر ارباب قلم کے اور بعض اور غالب شناسوں کے اٹھارہ مقالات ہیں جو سب کے سب مرزا کے خاندانی و نسبی اور ذاتی و شخصی حالات و سوانح اور ان سے متعلقہ مباحث پر ہیں۔ اس مجموعہ میں اکثر مقالات تو وہ ہی ہیں جو غالب نمبر میں شائع ہوئے تھے مگر وہ بھی نظر ثانی اور مزید ترمیم و تنسیخ کے بعد اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض نئے مضامین بھی ہیں۔ دوسرا حصہ جو افکار غالب کے نام سے ہوگا وہ بھی زیر طباعت ہے اور تیسرا حصہ گنجینۂ غالب زیر ترتیب ہے۔ مرزا غالب اکثر اقبال کی طرح اردو اور فارسی کے ایسے خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان کی وفات پر جتنے دن زیادہ گذرتے جاتے ہیں اسی قدر ان کے کلام کی مقبولیت اور قدر اور اس بنا پر ان کے حالات و سوانح سے متعلق تحقیق و جستجو کا ذوق و شوق زیادہ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح مرحوم نے اپنے متعلق جو پیش گوئی کی تھی۔

"شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

آج وہ حرف بحرف پوری ہو رہی ہے اس بنا پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام یہ سلسلۂ کتب مرزا غالب پر حرف آخر کا حکم رکھتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرزا غالب پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یہ سلسلہ اس کی آخری کڑی ہے جو غالبیات کے وسیع ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور جو جامعیت مباحث، ترتیب معلومات، تحقیق و جستجو، حسن بیان و زبان اور تنقید و تمحیص کے اعتبار سے غالب پر ایک مستند و بلند پایہ دائرۃ المعارف کا حکم رکھتا ہے۔ فاضل مرتب اور انجمن ترقی اردو دونوں اس شاندار ادبی کارنامہ پر ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

برہان

جلد ۳۱ شمارہ نمبر ۶

دسمبر ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے کہ پچھلے دنوں عالمِ اسلام کی دو نامور شخصیتوں، سلطان ابن سعود اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس عالمِ آب وگل کو خیرباد کہہ کر عالمِ آخرت کی راہ لی۔ حجاز کی سرزمینِ قدس ہبطِ وحی حامل بیت اللہ اور مولد و استراحت گاہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور اسی بنا پر اس کی خاک مسلمانوں کی جبینِ عقیدت وارادت کی افشاں اور اُس کا ذرہ ذرہ اُن کی آنکھوں کا تارا ہے اس نسبت سے مسلمانوں کو سلطان مرحوم کے ساتھ بھی کہ وہ پاسبانِ حرم ہونے کا شرف رکھتے تھے، قلبی و روحانی تعلق تھا اس کے علاوہ مرحوم میں ذاتی طور پر چند در چند ایسے اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث تمام مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی بڑی عزت وعظمت تھی۔ عادات وخصائل طبعی میلان ورجحان اور ظاہر و باطن کے لحاظ سے وہ اور اُن کی حکومت متنبی کے اس شعر کے مصداق تھے۔

حسن الحضارۃ مجلوبٌ بتطریۃٍ وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

مرحوم سیاسی اعتبار سے نہایت مدبر، بیدار مغز اور روشن دماغ و مستقل مزاج تھے اُن کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حجاز صحیح معنی میں بلدًا امنًا اور اس کا حرم درحقیقت مسلمانوں کے لیے حرم بن گیا۔ انھوں نے فتنہ پرور اور مفسد قبائل کی سرکوبی کرکے پورے ملک میں امن وامان اس طرح قائم کردیا تھا کہ ایک بڑھیا بھی تن تنہا اپنے مال واسباب کے ساتھ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک بے خوف وخطر سفر کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ مرحوم نے حرمین شریفین کے باشندوں کے لیے دینی و دنیوی تعلیم کا بھی بندوبست کیا اور اُنھی اقتصادی زبوں حالی جواُن کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی اُس کا مداوا اس طرح کیا کہ آج وہاں فارغ البالی اور معاشی رفاہیت وخوش حالی کا دور دورہ ہے۔ حجاج کی راحت وآسائش کا سلطان مرحوم کو خاص خیال رہتا تھا اور اس سلسلہ میں وہ ایام حج میں صحت وصفائی، پانی کی فراوانی اور دوسری اشیاء ضرورت کی فراہمی کا جو انتظام کرتے تھے وہ اُن کی فرض شناسی کا سب سے بڑا ثبوت تھا، انھیں اوصاف و کمالات کی بنا پر انھیں عالم اسلام کا اعتماد حاصل تھا اور ہر جگہ اُنہیں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ

آں مرحوم کو بخشش و مغفرت کی نعمت سے نوازے اور اُن کی قبر ٹھنڈی رکھے اور اُن کے جانشین کو صحیح معنی میں ان کی طرح حرم کا امین و پاسبان بنائے۔ آمین۔

مولانا سید سلیمان ندوی طبقۂ علمار میں وسیع النظر عالم، محققین میں بلند پایہ محقق اور مصنفین میں ایک گرامی مرتبت مصنف تھے وہ جس طرح قدیم تعلیم یافتہ گروہ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے اسی طرح تعلیم جدید کے طبقہ میں بھی اُن کو بڑا وقار اور مرتبہ حاصل تھا۔ ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد مولانا شبلی جو مردم شناسی اور جوہر قابل کی قدر دانی میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے اُن کے فیضان تعلیم و تربیت نے مولانا سید سلیمان ندوی کو اُستاد کا جانشین بنایا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جانشینی کا حق جس خوبی سے ادا کیا ہے کسی شاگرد نے کم کیا ہوگا۔ انھوں نے سیرۃ النبی کے نام سے، جیساکہ وہ خود فرماتے تھے، درحقیقت اسلام کی ایک نہایت مستند مفصل اور مبسوط انسائیکلوپیڈیا لکھی۔ قرآن مجید کے تاریخی اور جغرافیائی مباحث پر ان کی کتاب ارض القرآن اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی اور عمر خیام پر اُنھوں نے جو داد تحقیق دی ہے وہ اُن کی قبائے علم و فضل کا تکمۂ زریں ہے مستقل بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ وہ مختلف تاریخی، مذہبی، ادبی اور لسانی و تنقیدی مباحث پر اُن کے قلم سے وقتاً فوقتاً جو مقالات یا چھوٹے چھوٹے رسالے نکلتے رہے ہیں وہ ان مباحث کے طلبار اور علمار کے لئے شمع راہ کا کام عرصہ تک دیتے رہیں گے۔ ان ذاتی علمی و تحقیقی کارناموں کے علاوہ آں مرحوم کا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دارالمصنفین میں اپنے فیض تعلیم و تربیت سے ارباب قلم علمار کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کے تصنیفی کارناموں کی بدولت اسلامی تاریخ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی ادبیات کا ایک گرانقدر ذخیرہ بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل ہوچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مولانا مرحوم نے اس حیثیت سے اُردو زبان کی خصوصاً اور اسلامی علوم و فنون کی عموماً وہ شاندار خدمات انجام دی ہیں جن پر اُردو زبان و ادب کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے اور جو بہت سے ممالک اسلامیہ کے لئے لائق رشک ہے، مولانا کی تصنیفی زبان اُردو تھی اُنھوں نے خود جو کچھ لکھا اسی زبان میں لکھا لیکن ان کی تصنیفات و تالیفات اور اُن کے علم و فضل کی شہرت دوسرے ممالک میں بھی پہونچی اور وہ حجاز، مصر، ایران اور ترکی اور افغانستان میں بھی بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ادھر کم و بیش پندرہ سال سے جب سے وہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامانِ ارشاد و ہدایت سے وابستہ ہوئے تھے تصنیف و تالیف کی بجائے تصفیۂ نفس اور تزکیۂ باطن کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی تھی اور اس میں اس درجہ غلو ہوگیا تھا کہ اعمال و وظائفِ باطنی کے علاوہ وہ خود اپنے عمر بھر کے کارناموں کو غیر وقیع سمجھنے لگے تھے۔ بہرحال اُن کے کارنامے علم و تحقیق کی دنیا میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں اور ان کی افادیت مسلم ہے۔

مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت بھی لائقِ ذکر ہے کہ خالص علمی اور تحقیقی کام کے ساتھ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی، تعلیمی اور سیاسی تحریکات میں بھی برابر کے شریک رہے۔ جلسوں میں صدارت کرتے تھے، تقریریں کرتے تھے اور ان تمام معاملات میں عملی شرکت کرتے تھے۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے منکسر المزاج، خوش طبع اور بذلہ سنج تھے۔ بہت دھیمی آواز میں چھوٹے چھوٹے فقرے جو بعض اوقات صنعت ایہام کے حامل ہوتے تھے بولنے کے عادی تھے، مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اُس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و علم کے اس مخلص خادم کو جنت الفردوس میں مقامِ جلیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمارا مسئلہ تعلیم

(۲)

از سعید احمد

تیسرا سوال یہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں ڈسپلن کیونکر قائم کیا جائے۔ یہ سوال پہلے دو سوالوں سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یونیورسٹیوں میں تعلیم کا اور علم کا معیار پست بھی رہا تو اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ طلباء کی علمی استعداد بلند نہیں ہوگی اور یونیورسٹی ایجوکیشن سے جن علمی فوائد کی توقع ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیئے وہ حاصل نہیں ہونگے۔ لیکن اگر طلباء ڈسپلن کے عادی نہ ہوئے ان کی زندگی آئین وضابطہ کی پابندی کی خوگر نہ ہوئی تو اس کا اثر اُن کی آئندہ زندگی پر پڑے گا اور وہ خواہ کسی شعبہ میں کام کریں اور کسی ہی پیشہ کو اختیار کریں بہرحال وہ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لائق نہ ہونگے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر بڑی سنجیدگی اور توجہ سے غور کیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ عام طور پر ڈسپلن اور اخلاقی اصلاح دونوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ اخلاق بنتے ہیں بنائے نہیں جاتے اور اس کے برعکس ڈسپلن رہتا نہیں بلکہ رکھا جاتا ہے۔ آج کل عام شکایت ہے کہ طلبا کی اخلاقی حالت اچھی نہیں بلکہ روز بروز انحطاط پذیر ہے اور ان میں ڈسپلن نہیں ہے۔ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں یعنی ہم کو دراصل کہنا یوں چاہیئے کہ طلباء کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے اور یونیورسٹیوں میں (نہ کہ طلباء میں) ڈسپلن نہیں ہے۔ اب آئیے پہلے ان دونوں میں سے ہر ایک کے اسباب پر غور کریں، پھر اُن اسباب کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے اس پر غور ہو سکتا ہے۔

طلباء کی اخلاقی حالت یونیورسٹی اور کالج میں جو طلباء آتے ہیں ہائی اسکولوں سے آتے ہیں اس بنا پر طلبائے سے یہ توقع کرنا کہ کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اخلاقی اعتبار سے وہ بدل جائیں گے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اخلاقی عادات و اطوار اور طبیعت کے رجحانات و عواطف کے نشوونما اور ان میں پختگی کا دور ہائی اسکول میں ہی گذر جاتا ہے۔ اس دور میں اگر کوئی طالب علم اچھا ہے تو وہ آئندہ کالج کی زندگی میں بھی اچھا رہیگا

اور اگر یہاں اخلاقی بے راہ روی اس میں پیدا ہو چکی ہے تو کالج میں داخل ہو جانے کے بعد عام حالات میں وہ بے راہ روی ترقی پذیر ہی ہوگی، کم نہیں ہوگی۔ اب دیکھئے کہ آج کل ہمارے ہائی اسکولوں کا کیا حال ہے؟ ظاہر ہے کہ ہائی اسکولوں میں عام طور پر ہوسٹل نہیں ہوتے۔ ان میں جو لڑکے تعلیم پاتے ہیں وہ مقامی ہی ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ہوسٹل میں رہنے سے اخلاقی تعمیر و اصلاح کے جو فوائد ان کو حاصل ہو سکتے تھے یہ طلبا ان سے محروم رہتے ہیں۔ ان طلبا کے لئے ان کا اپنا گھر اور اُن کے اسکول کا ماحول صرف یہی دو جگہیں ہوتی ہیں جہاں ان کے اخلاق کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن دونوں جگہ عموماً حالات ایسے ہوتے ہیں کہ طالب علم کو کہیں بھی اخلاقی تعمیر کی مدد نہیں ملتی۔ جہاں تک گھر کا تعلق ہے تو چند مہذب تعلیم یافتہ اور شائستہ گھرانوں کو چھوڑ کر۔ آج کل غربت و افلاس۔ جہالت اور بعض اور وجوہ کی بنا پر ہماری سوسائٹی کی جو حالت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ زندگی کے اعمال و افعال پر مادی اغراض اور جسمانی خواہشات و مطالبات کا اس درجہ غلبہ ہے کہ انسان کی روحانی حس اور اس کا اخلاقی وجدان جن پر اخلاقِ فاضلہ کی تعمیر ہوتی ہے روز بروز مضمحل اور کمزور ہوتے جارہے ہیں اور اُن کی اس کمزوری کا مظاہرہ روزانہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ جو چند گھر مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں اُن کا بھی اکثر و بیشتر یہ حال ہوتا ہے کہ بیٹے کو اسکول میں داخل کر دینے کے بعد باپ خود بیٹے کی اخلاقی نگرانی اور اس کی تعمیر سیرت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور اس کو کلیتہً اسکول کے ماحول اور اس کی فضا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس بنا پر گھر کے ماحول کا اگر اس کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر بھی نہیں ہوتا تو اچھا بھی نہیں ہوتا۔ ورنہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا بُرا ہی ہوتا ہے۔

اب رہا اسکول کا ماحول! ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملک میں اقتصادی زبوں حالی عام ہے اور پھر اسکولوں کے اساتذہ تنخواہوں کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر اس کا شکار ہوتے ہیں اور یہ اقتصادی زبوں حالی اور معاشی تنگی سو بلاؤں کی ایک بلا ہے۔ اس کی وجہ سے اسکولوں کے اساتذہ کا معیارِ زندگی پست ہوتا ہے۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو آپ اُن سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر جن کا اثر ان کے شاگردوں پر پڑ سکے کی توقع کس طرح کر سکتے ہیں۔ انہیں ساتھ ہی ایک کافی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنے کلاس کے طلبا کی معمولی معاوضہ پر ٹیوشن بھی کرتے ہیں اور اب طبعی طور پر شاگرد استاذ کو اپنے باپ کا یا خود اپنا اجیر سمجھتا ہے اور اس بنا پر اُستاد کی وہ عظمت جو شاگرد کے دل میں ہونی چاہیئے اور جس کے باعث اس کو اخلاقی تعمیر میں اُستاد سے مدد مل سکتی تھی بالکل مفقود ہوتی ہے۔ کچھ یہ صورت حال اور کچھ عام دماغی و ذہنی انتشار اور اپنے فرائض کا عدم احساس ان سب کا ایک

نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ کو اسکولوں کی چہار دیواری میں بُرے بھلے کسی طرح کلاس روم میں پہونچکر اپنا گھنٹہ پورا کرلینے سے واسطہ ہوتا ہے اور بس! اس کے علاوہ طلبار کی اخلاقی نگرانی اور اُن کی تعمیرِ سیرت سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کلاس روم سے باہر طلبار ان کے سامنے شور و غل مچارہے ہیں، بیہودگیاں کررہے ہیں۔ اناپ شناپ اور بے ڈھنگے طریقہ سے کھارہے ہیں' اساتذہ کو اتنی جراُت نہیں ہوتی کہ وہ انھیں سمجھائیں اور انہیں نصیحت کریں۔ اس طرح کی سب چیزوں کے متعلق اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اُن کا کام صرف پڑھانا ہے۔ رہا ڈسپلن وغیرہ تو یہ ہیڈ ماسٹر کا فرض ہے وہ جانے اور اُس کا کام۔ غرض یہ ہے کہ اساتذہ میں کام کرنے کی جو مشنری اسپرٹ، خلوص و ہمدردی، اور طلبار کے ساتھ پدرانہ و مربیانہ برتاؤ ہونا چاہیئے وہ اُن میں نہیں ہوتا' اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کی زندگی میں طالب علم کی اخلاقی تربیت کا سرو سامان نہ اس کے گھر میں ہوتا ہے اور نہ اسکول میں' اب وہ ہوتا ہے اور اس کا ماحول' اس کی سوسائٹی' شہر کی فضا اور سماج کی عام آب و ہوا۔ اور آج کل ان سب کا جو حال ہے وہ معلوم ہی ہے۔ گوشہ گوشہ میں سینما اور پکچر ہاؤس۔ گھر گھر ایکٹرسوں کے فوٹو۔ ادھر فلمی گانے اُدھر رقص و سرود، بے محابا جلوے۔ فحش لٹریچر۔ مخربِ اخلاق افسانے اور ناول۔ بھیانک گناہوں کے اڈے۔ کہیں کسی جگہ نہ مذہب کا ذکر نہ بُرائیوں پر روک ٹوک۔ نہ بدی پر ملامت۔ نہ اخلاقی فضائل کا چرچا۔ اب خود سوچیئے کہ ایک طالبعلم اپنے تحت الشعور کی پختگی کے دور میں جب اس ماحول سے دوچار ہوگا اور جب "طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ" کا عالم ہوگا تو اس سے کیونکر اخلاقِ فاضلہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ہماری پُرانی نسل جو آج چراغِ سحری ہے اُس کے بزرگوں کو۔ ہندو ہوں یا مسلمان۔ دیکھیئے ان لوگوں نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس زمانہ میں کی جبکہ انگریزی پڑھ کر انگریز بن جانا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھی گئے اور تین چار سال وہاں رہے لیکن اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے ان لوگوں میں جو شرافت، تہذیب، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، تواضع و مروت، ہمدردی و خلوص اور ایک اخلاقی بلندی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان بزرگوں کا بچپن جس ماحول میں بسر ہوا وہ آج کل کے ماحول سے یکسر مختلف تھا ان بزرگوں نے ابتدائی تعلیم مکتبوں یا پاٹ شالاؤں میں پائی جہاں ان کو اپنے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں کی تعلیم ملتی تھی۔ اخلاقی درس ملتا تھا۔ مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کے کارنامے اُن کے کان میں پڑتے تھے اور اس طرح اُن کے تحت الشعور

ذہن میں اخلاقی اقدار اس طرح رچ اور بسجاتے تھے کہ آئندہ زندگی میں وہ مغربی تہذیب کے ماحول میں رہ کر بھی اپنے قومی اخلاق وخصائل سے بے بہرہ و بے گانہ نہیں ہوتے تھے۔ ان بزرگوں کے ماحول میں باپ کے سامنے یا خاندان کے کسی بزرگ کے سامنے بیٹے کی مجال نہ تھی کہ عشق و محبت، کا نام بھی لے۔ کسی نوجوان لڑکی اور اس کے حسن کی فسوں کاریوں کا تذکرہ بھی کرے، صرف یہ ہی نہیں بلکہ شادی ہوجانے کے بعد بھی ایک دو سال تک نوجوان بیٹے کو جرائت نہ ہوتی تھی کہ ماں باپ کی موجودگی میں بیوی سے بات بھی کرلے۔ لیکن آج زمانہ نے ہمارے اخلاقیات کی کتاب کا جو ایک نیا ورق اُلٹا ہے تو اب عالم یہ ہے کہ باپ اور ماں، بیٹا اور بیٹی دونوں ایک ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھکر سینما دیکھتے ہیں اور عشق و محبت کی تمام واردات اور حسن و شباب کی سب رموز و کیفیات ان کی نظر سے گذرتی ہیں اور پھر گھر واپس آکر اُن پر تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا جاتا ہے جس میں بزرگ اور خورد سب برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ ہیٹی ایکٹر کی تعریف میں رطب اللساں ہوتی ہے تو بیٹا ایکٹریس کے کمالِ فن کی داد دیتا ہے اور پھر دو چار فلمی گانوں کی نقالی پر یہ گفتگو ختم ہوجاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مغربی ملکوں میں جو آزادی ہے کہیں نہیں، لیکن یورپ اور امریکہ تک کا یہ حال ہے کہ وہاں ایک خاص عمر تک لڑکے یا لڑکی کو سنیما دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں مذہب کی تعلیم کا انتظام اگرچہ حکومت کی طرف سے نہیں ہوتا لیکن مشنری سوسائٹیاں کروروں روپیہ خرچ کرکے خود ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔ اس بنا پر اخلاقی اعتبار سے وہ جس چیز کو بُرا سمجھتے ہیں اُس کو بُرا جانتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کا یہ ضابطۂ اخلاق ہمارے ضابطۂ اخلاق سے خواہ کتنا ہی مختلف ہو لیکن بہرحال وہاں ایک کیرکٹر ہے، ایک نظم ہے۔ اخلاقی یک جہتی ہے۔ اور یہاں پراگندگی۔ انتشار۔ اور اخلاقی انارکی ہے اور اس کے لئے ہمارے بچے نہیں بلکہ ہم خود ذمہ دار ہیں، قصور اُن کا نہیں بلکہ ہمارا ہے۔ اسکول کُل کا ایک جزہیں جب کل صالح نہیں تو جزء کے صالح ہونے کی توقع عبث ہے۔ جڑ اگر فاسد ہے تو شاخیں کس طرح برگ و بار پیدا کرسکتی ہیں، معاشرہ اور سماج کی بنیاد میں اگر فتور پیدا ہوگیا ہے تو اُس پر جو عمارت اُٹھے گی اُس میں بھی استواری نہیں ہوسکتی۔

بہرحال یہ ہے وہ ماحول، یہ ہے وہ سماج اور معاشرہ جس میں پل بڑھ کر اور نشو و نما پاکر ہمارے نونہالانِ قوم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتے ہیں، یہاں پہونچ کر ان کو جو ماحول ملتا ہے وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اُن سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف مخلوط تعلیم، مخلوط جلسے، مخلوط ڈرامے اور ناٹک اور مخلوط

کھیل، اور دوسری جانب کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اندرونی پالیٹکس اور پارٹی بازی، ان دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اُس سکونِ قلب و دماغ اور ذہنی یکسوئی سے محروم ہو جاتا ہے جو یونیورسٹی ایجوکیشن کے زمانہ میں اُس کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ آج کل عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ طلبا میں کمیونسٹ رجحانات بڑھ رہے ہیں اور اسی بنا پر آئے دن یونیورسٹیوں میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ کیونکہ کمیونزم ایک فلسفہ ہے، ایک خاص قسم کا نظامِ فکر ہے، ایک مخصوص انداز کا طرزِ زندگی ہے اس کو اگر کوئی شخص سچ مچ اختیار کرے گا تو وہ اسی وقت کر سکتا ہے جبکہ اس نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ دنیا کے اقتصادی معاملات و مسائل اور ان کے حل کی شکلوں پر غور کیا ہو۔ اور ہمارے ان نوجوانوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اس بنا پر اصل یہ ہے کہ طلبا اولاً کمیونسٹ نہیں ہوتے بلکہ ایک ہیجان انگیز ماحول میں رہنے کے باعث ان میں ہمارے قومی اخلاق سے انحراف کرنے کی جو رغبت پیدا ہوتی ہے وہ اس کی تسکین کے لئے کسی سہارے کے جویا اور طلبگار ہوتے ہیں اور نام نہاد کمیونزم کے دامن میں اُن کو وہ سہارا مل جاتا ہے۔ گویا طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے سامنے اپنے ہر عمل کی صفائی کہاں پیش کرتے پھریں، بس سب سوالوں کا اور ہر احتساب و بازپرس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کمیونسٹ ہیں۔ یہ ایک نہایت عجیب قسم کا نفسیاتی دھوکہ ہے جس میں طالب علم اور اُس کے نگراں دونوں مبتلا ہوتے ہیں۔

سر رادھا کرشنن یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، تعلیمی مباحث پر ایک نہایت مفصل اور جامع رپورٹ ہے۔ اس کمیشن نے ایک سوالنامہ بھی ہندوستان کے ماہرین تعلیم کے نام جاری کیا تھا جس میں چودہ نمبر کا سوال ڈسپلن کے ہی متعلق تھا۔ کمیشن کو اس سوالنامہ کے جو جوابات موصول ہوئے وہ جلد دوم و سوم میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں تک مذکورہ بالا سوال کا تعلق ہے اس کے جوابات چند در چند قسم کے ہیں کسی کے نزدیک طلبا کی جسمانی صحت کی کمزوری جس کی عام وجہ مناسب غذا کا نہ ملنا اور ہوسٹلوں کی بد انتظامی ہے، ڈسپلن کے عام فقدان کا سبب ہے۔ کسی کے خیال میں اس کی ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو طلبا کو اپنے اغراض کا آلۂ کار بناتی ہیں۔ کسی کی رائے ہے کہ طلبا کے لئے کھیل کود، ورزش اور ادبی اور سوشل سوسائٹیوں کی کمی اس بیماری کا سب سے بڑا اور اصلی سبب ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، یہ جو کچھ کہا گیا

بالکل صحیح اور بجا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ یہ جتنے اسباب بیان کئے گئے سب جزئی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اور کالجوں میں کس چیز کا انتظام نہیں ہوتا۔ طلبا کے لئے کامن روم بھی ہوتا ہے۔ ان کی سوسائٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ اسپورٹس کے سامان کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کا جمنازیم بھی ہوتا ہے۔ ایتھلیٹک کلب بھی ہوتا ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ طلبا ان سے خاطر خواہ فائدہ ہی نہیں اٹھاتے؟ یہ آخر کیوں؟ بنیادی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی، یعنی طلبا کا ماحول اور اس کے مضر اثرات جو اُن کے جسم اور دماغ دونوں کی صحت کو برباد کر دیتے ہیں۔

ہمارا یہ دور اس حیثیت سے بڑا عجیب دور ہے کہ اس میں ہر چیز سیاست بن گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ علم و تعلیم کے حرم کدے جو اس آلائش سے پاک ہونے چاہیئے تھے اب وہاں بھی پالیٹکس چلتی ہے، وائس چانسلر کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اساتذہ کی ایک جماعت کو اپنے اعتماد میں رکھے۔ یہیں سے پارٹی بندی شروع ہوجاتی ہے۔ کچھ اِدھر اور کچھ اُدھر۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں مختلف عہدے، یا امتیازات یا مختلف کونسلوں اور مجلسوں کی ممبری حاصل کرنے کے لئے اساتذہ میں باہمی رقابتیں اور چشمکیں ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں ہر فریق وہ تمام حربے استعمال کرتا ہے۔ اساتذہ جب اس طرح دو دو اور تین تین ٹولیوں اور گروہوں میں بٹ جاتے ہیں تو اس کا لازمی اثر طلبا پر بھی پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ اور ہو یا نہ ہو بہرحال یہ ضرور ہوتا ہے کہ طلبا کو اساتذہ کے کیرکٹر اور ان کی بلند سیرت سے جو فائدہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوتا۔

طلبا میں اخلاقی انحطاط کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کا عام رجحان سائنس کی طرف ہوگیا ہے۔ فلسفہ و تاریخ۔ اخلاقیات اور ادب و شعر کے مطالعہ سے انسان میں ایک خاص قسم کا کلچر اور ایک اخلاقی حس پیدا ہوتی ہے۔ اشعار خواہ کسی زبان کے ہوں اُن میں عام طور پر عشق و محبت اور نیاز مندی و خود سپردگی کے مضامین ہوتے ہیں۔ اس بنا پر شعر پڑھنے۔ گنگناتے رہنے اور اس میں حظ آنے سے طبیعت میں سوز و گداز۔ لطافت و نرمی اور نیاز مندی کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو اخلاق فاضلہ کے لئے سنگ بنیاد کا حکم رکھتی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ چونکہ ماں باپ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ لڑکے کو سائنس کے شعبہ میں بھیجا جائے گا اس لئے ہائی اسکول کے مضامین میں بھی کسی کلاسکل زبان کے بجائے اس کو سائنس اور اس کے متعلقہ مضامین ہی لینے پڑتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قومی سرمایۂ ادبیات۔ زبان کلچر اور اپنے تہذیبی نقوش و خطوط سے ناواقف رہتا ہے اور سائنس میں ڈوبے رہنے سے اس کی زندگی بھی مکینکل

ہو جاتی ہے۔ سائنس کی اہمیت اور ضرورت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن کلچر تو بہرحال فنون کے مطالعہ کے بغیر نہیں آتا اگر توجہ کی جائے تو نظام تعلیم اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ ایک خاص مرحلہ تک ہر طالب علم کے لئے قومی سرمایۂ ادب سے واقفیت کو ضروری قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ہمارے ملک کے مشہور اور نہایت قابل سائنسداں ہیں مگر ساتھ ہی شعر فہمی اور سخن سنجی کے ذریعہ انھوں نے اپنے خاندان کی روایات شعر و ادب کو جس طرح قائم رکھا ہے کہ بزم شعر و سخن میں بھی بیٹھتے ہیں تو رونق محفل ہو کر بیٹھتے اور شمع انجمن بنے رہتے ہیں۔ ادب اور سائنس ان دونوں چیزوں کے امتزاج نے موصوف کی شخصیت میں جو جاذبیت اور گیرائی پیدا کر دی ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہوگی۔ ہمارے نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت بھی شروع سے اگر اسی نہج پر ہو تو پھر سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ان میں قومی کلچر اور قومی تہذیب و اخلاق کی کمی بھی نہیں ہوگی اور وہ بہمہ جہت ایک کامیاب و خوشگوار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں گے۔

ڈسپلن

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ڈسپلن رہتا نہیں ہے بلکہ رکھا جاتا ہے یعنی اس کا تعلق طلبا سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ان کی لیاقت و قابلیت انتظام سے ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈسپلن کے معنی رعب قائم رکھنا ہے اور اس لئے کالج اور یونیورسٹی کے افسر اعلیٰ کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماتحتوں یا طلبا کے ساتھ زیادہ خلا ملا نہ رکھے، ان کے ساتھ بے تکلف ہنسے بولے نہیں اور اپنے آپ کو لئے دیئے رکھے ممکن ہے انگریزوں کے زمانہ میں یہ درست ہو کیونکہ خود انگریزوں کی حکومت کی شان یہی تھی اس بنا پر ہر محکمہ کا افسر اعلیٰ اسی طریقہ پر چل کر اڈمنسٹریشن میں کامیاب رہتا تھا۔ لیکن آج جب کہ عوام کی حکومت کا زمانہ ہے اور دنیا میں غیر طبقاتی زندگی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ مفید نہیں بلکہ سخت مضر ہے۔ چنانچہ آج کل طلبا کی شورش پسندیوں کی جو عام خبریں آرہی ہیں اگر ان کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو بے شبہ اس میں بڑا دخل مذکورہ بالا طریقہ کا ملے گا۔ آج اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنے عہدہ، اپنی پوزیشن یا اپنے منصبی اقتدار سے مرعوب کر کے اپنے سے متعلق لوگوں کو قابو میں رکھے اور ان پر حاوی رہے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اقتدار کی قوت آزمائی کا جب کبھی سوال آئے گا تو چونکہ طلبا کو معلوم ہے کہ آج عوامی اور اجتماعی مطالبہ سب سے بڑی طاقت ہے اس بنا پر ایک بالادست طاقت کو شکست دینے کے لئے وہ سب ایک محاذ پر جمع ہو جائیں گے اور آخر حریف کو سرنگوں کر کے دم لیں گے۔

ہماری مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں جا بجا جو مشن کالج قائم ہیں ان پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم

ہوگا کہ مجموعی اعتبار سے جتنا اچھا ڈسپلن ان کالجوں میں ہوتا ہے دوسرے کالجوں میں نہیں ہوتا حالانکہ ان کالجوں کے پرنسپل اور مشنری اساتذہ طلبا کے ساتھ بے تکلف ہوکر رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے ہیں۔ طلبا کی انجمنوں میں شریک ہوتے اور ان کی کاروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

بہرحال حق یہ ہے کہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے سب سے مقدم اور ضروری چیز یہ ہے کہ ادارہ کے افسر اعلیٰ کو طلبا کا اور اس کے رفقاء کار کا اعتماد حاصل ہو۔ اور اس اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل صفات پائی جائیں۔

(۱) پہلی صفت فرائض مفوضہ کو باحسن وجوہ انجام دینے کی صلاحیت ہے، اسے اپنے کام اور اس سے متعلقہ تمام امور پر پورا حاوی ہونا چاہیے اس میں تحریر اور تقریر کا ملکہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو دلنشین طریقہ پر اپنے مخاطب کے ذہن میں بٹھا سکے۔ لیاقت و قابلیت بجائے خود ایک کمال ہے۔ ایک حسن ہے اور ہر کمال اور حسن اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔

(۲) دوسری صفت خلوص اور محبت ہے۔ کوئی فیصلہ کرتے وقت اپنے اقتدار کی عصبیت سے بالکل آزاد ہو کر اسے مخلصانہ طور پر یہ سوچنا چاہیے کہ علمی اور تعلیمی اعتبار سے طلبا کا فائدہ کس میں ہے بس اس کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً یہ کہ میری بات کس طرح اونچی رہے گی، اس سے میرا اقتدار تو کم نہیں ہو جائیگا۔ اس قسم کا کوئی سوال اس کے ذہن میں نہیں ہونا چاہیے

(۳) خود اس کا کیرکٹر بلند، بے داغ اور بے عیب ہونا چاہیے۔ کیرکٹر کی بلندی سے انسان کی حقیقی عظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور جو کام طاقت و قوت کے بڑے بڑے مظاہروں سے نہیں ہوسکتا وہ کیرکٹر کی بلندی اور اخلاق کی عظمت سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں جو ہنگامے ہوتے ہیں تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ آخرکار انہیں اساتذہ کی دخل اندازی سے فرو ہوتے ہیں جو طلبا کے حلقہ میں اپنی لیاقت و قابلیت۔ خلوص و محبت اور اعلیٰ اخلاق و صفات کے باعث ہردلعزیز و نیکنام ہوتے ہیں۔

(۴) چوتھی صفت عزم و استقلال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرتبہ ایمانداری اور خلوص و محبت کے ساتھ طلبا کے فائدہ کے پیش نظر جب کوئی فیصلہ کرلیا جائے تو پھر خواہ کچھ ہو جائے اس پر قائم رہنا چاہیے۔ کسی دباؤ سے اپنے فیصلہ کو بدلنا، درانحالیکہ اس کی معقولیت کا پورا یقین ہو۔ کسی ادارہ میں بدنظمی اور انتشار کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کے حاکم اعلیٰ کا برتاؤ طلبا کے ساتھ بالکل ایک بااصول باپ کا سا ہونا چاہیئے۔ بااصول باپ سے اس کی اولاد ڈرتی بھی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ ڈرتی اس لئے ہے کہ وہ بااصول ہے کسی غلط بات سے چشم پوشی اور حق کے معاملہ میں مداہنت اس سے صادر نہیں ہوسکتی اور محبت اس لئے کرتی ہے کہ وہ اُن کا باپ ہے حقیقی معنیٰ میں اُن کا خیر خواہ، مُربّی اور اُن کے بُرے بھلے کا دھیان رکھنے والا ہے۔ کسی بیٹے کو باپ کے خلاف بغاوت کی جرأت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک باپ میں یا تو اصول پرستی کا فقدان نہ ہو یا اس میں پدرانہ شفقت کی کمی نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اولاد خواہ کتنے ہی شدید مظاہرے کرے لیکن باپ بہرحال کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ زہر کی پھنکی کو شکر سمجھ کر کھا جانے کی اجازت دیدے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مفسد اور شریر عناصر ہر ادارہ میں تھوڑے ہی ہوتے ہیں اس بنا پر اگر مذکورہ بالا صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے ادارہ کے ذمہ دار اعلیٰ نے اکثریت کا اعتماد حاصل کر لیا ہے تو گنتی کے چند مفسد عناصر کو کسی سرکشی کی جرأت نہ ہوگی اور ادارہ کا ڈسپلن خراب نہ ہوگا۔

اس موقع پر اگر میں اپنا ایک ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بیان کروں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

فروری سنہ ۴۹ء میں جب میں نے پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کا چارج لیا تو معلوم ہوا کہ اس مدرسہ میں اردو اور بنگلہ کا جھگڑا مدرسہ کی ایک پرانی روایت ہے۔ چنانچہ جب میں پہونچا تو اس زمانہ میں بھی ہائی اسکول کے طلبا ر میں جن کی مجموعی تعداد سات سو کے قریب تھی یہ نوک جھونک چل رہی تھی۔ میں پہونچا تو بنگالی طلبا نے طبعی طور پر مجھکو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھا۔ مجھکو یہ بات محسوس ہوئی تو مجھے اس پر غصہ ذرا نہیں آیا بلکہ میں نے انھیں معذور سمجھا۔ اسی اثنا میں اردو سکشن کے طلبا نے مجھکو اڈریس پیش کرنا چاہا مگر میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ آخر جو مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا وہ ایک دن پھوٹ پڑا۔ مجھکو یہاں آئے ہوئے تقریباً ڈھائی ماہ ہی ہوئے تھے کہ ۲۴ اپریل کو میں شعبہ عربی میں اپنی ایک کلاس لے رہا تھا کہ اچانک ہائی اسکول میں بڑا شور و غل ہوا۔ میں نے فوراً کلاس روم سے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ طلبا بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں۔ میں اوپر کی منزل سے اُتر کر ان طلبا کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اردو سکشن کے بعض طلبا نے مجھکو گھیر لیا اور کہا کہ آپ ہرگز ادھر نہ جائیے ورنہ آپ کے لئے خطرہ ہے مگر میں نے اُن کی ایک نہ سُنی اور انھیں جھٹکا دیکر موقع واردات پر پہونچا۔ یہاں بنگالی اور غیر بنگالی طلبا ر میں باقاعدہ لاٹھی چل رہی تھی۔ اکثر اساتذہ نے اپنے اپنے کلاس روم میں بند ہوکر اندر سے کواڑ بند کر لئے تھے اور صرف ایک ہڈ ماسٹر تھے

جو ابہام و تفہیم کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کارگر نہ ہوئی اتفاق سے اسوقت مدرسہ کے قریب ہی دو سپاہی لاٹھیاں لئے کھڑے تھے۔ میں نے اُن کو اندر بلا لیا اور طلبا سے کہا کہ اگر تم لوگ لڑائی بند نہیں کروگے تو میں لاٹھی چارج کرا دوں گا۔ یہ سُنکر مجمع فوراً منتشر ہو گیا اور طلبا اِدھر اُدھر ہو گئے۔ کلکتہ مدرسہ چونکہ سرکاری اور ایک مشہور تاریخی ادارہ ہے اس لئے شہر میں فوراً اس واقعہ کی شہرت ہو گئی اور پندرہ منٹ کے اندر اندر پولیس کے افسران اعلیٰ موٹر سائیکلوں پر مدرسہ پہونچے اور میرے آفس میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اس اثنا میں یہ انتظام کیا تھا کہ جو طلبا زخمی ہو گئے تھے اُنکو ڈاکٹر کے پاس بھیجا مدرسہ میں چھٹی کا گھنٹہ بجوا دیا۔ اور مدرسہ کے اطراف میں مختلف راستوں پر آدمی متعین کر دیئے تاکہ وہ اس کی نگرانی رکھیں کہ گھر جانے والے طلبا میں سے کوئی کسی پر حملہ نہ کرے اور وہاں آپس میں مار پیٹ نہ ہو۔

اب پولیس کے افسران اعلیٰ نے میرا بیان قلم بند کرنا شروع کیا تو انھوں نے دونوں فریق کے سرغنہ لڑکوں کے نام دریافت کئے اس وقت ہڈ ماسٹر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ یہاں کے پُرانے آدمی ہونے کے باوجود بہت گرم مزاج اور عاقبت نااندیش تھے اس لئے انھوں نے چند لڑکوں کے جو اُن کے نزدیک بہت شریر اور مفسد تھے نام لئے اور مجھ سے کہا کہ آپ ان لڑکوں کے نام لکھا دیجئے اور نہ صرف یہ بلکہ پولیس کو ساتھ لیجا کر ان کے گھروں کی تلاشی کرائیے۔ وہاں لاٹھیاں اور سوڈا واٹر کی بوتلیں ملیں گی۔ لیکن میں نے بڑی سختی سے ہڈ ماسٹر سے کہا کہ آپ خاموش رہیئے۔ یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ اور اِدھر میں نے پولیس کے افسروں کے سامنے کسی لڑکے کا نام لینے سے انکار کر دیا اور اُن سے کہا کہ آپ کے بروقت پہونچ جانے کا جس سے مجکو بڑا سہارا ملا بہت بہت شکریہ! لیکن اب اس معاملہ کو آپ صرف میرے لئے ہی چھوڑ دیجئے میں خود سب ٹھیک کروں گا آپکو دخل دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ چنانچہ چار کی ایک ایک پیالی اور سگرٹ و پان کی تواضع کے بعد یہ مجلس ختم ہو گئی اور میں ان کو رخصت کر کے اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔ یہ ہفتہ کا دن تھا۔ اگلے دن اتوار تھا اور مدرسہ کی چھٹی تھی مجکو گھر پر اطلاعات ملتی رہیں کہ اس واقعہ کی وجہ سے طلبا میں بڑا سخت ہیجان ہے۔ ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ اُس دن بے خبری میں پٹ گیا۔ اس لئے پیر کے دن مدرسہ کھلتے ہی وہ فریق ثانی سے بدلہ لیگا۔ یہاں تک کہ اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں گیارہ بجے کے قریب پولیس کا ایک افسر میرے مکان پر آیا اور مجکو سوتے سے جگا کر کہا کہ کل کے واقعہ کی وجہ سے نہ صرف مدرسہ کے طلبا میں سخت کشمکش اور ہیجان ہے بلکہ ہم کو اطلاعات پہونچی ہیں کہ دوسرے کالجوں کے طلبا میں بھی اس کی وجہ سے ہیجان ہے۔ اور اُردو بھی بنگلہ بولنے والے طلبا کے ہر جگہ الگ الگ جلسے ہوتے رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ کل صبح کو مدرسہ

کھلے گا تو بڑے پیمانہ پر فساد ہو جائیگا اور خطرہ اس کا بھی ہے کہ یہ فساد کہیں فرقہ وارانہ شکل اختیار نہ کرلے اس بنا پر میری رائے ہو کہ آپ مدرسہ چار دن کے لئے بند کر دیجئے۔ میں گھر پر یکہ و تنہا تھا کسی سے مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ تاہم خدا پر بھروسہ کر کے میں نے پولس افسر سے فوراً کہا کہ مدرسہ کل ضرور کھلے گا۔ ایک دن کے لئے بھی بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ اچھا اگر آپ یہ نہیں مانتے تو کم از کم ہم کو اجازت دیجئے کہ جب مدرسہ کھلے تو ہم پولیس کے آدمی مدرسہ کے دروازوں پر متعین کر دیں تاکہ گڑبڑ ہو تو اُس پر قابو حاصل کیا جا سکے لیکن میں نے اس کی بھی اجازت نہیں دی البتہ میں نے یہ کہا کہ آپ پولیس کی ایک گاڑی مدرسہ سے ذرا فاصلہ پر بازار کی جانب لاکر کھڑی کر دیں تاکہ اگر خدا نخواستہ صورتِ حال میرے قابو سے باہر ہو تو میں آپکی امداد طلب کرسکوں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔

دوسرے دن مدرسہ کھلتے ہی میں نے اپنی تقریر کا اعلان کرا دیا۔ کچھ طلبا تقریر سننے کے لئے آرہے تھے ٹولیاں بنائے ہوئے اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ جو کچھ تمہیں کرنا ہو وہ بعد میں بھی کر سکتے ہو مگر پہلے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ سُن لو۔ یہ سُنکر طلبا اور اساتذہ جمع ہو گئے اور میں نے تقریباً پون گھنٹہ تقریر کی جس میں میں نے انکو بتایا کہ ملک کی آزادی کن مشکلات اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس کو قائم رکھنے اور ملک کو ترقی دینے کے لئے طلبا کے کیا فرائض ہیں اور ان میں مذہب اور زبان کے اختلافات کے باوجود کس قدر باہمی اتحاد و یک جہتی ہونی چاہیئے اور اس کے بعد میں نے کہا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جو باتیں میں نے کہی ہیں اگر تم اُن کو سچ مانتے ہو تو میں تم سے ایک بات کہتا ہوں اُسے بھی مان لو۔ تقریر کے لب و لہجہ میں چونکہ بجائے غصّہ کے ہمدردی اور جھنجلاہٹ کے بجائے سوز و گداز تھا اس لئے "از دل خیزد و بر دل ریزد" کے مطابق اس کا خاطر خواہ اثر ہوا لیکن ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا کہ "جب تک ہمارے مطالبات منظور اور ہماری شکایتیں دور نہیں ہونگی ہم کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ یہ سُنکر میں نے فوراً لب و لہجہ بدل کر اور غصّہ کے ساتھ کہا کہ اچھا اگر تم چھوٹے بھائی کی حیثیت سے میرا مشورہ قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو تو اب یہ معاملہ ختم سمجھو اور پھر جو کچھ ہوگا وہ رسمی طور پر ہوگا۔ میری زبان سے یہ سنتے ہی تمام طلبا نے بآوازِ بلند کہا کہ آپ ہم سے جو کہیں گے ہم وہی کریں گے۔ اور اس ایک طالب علم کو سب بُرا بھلا کہنے لگے۔ اب میں نے کہا کہ اُردو سکشن کا ہر طالب علم بنگلہ سکشن کے ہر طالب علم سے گلے ملے اور معانقہ کرے۔ یہ سُننا تھا کہ یک بیک "پرنسپل زندہ باد"

"کلکتہ مدرسہ زندہ باد" کے پُرشور نعرے بلند ہوئے اور جو طلبا رد و دن پہلے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے تھے وہ اب اسی وقت ایک دوسرے کو گود میں اٹھائے پھر رہے تھے۔ فوراً یہ خبر اطراف واکناف میں پھیل گئی اور میرے پاس مبارکباد کے پیغام آنے لگے۔ شام کو بنگالی طلبا، ایک ہجوم کی شکل میں میرے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے میرے مکان پر پھول اور ہار لیکر آئے اور مجھ سے معافی مانگی کہ ہم آپکی نسبت بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم کو اس پر سخت ندامت اور پشیمانی ہے۔ اب ہم کو یقین ہے کہ آپ بیشک ہم سے اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔ دوسرے دن کلکتہ کے انگریزی بنگلہ اور اُردو کے اخبارات میں اس خبر کو جلی عنوان سے شائع کیا گیا۔ انگریزی کے مشہور اخبار امرت بازار پتر یکا نے " نئے پرنسپل کا پہلا کارنامہ " کے عنوان سے ایک ادارتی نوٹ بھی لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بنگلہ اور اُردو کے اخبارات نے بھی نوٹ لکھے۔ کل کیا ہوگا اس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ پھر کبھی اُردو بنگلہ کا جھگڑا نہیں ہوا سب طلبا اتفاق و اتحاد سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ چونکہ اس واقعہ کا تعلق خاص میری ذات سے ہے اس لئے میں اس کو بیان کرنا ہرگز گوارا نہ کرتا اگر یہ یہاں کے تمام اخبارات میں شائع نہ ہوا ہوتا اور کلکتہ کے ہر شخص کو جو کسی نہ کسی تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھتا ہو معلوم نہ ہوتا۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے پہلے جن طریقوں کو مفید یا ضروری خیال کیا جاتا تھا اب حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُن طریقوں کی افادیت بھی جاتی رہی ہے اور اب اگر ڈسپلن قائم رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ ارباب اختیار و اقتدار خود اپنے آپ میں ڈسپلن پیدا کریں۔ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدہ داروں کو اپنی شخصیت بنانے یا اُن کے ذریعہ کسی مادی منفعت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ خلوص قلب کے ساتھ نوجوان نسلوں کی خدمت اور اُن کی فلاح و بہبود اصل مقصد و مدعا ہونا چاہیئے۔ طلبا کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ نہ کریں بلکہ بیدار مغز اور فرض شناس باپ کا سا معاملہ کریں۔ یونیورسٹی کی فضا کو پالیٹکس اور سیاسیات سے پاک و صاف رکھیں، طلبا میں علمی اور تعلیمی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کے ساتھ کوئی شخص اس وقت تک انصاف نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے وہ خود اپنے ساتھ انصاف نہ کرے طلبا کی طرف سے شک و شبہ میں مبتلا ہونے کے باعث ان کو دبائے رکھنے اور نئے نئے آئین و ضوابط ایجاد کر کے

ان کو دبائے رکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے ہونا یہ چاہیئے کہ تقریروں، لکچروں اور ان کے ساتھ بے تکلف گفتگو کے ذریعہ ان میں ذہنی بیداری اور شعور نفس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنا اچھا بُرا خود سوچیں اور سمجھیں اور جو چیز اُن کے لیے مضر ہے وہ خود اس سے بچیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کم از کم طلبا کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گی وہ آپ پر پورا اعتماد کرے گی اور اس کی وجہ سے چند فتنہ پرور عناصر کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملیگا اور اگر ایسا ہوا بھی تو ان شریر عناصر کو دبانے کے لئے آپ جو اقدام کریں گے طلبا کی اکثریت اس میں آپ کی معاون ہوگی جس طرح بدی متعدی ہے اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر نیکی اور خلوص بھی متعدی ہے۔ اس لئے اگر آپ نیک اور مخلص ہیں تو لازمی بات ہے کہ آپ کے ساتھی بھی نیک اور مخلص ہونگے۔ ڈاکٹر سر شاہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ چونکہ انتہائی قابل ہونے کے ساتھ حد درجہ نیک، مخلص اور دیانت دار بھی تھے اس لئے ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی وائس چانسلری کی قلیل مدت میں ہی یونیورسٹی کا آب و رنگ جس طرح بدل دیا تھا اور ہر لحاظ سے اس میں جو خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ دوسرے بڑے بڑے وائس چانسلروں سے برسوں میں بھی پورا نہ ہو سکا۔ یہی حال ہندو یونیورسٹی بنارس کا شری مدن موہن مالویہ کے عہد سعادت میں ہوا تھا۔

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت ماہ نومبر

بہرحال کلمہ "کن" جو داغ کے نزدیک "آئینہ طلبی" کے مرادف ہے۔ اسی آئینہ میں جن جلووں کو ہم دیکھ رہے ہیں، ساری کائنات ہی اسی کلمہ "کن" کے مظاہرہ ہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس لحاظ سے عالم کا ذرہ ذرہ، تنکا تنکا بتہ پتہ خدائی کمالات کی نمائش گاہ ہے لیکن بایں ہمہ یہی دیکھا بھی جارہا ہے کہ قامت میں خواہ جتنا بھی کہتر اور چھوٹا نظر آتا ہو۔ لیکن "قیمت" میں آدمی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا، انواع و اصناف کی خصوصیتوں کی بحث و تحقیق کرنے والے بھی اسی نتیجہ تک پہونچ رہے ہیں کہ ارتقائی کمالات کا آخری نقطۂ عروج ساری کائنات میں انسان، اور انسانیت ہی ہے اور یوں بھی ہر دیکھنے والی آنکھیں تسخیری و اقتداری آثار کے ان نظاروں کو کیسے جھٹلا سکتی ہیں کہ عناصر پر، جمادات پر، نباتات پر، حیوانات پر، اور کیا کیا بتایا جائے کہ کن کن چیزوں پر انسان چھایا ہوا ہے اور چھاتا چلا جارہا ہے، مشاہدہ سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے، اور تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے یہی سنایا بھی جارہا ہے۔ توراۃ ہی کے پہلے باب میں ہے کہ۔

> پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر، اپنی شبیہہ کے مانند بنائیں، اور وہ سمندر کی مچھلیوں، اور آسمان کے پرندوں، اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں، اختیار رکھیں"
>
> (کتاب پیدائش باب ۱ ۲۶)

خود ہمارا وطن ہندوستان، جو مذہبی اقلیموں میں دنیا کا شاید سب سے زیادہ پرانا اقلیم اور خطہ سمجھا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی بلندی و برتری کے اس پہلو سے وہ بھی نامانوس نہ تھا، مہابھارت تک جیسی عام متداول

کتابوں میں ایسے فقرے ہمیں مل جاتے ہیں، مثلاً شانتی پرب کا وہ حصہ جسے "موکش دھرم برتن" کہتے ہیں، اسی کے ساتویں ادھیائے میں ہے کہ

نش (آدمی) دیو کی مورت ہے۔

مہابھارت کے مترجم نے اس کے نیچے لکھا ہے۔

"آدمی پرمیشر (خدا) کی صورت ہے۔"

بھی اس فقرے کا مطلب ہے، اس شانتی پرب کے اسی حصہ کے سیٹھویں ادھیائے میں یہ بھی ہے کہ

"یہ نش دیہ (قالب انسانی) بڑا اتم (شریف) ہے۔"

آگے لکھا ہے کہ

اسی دیہہ (قالب انسانی) سے آتما (روح) کی رکھشا (حفاظت)
سے شبھ کرموں (اعمال حسنہ) کو حاصل کرنا ممکن ہے۔"

اور وید کا حوالہ دیتے ہوئے اسی موقعہ پر بیان کیا ہے کہ "اسی دیہہ (قالب) سے وید کے موجب نش انیک (طرح طرح) کے دھرم کرم کر سکتا ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ سمیٹک (سامی) نسلوں کی بھی اور آریائی خاندانوں کی یہ جانی پہچانی حقیقت بھی، قرآن میں جسے زیادہ صاف اور واضح کھلے کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے،

"ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین قالب پر پیدا کیا۔"

یعنی لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا جو حاصل ہے

"ہم نے اس کو (آدم) کو اپنے دونوں ہاتھوں سے گڑھا ہے۔"

جو قرآنی الفاظ خلقت بیدیّ کا ترجمہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی"

"نفخت فیہ من روحی" کے یہی معنی ہیں، اور گو قرآن میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے لیکن ہمارے یہاں بھی خلق اللہ آدم علیٰ صورتہ (بخاری ومسلم جمع الفوائد) پیدا کیا آدم کو اللہ نے اپنی صورت پر،

کی حدیث مشہور ہوئی۔

سچ پوچھئے تو یہ اوران ہی جیسے دوسرے تفصیلات کو قرآن نے صرف ایک لفظ

"خلیفہ"

میں کچھ اس طریقہ سے بند کردیا ہے کہ شکوک وشبہات جو اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں ان کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے اور جو مقصود ہے اس کی صحیح ترجمانی کے لئے اس سے زیادہ بہتر، زیادہ موزوں لفظ شاید سوچا بھی نہیں جاسکتا حاصل جس کا یہی ہے کہ انسان خدا تو نہیں ہے، اور جو مخلوق بن کر پیدا ہوا ہو، ظاہر ہے کہ وہی خدا یعنی ایسا وجود کیسے بن سکتا ہے جسے کسی نے پیدا نہ کیا ہو، لیکن باوجود مخلوق ہونے کے خلیفہ کے لفظ سے یہی بتانا مقصود ہے کہ خدا کے خدائی کی نمائندگی اپنے ان صفات وکمالات کی راہوں سے آدمی کا وجود کررہا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو بخشے گئے ہیں، خدا کو آدمی نے اپنی صورت پر بنایا ہے اس کا یہی مطلب[1] ہے۔

اب اس کے بعد مثلاً آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی لاغر اور مریل، نحیف ونزار، مدقوق ومسلول آدمی کو دنگل میں نیچا دکھا کر اپنی پہلوانی کے کمال کو کوئی پہلوان نمائش کررہا ہو، پہلوانی کے کمال کی نمائش کی صحیح شکل یہ ہوسکتی ہے۔ یا اپنے جوڑ کے پہلوان کو اپنے قدموں پر جھکا کر جو دکھا رہا ہے، پہلوانی کے کمال کا واقعی اور قدرتی آئینہ یہ نظارہ ہی ہے۔

جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

گلیوں اور کوچوں میں ٹھوکریں کھانے والے گداگروں کی فروتنی بھی کوئی فروتنی ہوئی؟ سعدی نے لکھا ہے اور ٹھیک لکھا ہے

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ "صورت" کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے چہرے کے ان امتیازی خصوصیات ہی کی طرف ذہن آدمی کا منتقل ہوتا ہے جن کا تعلق قوت باصرہ یعنی بینائی سے ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو چیزیں سونگھی جاتی ہیں، چکھی جاتی ہیں، سنی جاتی ہیں، چھوئی جاتی ہیں، سب ہی اپنے اندر ایسی امتیازی خصوصیتیں رکھتی ہیں ان ہی راہ سے مثلاً حنہ کے عطر کو گلاب کے عطر سے یا مرغ کی آواز کو بیل کی آواز سے مٹھائیوں کے مزوں کو نمکین چیزوں کے مزوں سے ہم جدا کرتے ہیں اور یہی امتیازی خصوصیات ان چیزوں کی صورتیں ہیں، آدم کو خدا نے اپنی ہی صورت پر پیدا کیا ہے اسی وجہ سے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ آدمی کو خدا نے اپنے صفات وکمالات کا مظہر بنایا ہے یا یوں کہئے کہ خدائی صفات کی نمائندگی انسانی وجود کرتا ہے خلیفہ کا لفظی ترجمہ "نمائندہ" ہے یہی میرا مطلب ہے کہ "خلیفہ" کا لفظ سارے شکوک وشبہات کی تاریکیوں کو مٹا دیتا ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست

جھکی ہوئی گردنوں کو آپ جھکائیں گے کیا، وہ تو خود ہی جھکی ہوئی ہیں، کھنچی ہوئی گردنوں کا جھکا دینا کمال ہو سکتا ہے تو ہی ہو سکتا ہے۔

"کمال نمائی" کے اسی معیار کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور سوچئے کہ ساری کائنات پر تسخیری اقتدار رکھتے ہوئے گویا عالم کو اپنے قدموں پر جھکائے ہوئے، خلافتی اور خدا نمائی کے ان سارے خصوصیات کے ساتھ جن سے انسانی وجود سرفراز کیا گیا ہے ان سب کو لے کر جو اپنے آپ کو اپنے خالق اور پیدا کرنے والے خدا کے لئے بنا رہا ہے، جو کچھ بھی اس کو ملا ہے سب ہی کو لے کر خدا کے قدموں پر یہ کہتے ہوئے جو گر جاتا ہے کہ میرا کچھ نہیں ہے، سب آپ کا ہے، اپنے عجز و مسکنت اپنی عبدیت و بندگی کو اس طریقہ سے پیش کر کر کے جو ثابت کر رہا ہے کہ خدا ہی کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ عبدیت و بندگی کا یہ قالب خدا کی خدائی اور اس کے جلال و جبروت کے آئینہ بننے کا قرار واقعی طور پر مستحق ہو سکتا ہے، یا بجائے اس کے آدمی کو فرشتہ اور ملک بنانے کے لئے چن چن کر ان خصوصیتوں سے محروم کیا جائے جو اس کے عہدۂ خلافت کے لازمی اقتضارات میں، کائنات میں جو کچھ ہے اس کے متعلق پھیلایا جائے کہ ان کو اپنے زیر اقتدار لانے، اور اپنی تسخیری قوتوں کی آماجگاہ بنانے کی جگہ چاہیئے کہ جس حد تک ان چیزوں سے آدمی بھاگ سکتا ہو، بھاگے، اور اسی بنیاد پر پانی بھی اس کے منہ سے چھینا جائے، کھانا بھی چھینا جائے، کپڑے بھی اتار لئے جائیں، حتیٰ کہ ناک بند کر کے حکم دیا جائے کہ سانس لینے میں بھی جہاں تک ممکن ہو، ہوا سے پرہیز ہی کرنے کی کوشش کرے، اور یوں فرشتہ نہ سہی آدمی کو فرشتہ نما بنا کر "روحانیت" اور "رہبانیت" کے مسلک میں جو یہ سمجھا یا جاتا ہے کہ یہی فرشتہ نما آدمی، خدا کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟

وہی عامیانہ مثال کہ ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی؟ اب اس کے بعد باقی ہی کیا رہا جسے خدا کے سامنے لیکر وہ آیا ہے، اللہ اللہ سب سے اونچا، سب سے بلند، سب کا آقا یعنی خدا کا خلیفہ بن کر خدا کے سامنے جو جھک جاتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ تنہا وہی نہیں جھکا وہ سب جو اس کے زیر اقتدار و اختیار ہیں، وہ بھی جھک جاتے ہیں، زمین بھی جھکتی ہے آسمان بھی جھکتا ہے، شجر بھی، حجر بھی، بحر بھی بر بھی، جمادات بھی نباتات بھی، عناصر بھی مرکبات بھی، سفلیات بھی علویات بھی، سب ہی جھک جاتے ہیں۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ الانسان کے خلافتی پہلو کے راز کا افشا کرتے ہوئے قرآن میں جو اس کا تذکرہ کیا گیا ہے

کہ ملائکہ یعنی فرشتوں کو خدا نے اس خلیفہ انسان کے آگے جھکنے کا حکم دیا اور اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ　　سب کے سب جتنے فرشتے تھے انھوں نے آدم کے آگے وہ سربسجود ہوگئے

کی اطلاع جو دی گئی ہے، جہاں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عالم محسوس کے مختلف طبقات و انواع کے نظم و ضبط کا تعلق غیب کی جن زندہ ہستیوں سے ہے ان ہی ملائکہ کو جھکا کر یہ بتایا جا رہا تھا کہ سارے عالم پر اقتدار قائم کرنے کی اور ان کو مسخر کرکے اپنے قابو میں لانے کی صلاحیت انسان میں رکھی گئی ہے، کچھ تعجب نہیں کہ اسی کے ساتھ "الانسان" کو ملک یا فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے پیش کرنے کا جو مغالطہ آئندہ پیدا ہونے والا تھا، اس مغالطہ کا ازالہ شروع ہی میں کر دیا گیا تھا، اسلامی حقائق کے عصری ترجمان کا مشہور زبان زد شعر

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

میں اسی حقیقت کی طرف شاعرانہ رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے بھی جب بنی اسرائیل نے یہ خواہش کی کہ دوسری قوموں نے مخلوقات "کو جیسے اپنا معبود بنا رکھا ہے، ہمارے لئے بھی کچھ اسی قسم کے "آلہ" یا "معبودوں" کو نامزد کر دیجئے، تو جھنجھلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسوم پرست تقلیدی امت کو سمجھایا تھا، قرآن میں ان کا یہ تاریخی فقرہ اب تک محفوظ ہے، ارشاد ہوا تھا۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ　　موسیٰ نے کہا کیا اللہ (یعنی خالق کائنات) کے سوا تمہارے لئے میں کوئی دوسرا پرورش کرنے والا پروردگار ڈھونڈوں، حالانکہ اس نے ہمارے عالمین (مخلوقات) پر تمہیں برتری عطا فرمائی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ فرشتہ ہی بنا کر آدمی کو خدا کے سامنے جھکانا مقصود تھا تو بقول ان ہی فرشتوں کے ایک نئی مخلوق (الانسان) کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ آپ کی تسبیح و تقدیس کے لئے کیا ہم کافی نہیں ہیں؟ اور ملائکہ ہی کیا صرف "جھکنے" اور "بندگی" و عبدیت کے لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو جیسا کہ قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　　آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہیں نہ ساری چیزیں
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ	جو آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہے سورج بھی چاند بھی
وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ (الحج)	تارے بھی، پہاڑ بھی، درخت بھی، رینگنے والے سارے جانور بھی۔

پھر سارے خلافتی کمالات وخصوصیات سے پر تبیغ کر کے غریب آدمی کو لنڈ منڈ فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے ہم لائے ہی تو کیا بڑا سوغات اور کون سا بڑا نادر الوجود تحفہ لائے؟ اس کے تماشوں سے تو سارا عالم ہی بھرا ہوا تھا۔

ہاں! "سب کچھ" رکھتے ہوئے "کچھ نہیں" بن کر خدا کے سامنے کھڑا ہو جانا، سب سے اونچے ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کے آگے سب سے نیچا بنا کر پیش کرنا، خدا کی خدائی، اور اس کے جاہ وجلال، اس کی لاہوتی شوکت وسطوت کی تجلی و نمائش کا یہی واحد "آئینہ" ہے جو صرف آدمی کو دیا گیا ہے۔ اسی "آئینہ" کو لے کر خدا کے سامنے جب وہ حاضر ہوتا ہے، تو اس میں جیسا کہ چاہیے، خدا کی تجلیاں تڑپ اٹھتی ہیں۔ آخر جس کے جھکنے کے ساتھ ہی ساری کائنات ہی جھک جاتی ہو، اس تماشے کو آپ ہی بتائیے خدا کے اس خلیفہ انسان کے سوا اور پیش ہی کون کر سکتا ہے[1]

میں جو یہ وعدہ کرتا چلا آرہا تھا کہ آدمی کو خدا نے صرف اپنے لئے پیدا کیا ہے، اس کا مطلب آئندہ بیان کروں گا، میں خیال کرتا ہوں وہ مطلب انشاء اللہ ادا ہو گیا۔ اور وعدہ بھی پورا ہو گیا، مقصد یہی ہے کہ جھکنے کے لئے تو آدمی بھی اسی طرح پیدا کیا گیا ہے، جیسے سب پیدا ہونے والی مخلوقات اپنے خالق کے آگے جھکی ہوئی ہیں۔

---

[1] سب کچھ رکھتے ہوئے "میرا کچھ نہیں ہے" اس کا اعتراف واقعہ کا اعتراف ہے، لیکن خدا جس میں جو کچھ ہے سب اپنا ہے کسی غیر سے اس کو کچھ نہیں ملا بلکہ غیروں کو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سب کچھ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے اور کچھ نہ بنالینے کے فیصلہ کی گنجائش خدا میں بھی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ کہنے والوں نے اگر کہا ہے کہ خدا کے خدائی کی تجلی و نمائش کا جو آئینہ آدمی کے پاس ہے خدا کے پاس بھی یہ آئینہ نہیں ہے غالباً اس کا مطلب یہی ہے یہ تو بے چارا آدمی ہے کہ خلیفہ بن کر پیدا ہوا اور بندہ بن کر رہتا ہے سب کچھ رکھتے ہوئے تھوڑے تھوڑے تو سے خدا کے قدموں پر یہ کہتے ہوئے گرتا ہے کہ ہمارا کچھ نہیں ہے سب آپ کا ہے ۔

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ　　کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ڈاکٹر اقبال کے شعر کا بھی مطلب ہے۔

لیکن ایسا جھکنے والا جس کے آگے سب جھکائے گئے ہیں، یہی وہ الانسان خلیفہ ہے، اپنے آپ کو چھوٹا اور نیچا بنا کر آدمی بھی خالق کے آگے پیش ہوتا ہے، لیکن اس کی یہ خصوصیت ہے کہ مخلوقات میں سب سے بڑا بننے کے بعد یہ چھوٹا بنتا ہے، سب سے اونچا ہونے کے بعد اپنے آپ کو نیچا بنا کر اپنے مالک کے قدموں پر گرتا ہے، اس کو اختیار دیا گیا ہے، اور کیسا اختیار؟ کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ سب کچھ بخشا ہے، چاہے تو اس کی مرضی پر چلے بھی، اور نہ چاہے تو اس کی مرضی کر وہ ٹکرا بھی سکتا ہے؟ حد ہے اس کے اقتداری دائرے کی اس وسعت اور خود مختارانہ مطلق العنانی کی؟ ان میں کتنے ہیں جن کی ساری زندگی اپنے خالق کی مرضیات سے ٹکرانے اور مالک کے احکام کے ٹھکرانے ہی میں گذرتی ہے۔

خلیفہ بن کر جینے میں اور بندہ بن کر مرنے کا ان سے جو مطالبہ ان کے خالق نے کیا ہے، اس مطالبہ کو ٹھکرا دیتے ہیں یہی نماردہ، فراعنہ، جبابرہ، دجاجلہ کا طبقہ اور ان کی ذریت ان کے چیلے چانٹے ہیں، ان کی ساری زندگی اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گذرتی ہے، یہ بنی آدم کے وہ چوہے ہیں جو پنساری کی دوکان کے سامانوں کو دیکھ دیکھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہتا ہے، ان ہی کے سامنے زندگی ہی ایک ایسے دور کو لے آئی ہے جس میں وہ پاتے ہیں کہ ان کے خالق کا ہر ارادہ اور اس کا ہر قانون ان کی ہر خواہش اور ارادہ سے ٹکرا رہا ہے ٹکرانے والوں کی زندگی کا یہی تجربہ، مذہبی زبانوں میں جہنم، دوزخ، نرکھ وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ لیکن سب کچھ رکھتے ہوئے جو واقعہ اس کے اعتراف کو اپنی زندگی کا اٹل اور غیر متزلزل فیصلہ بنا کر جیتے ہیں کہ "درحقیقت ہمارا کچھ نہیں ہے" اسی بنیاد پر اپنے اختیار و اقتدار کو ان ہی حدود تک محدود رکھنے میں پختہ عزم سے کام لیتے ہیں، جن پر اختیار و اقتدار کا بخشنے والا ان کو رکا اور ٹھہرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی خدا سے ٹکرانے اور اس کے احکام و فرامین کے ٹھکرانے کی جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے مطابق جئیں بھی، اور اسی حال میں مریں بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی وجود کے قدرتی نصب العین یعنی

خدا نے آدمی کو اپنے لئے بنایا ہے۔

اسی نصب العین کی تکمیل کر کے مرتے ہیں، نبوات و رسالات کی بنائی ہوئی راہوں پر وہ چل رہے ہیں۔ حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کی یہ امتیں ہیں، ظاہر ہے کہ توافق کی یہ زندگی، ان کے سامنے اسی حال کو اگر لائی ہے کہ خدا اور اس کے سارے قوانین ان کی ہر خواہش اور ارادے کے مطابق ہے جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا ہی ان کے لئے کرتا رہتا ہے تو سوچنا چاہئے کہ اس کے سوا اور ہوتا کیا۔

بہر حال سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں بن کر کھڑا ہو جانا، جہاں رکنے کے لئے کہا جائے رک جانا اور ٹھہرنے کا حکم دیا جائے ٹھہر جانا، اپنی بندگی و عبدیت، مسکنت و ذلت، فقر و احتیاج عجز و نیاز کے اس آئینہ کو لے کر جو اپنے خدا کے سامنے لے کر پڑھتا ہے، جو اس کا واحد ذاتی سرمایہ ہے، ایسا ذاتی سرمایہ، عرض ہی کر چکا ہوں کہ خدا کے پاس بھی جو نہیں ہے تو خدا بھی اپنے ذاتی سرمایہ یعنی قوت و قدرت کے ساتھ اس کی طرف اگر متوجہ ہو تو اس کے سوا آخر دوسرا احتمال ہی کیا ہے؟ آخر لے دے کر حاصل یہی تو ہوا کہ بندہ خدا کے آگے اپنی عاجزی میں عاجزی کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور خدا بندے میں اپنی قوت و قدرت کو بھرتا چلا جاتا ہے بقول مولینا روم ع چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت۔

من لہ المولی فلہ الکل۔

عملی زندگی کے اسلامی نظام کے متعلق میں نے جو یہ عرض کیا تھا کہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجود اور ہستی کا سارا نظام ہی ایک ایسے کامل اور مکمل دائرے کی شکل میں ہمارے سامنے گھوم رہا ہے جس کے مختلف حصوں میں "مادیت" و "روحانیت" اپنے اپنے طبعی مقام پر نظر آتی ہیں کہ فٹ ہو گئی ہیں آخر اب تک جو کچھ عرض کر چکا ہوں، آپ نے غور سے اس کو اگر پڑھا اور سمجھ لیا ہے، تو انسانی زندگی کے اسلامی نظام، اور اس کے نتائج کا حاصل مختصر لفظوں میں یہی تو ہوا کہ۔

یہاں جو کچھ ہے سب کو خدا نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے، اور انسان چونکہ براہ راست خالق کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ انفرادی یا اجتماعی جس رنگ میں بھی انسانیت پائی جائے اس کے تکریمی و احترامی حقوق کو ادا کرتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے لئے بناتا چلا جائے تب وہ پائے گا کہ خدا بھی اس کے لئے بنا ہوا ہے اسی سے ہم آہنگی اور توافق کا طبعی دائرہ بن جاتا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اپنے آپ کو انسان اگر نہ بنائے، بلکہ تصادم و تخالف اور ٹکراؤ ہی کے مشغلوں میں زندگی گذار کرے گا تو خدا، خدا کے ارادے، خدا کے قوانین، کو بھی پائے گا کہ اس کے ہر ارادہ، اور اس کی ہر خواہش سے ٹکرا رہے ہیں اسی سے تصادم و تخالف کا غیر طبعی دائرہ بنتا ہے، گویا ایک ہی قوسی ساق سے طبعی اور غیر طبعی دو کامل دائرے بن جاتے ہیں۔[۱]

---

[۱] جس کی تصویر کوئی کھینچنا چاہے تو اشارے کے لئے ایک ہی قوسی ساق ا-ب سے تعمیر ہونے والے دو دائروں کا خاکہ اس (باقی آئندہ صفحہ)

ان دونوں دائروں میں تخالف و تصادم سے پیدا ہونے والا دائرہ اس لئے غیر طبعی ہے کہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو جس فطرت و نہاد پر پیدا کیا ہے اسی فطرت کے قدرتی اور جبلی اقتضاؤں سے بغاوت و سرکشی پر اس کی بنیاد قائم ہے، اس کے مقابلہ میں ہم آہنگی اور توافق کا دائرہ جس کا نام میں نے "دائرۃ الایمان" یا "دھرم چکر" رکھ دیا ہے، چونکہ انسانی فطرت کے جبلی اقتضاؤں کے محور پر وہ گھومتا ہے اس لئے ایمانی دائرہ فطری اور طبعی دائرہ ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ایمانی دائرہ کا ایک حصہ تو بجنسہ وہی ہے جو مادیت کے مسلک میں مانا اور کیا جاتا ہے میں بھی کہہ چکا ہوں اور اس سے کون ناواقف ہے کہ عملی زندگی کے اسلامی نظام میں کائناتی پیداواروں سے استفادے کو آدمی کا پیدائشی اور قدرتی حق قرار دیتے ہوئے طبائع اور ظروف کی پستی و بلندی، تنگی و فراخی کے لحاظ سے مادی زندگی کے زیر اثر انسانیت کے لئے جو کچھ کیا جاتا ہے یعنی شخصی زندگی سے شروع کر کے خاندانی، قومی، عام بنی نوع انسان کی ذمہ داریاں

غیر طبعی دائرہ
طبعی دائرہ
انسان خدا کے لئے
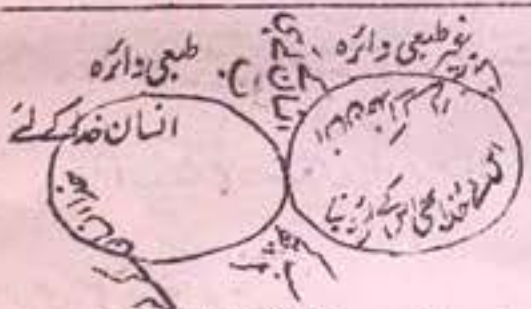
بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۵) طرح سے بنا لے سکتا ہے یعنی الف ب اسی بنیاد کی قوسی ساق فرض کیجئے اور اسی بنیاد کو بنا کر دو متوازی دائرے اس طریقہ سے بنا لیجئے۔

یوں اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اب تک وجود کے یہ دونوں دائرے کس طرح گھومتے رہتے ہیں۔ ان دونوں دائروں میں توافق کا دائرہ تو طبعی دائرہ ہے کہ ہستی کا یہ نظام اسی مقصد کے لئے قائم ہوا ہے لیکن خلافتی اقتدار و اختیار کی قوتوں کے غلط استعمال سے تخالف و تضاد سے غیر طبعی دائرہ بھی بن جاتا ہے، فساد اور خوں ریزی کا جو الزام فرشتوں نے آدم کو خلیفہ بنانے کے موقعہ پر لگایا تھا، بظاہر اس کا اشارہ خلافت کے اقتدار و اختیار کے اسی غلط استعمال کی طرف تھا، جس کا جواب دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ خدا سے علم و آگہی حاصل کرنے کی فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے، اس علم و آگہی کے مطابق زندگی گذارنے کی جو کوشش کرے گا وہ استعمال کی اس غلطی سے محفوظ ہو جائے گا، غلطی کرے گا بھی تو پھر اپنے آپ کو درست بھی کرے گا حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام تو براہ راست اس علم و آگہی کو خدا سے حاصل کرتے ہیں اور ان پر ایمان لانے والوں تک یہی علم آلہی یعنی خدا کے مرضیات کا علم جسے دین و مذہب کہتے ہیں پہونچتا ہے، انجانی باتوں کو نہ جاننے کی قابلیت و استعداد آدمی ہی کی فطرت میں ہے شاید اس کی اسی فطری خصوصیت کو یہاں بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ سورہ اقرء میں انسانی فطرت کی اس خصوصیت کی طرف علم الانسان مالم یعلم کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے میری دوسری کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ توافق و تخالف کے ان ہی دونوں دائروں کو جس کے لئے اتنی غیر معمولی طول بیانی سے مجھے کام لینا پڑا ہوا نادم سے (باقی آئندہ صفحہ پر)

مادیت میں جو بیدار ہوتی ہیں اسلامی نظامِ زندگی میں سب ہی شریک اور داخل ہیں، ہم ان میں سے ہر ہر ذمہ داری پر مستقل ابواب میں انشاء اللہ تعالیٰ اگر اجل مسمی نے فرصت دی تفصیلی بحث کریں گے اور ہر ہر باب کے قوانین و دفعات جو اسلامی فقہ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، اللہ نے چاہا تو آپ کے آگے رکھے جائیں گے۔

بہرحال یہاں تک تو "دائرۃ الایمان" میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو "مسلک مادیت" میں سوچا اور کہا جاتا ہے لیکن توافق کا یہ ایمانی دائرہ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ خود انسان کو خدا کے لئے قرار دیتے ہوئے "روحانیت" کو بھی اسی دائرے میں سمو دیا گیا اور اس کے قوامِ حقیقت میں داخل کر دیا گیا ہے، بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلامیت کا بنیادی پتھر اسی واقعہ کو یعنی آدمی خدا کے لئے پیدا ہوا ہے، اسی کو ٹھہرایا گیا ہے، بار بار دہرا چکا ہوں کہ نبوات و رسالات کی تاریخ کی پیشانیوں کا سب سے پہلا امتیازی طغرا

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ　　　لوگو اللہ ہی کو پوجو تمہارا الٰہ (معبود) اس کے سوا کوئی نہیں ہے

ہی کو قرآن میں بتایا گیا ہے، اسلامی زندگی کا سارا فلسفہ اسی پر مبنی ہے۔ اس وقت بھی جن چیزوں سے آدمی مستفید ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی اس کے سامنے پیش آئے گا، تفصیل بتا چکا ہوں کہ ان ساری باتوں کا دار و مدار اسی پر ہے کہ خالقِ کائنات کو اپنا الٰہ اور معبود آدمی بناتا ہے یا نہیں، یہی ایمانی دائرہ کی روح ہے، یہ ہے تو سب کچھ ہے اور یہ نہیں ہے، تو کچھ نہیں ہے۔ "دائرۃ الایمان" میں "روحانیت" کے اس عنصر کو جس طریقہ سے شریک کیا گیا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کے تحت جو قدم بھی آدمی کا اٹھتا ہے خدا ہی کے لئے اٹھتا ہے، اس سلسلہ میں انفرادی اور اجتماعی کسی حیثیت سے جو کچھ انسانیت کے لئے کیا جاتا ہے، آدمی خود اپنی ذات کے لئے اپنے خاندان کے لئے اپنی قوم کے لئے اپنے ابناء جنس کے لئے بڑا یا چھوٹا جو کام بھی انجام دیتا ہے چونکہ اسی لئے انجام دیتا ہے کہ خدا ہی نے اس کا حکم دیا ہے، قدرتاً اسی کا منطقی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: صرف ایک شعر بلکہ ایک ہی مصرعہ میں خلاصہ کر دیا ہے یعنی وہی مصرعہ ع چوں از دگشتی ہمہ چیز از تو گشت ایک دفعہ اسی مصرعہ کو پڑھئے اور گشتن کے معنے ہو جانا لیجئے۔ پھر پڑھئے اور پھر نا گشتن کا ترجمہ کیجئے۔ سب کچھ اسی ایک مصرعہ میں آگیا۔ یعنی آدمی جب خدا کے لئے ہو جاتا ہے تو خدا بھی اس کے لئے ہو جاتا ہے، آدمی جب خدا سے پھر جاتا ہے خدا بھی اس سے پھر جاتا ہے الجنۃ والنار اسی کا نام ہے ۱۲

نتیجہ یہ ہے کہ خدا سے اجر و صلہ کا جائز استحقاق اسکو حاصل ہو جاتا ہے، آخر سب کچھ جو خدا کے لئے کر رہا ہے خدا سے جزا اور مزد پانے کا حق اس کو حاصل نہ ہوگا تو کیا مادی ذہنیت رکھنے والے اس کے مستحق ہو سکتے ہیں جن کے کسی عمل اور فعل کا رُخ خدا کی طرف نہ ہوتا ہے اور نہ اس رُخ کو وہ اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہیں، یقیناً بڑے سے بڑا کام ہی مادی مسلک رکھنے والوں سے کیوں نہ بن گئے ایسا کام جس سے رہتی دنیا تک ہر متنفس کو فائدہ پہونچتا رہے، یا اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیاں ہی ان کی طرف سے کیوں پیش ہوئی ہو جان تک کیوں نہ نچھاور کر دی گئی ہو لیکن خدا کے لئے جو کام کیا ہی نہیں گیا ہے خدا سے اس کے اجر کی خود ہی سوچئے آخر کس بنیاد پر توقع کی جائے، بجائے خود مادی نقطۂ نظر والے عموماً اس کی توقع رکھتے بھی نہیں[1] ان کے مسلک کا یہی تو جوہری نقص ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں انجام اور نتیجہ کو سوچے بغیر کرتے ہیں، ان کی سرگرمیوں کو دیوانوں کا خواب اسی لئے تو میں کہتا چلا آ رہا ہوں، جو بھی فکرِ معقول سے کام لے گا اس کا فیصلہ بھی یہی ہوگا کہ آخری نتیجہ فائینل ریزلٹ مادی زندگی کا کچھ نہیں ہے۔

بہرحال بنی آدم کی عملی زندگی کا جو نظام نبوات و رسالات کی طرف سے عموماً پیش ہوتا رہا ہے، جس کی آخری تکمیلی قالب کی طرف "الاسلام" کے نام سے آخری نبوت کی آخری کتاب میں دعوت دی گئی ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ ایک کامل و مکمل دائرہ کی شکل میں ہستی کے پورے دائرے ہی کو سوچنے والوں کے آگے وہ پیش کر دیتا ہے، ایسا دائرہ جس میں کہیں خلا نہیں ہے، اس دائرہ کے جس حصہ اور جس نقطہ پر آپ انگلی رکھ دیں گے، آغاز کے ساتھ انجام کا یا ابتدا کے ساتھ انتہا کا نقطہ بھی وہ بن جائے گا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، وجود کے تینوں ارکان یعنی کائنات (یا مادہ اور انسانی مخلوقات) انسان، خالق (خدا) ان تینوں کے متعلق کس لئے کا سوال اٹھا کر دیکھئے اس ایمانی دائرہ یا دائرۃ الایمان میں ہر ایک کا جواب ملتا چلا جائے گا۔ پوچھئے کائنات کس لئے ہے؟ اسی دائرہ میں آپکو اس کا جواب مل جائے گا کہ انسان کے لئے ہے، انسان کس لئے ہے؟ خدا کے لئے اس کا جواب جہاں آپ کے سامنے آئے گا، وہیں اٹھانے والا اگر کس

---

[1] ہاں ان میں کبھی کبھی ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو خدا کے مرضیات سے واقف ہونے کے قدرتی ذرائع یعنی نبوت و رسالت سے بے تعلق رہنے کے باوجود اپنے خود افزیدہ وسوسوں کو خدا کی مرضی ٹھہرا کر باور کر لیتے ہیں کہ ہم خدا ہی کی مرضی کی تعمیل کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں، خدا سے علم پائے بغیر خدا پر افترا کرتے ہیں ۱۲۔

سوال کو اٹھائے کہ پھر خدا کس لئے ہے؟ تو اسی دائرہ میں دیکھئے اس سوال کا جواب بھی اس دائرہ میں موجود ہے، یعنی خدا انسان کے لئے ہے بایں معنی کہ انسان اپنے آپ کو جب خدا کے لئے بناتا ہے تو خدا بھی اس کے لئے بن جاتا ہے وہ پاتا ہے کہ خدا، خدا کا ارادہ، خدا کے قوانین اس کی ہر خواہش اور اس کی ہر مرضی کی ہمنوائی کر رہے ہیں، وہی ہو رہا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے، بہشتی ماحول کی حقیقت یہی ہے۔

لیکن انسانوں میں اپنے آپ کو جو خدا کے لئے نہیں بناتے اور خدا کی مرضی کی پابندی اپنے لئے ضروری قرار نہیں دیتے، وہی پاتے ہیں کہ خدا بھی اُن کے لئے نہیں ہے، بلکہ جیسے عمر بھر وہ خدا کے مرضیات سے ٹکراتے رہے، دیکھتے ہیں کہ خدا کا ارادہ اور خدا کے قوانین بھی اس سے ٹکرا رہے ہیں، جہنمی ماحول میں اسی تصادم اور ٹکراؤ کا تجربہ کرایا جائے گا۔

الغرض یوں ہستی کا یہ سارا نظام ایک جیتے جاگتے ابدی نہ ختم ہونے والے روشن نظام کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ کے کسی سوال کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا" مادیت "اور" روحانیت" عملی زندگی کے ان دونوں نظاموں میں جو نقص اور کمی پائی جاتی تھی اسلامی نظام زندگی میں ان ساری کوتاہیوں کا ازالہ ہوجاتا ہے اور یہی میں عرض کرنا چاہتا تھا، گو بہت زیادہ غیر ضروری طول بیانی سے کام لینا پڑا۔ ایک ہی مسئلہ کو بار بار مختلف پیرایوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی، ممکن ہے میرا خیال غلط ہو لیکن خیال یہی رہا کہ اگر تکرار و اعادہ سے کام نہ لیا جائے گا تو جو کچھ کہنا چاہتا ہوں شاید اس کے ذہن نشین کرانے میں ناکام رہ جاتا، آخر پڑھنے والوں میں سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں ارباب فہم و دانش جن کے لئے چند اشارے کافی ہوتے ہیں ان کے سوا بھی تو کافی تعداد ان لوگوں کی پائی جاتی ہے جن کے متعلق مجھے تو اب بھی اندیشہ ہے کہ ہذیان یا مجذوب کی بڑ سے زیادہ میری باتوں کی وقعت انکی نگاہوں میں نہیں ہوگی اب کچھ بھی ہوا اپنی حد تک جس طریقہ سے تکرار و اعادہ کی وجہ سے اپنے خیالات کو ادا کر سکتا تھا میں نے ادا کر دیا ہے۔ گرانی محسوس کرنے والوں سے معافی کا خواستگار رہوں اور میرے منشا کے سمجھنے سے اب بھی اپنے آپ کو جو معذور پا رہے ہوں ان سے بھی یہی التماس ہے کہ ذرا زیادہ فکر و تامل سے کام لیں، شرح صدر کی خدا سے دعا کریں، ممکن ہے جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہی ان کی سمجھ میں بھی آجائے۔ واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

آخر میں "عملی زندگی کے اسلامی نظام" کے متعلق ایک وسوسہ کا ازالہ بھی دل چاہتا ہے کہ کر لیا جائے۔ اس وسوسہ کا تعلق "روحانیت" کے جز سے ہے جسے اسلام نے اپنے پروگرام میں داخل ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ آپ دیکھ

چکے کہ اسی کو خشتِ اوّل اور سنگِ بنیاد بنا کر اسلام کے عملی نظام کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی طویل و عریض تاریخ میں ایک طبقہ "صوفیہ" کے نام سے جو پایا جاتا ہے دینی زندگی کے اس خاص طریقہ کی تعبیر تصوف سے عموماً لوگ کرتے ہیں، بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ اس طبقہ نے مسلمانوں کے اندر بھی وہی فرشتہ یا ملک بنانے والی روحانیت کو گھسنے کا صرف موقعہ ہی نہیں دیا، بلکہ عام مسلمانوں کے قلوب اسی طبقہ کے وزن سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، گویا دین کی معیاری زندگی کا نمونہ سمجھا جاتا ہے کہ صوفیہ صافیہ ہی کی دینی زندگی ہے۔

"روحانیت" کا تذکرہ جن الفاظ میں اب تک میں نے کیا ہے ممکن ہے کہ مجھے ان لوگوں میں شمار کر لیا جائے جو مسلمانوں کے طبقۂ صوفیہ سے خوش نہیں ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی جتنی مستند کتابیں اب تک میری نظر سے گذری ہیں یا صوفیہ کے اساطین و سربرآوردہ بزرگوں کے حالات کتابوں میں جس حد تک پڑھ سکا ہوں، یا خود میری نظروں سے اس سلسلہ میں جو مثالی ہستیاں گذری ہیں ان سب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بآسانی دعویٰ کر سکتا ہوں کہ صحیح اسلامی تصوف کی بنیاد آدمی کو فرشتہ یا ملک بنانے کی کوششوں پر قطعاً مبنی نہیں ہے، بلکہ برعکس اس کے میں تو یہی جانتا ہوں کہ ہمارے یہ صوفیہ آدمی کو ہر حال اور زندگی کی ہر منزل میں آدمی ہی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں، ان کے نزدیک اس پست خاکی زندگی میں بھی انسان انسان ہی رہتا ہے اور اس کے بعد زندگی کے جن اطوار و ادوار میں وہ داخل ہوتا ہے انسان ہی بنا ہوا داخل ہوتا ہے، اس قسم کے بے بنیاد خیالات کہ بلند ہوتے ہوتے آدمی فرشتہ یا العیاذ باللہ خدا بن جاتا ہے[1] یا پستی کے گڑھوں میں گرتے ہوئے گھوڑے، ہاتھی، بیل اور چوہے، چھپکلیوں، یا گرگٹوں وغیرہ کا قالب اختیار کر لیتا ہے میں نہیں جانتا [illegible]مانوں کے کسی مستند صوفی یا قابلِ اعتبار کتاب میں اس قسم کے خرافات پائے جاتے ہوں۔

میرے نزدیک ہر مسلمان صوفی کے نزدیک جنتی اور جہنمی زندگی کے ان دونوں رنگوں میں بھی آدمی آدمی ہی رہتا ہے۔ سکھ یا دکھ کے جو تجربے بھی ان زندگیوں میں پیش آئیں گے وہ انسان کے فطری مزاج کے مطابق ہی پیش آئیں گے

---

[1] جیسا کہ بعض مذاہب و ادیان میں فنائی الاصل کا مفروضہ فرض کر کے یہی مانا جاتا ہے کہ ملک یا فرشتہ ہونے کے بعد آدمی خدا کی ذات میں محو ہو کر خدا ہی بن جاتا ہے ان نتائج کی توقع ان لوگوں کو دلائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو خدا کے لئے بناتے ہیں اسی طرح خدا کی مرضی سے ٹکرانے والوں کو تناسخ کی شکل میں گھوڑے، گدھے، ہاتھی بیل وغیرہ کے جون میں جنم لینا پڑتا ہے۔ ۱۲

یہی وجہ ہے کہ مسلمان صوفیوں کی پوری تاریخ روحانیت یا رہبانیت و جوگیت کی ان انسانیت سوز، آدمیت گداز، مہیب ریاضتوں کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے، جن کے قصے سُن سُن کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ روحانیت کے غیر اسلامی طریقوں میں انسانیت ہی کو لعنت کا طوق ٹھہراتے ہوئے یہ چاہا جاتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس پھندے سے نجات حاصل کر کے اپنے آپ کو فرشتہ بنا لیا جائے۔ بنی نوع انسانی کے نوعی تقاضوں سے خالی ہونے کے لئے سُنا جاتا ہے کہ سکھانے والے اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں کو سکھا دیا کرتے تھے بلکہ برفستانوں میں بھٹکتے ہوئے چٹانوں سے سر پٹکتے ہوئے بھی ان لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ جو آدمی کے گندے، نجس، ناپاک قالب سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اپنے آپ کو وہ کبھی آگ میں جھونک دیتے تھے، پہاڑوں سے گراتے تھے، دریاؤں میں بہاتے تھے، چوبیس گھنٹے فطرت انسانی کے سارے جبلی اقتضاؤں پر پہرے بٹھائے رکھتے تھے، پانی کو پیتے بھی تھے تو ہمیشہ گرم کر کے اور کھانے کے زہر مار کرنے پر مجبور ہوتے تھے تو اس میں ریت اور بالو اور ایسی چیزیں ملا دیتے تھے جن سے آدمی کی قوت ذائقہ کو سخت اذیت ہوتی تھی، جنسی میلانات کو اپنے اندر سے مٹانے کے لئے طرح طرح کی غیر فطری تدبیریں ان میں مروج تھیں۔ الغرض فرشتہ کو اپنے اندر سے پیدا کرنے کے لئے ساری انسانی خصوصیتوں کو زندگی بھر کچلتے اور انکو دانتے سلتے رہنا، اسی کو "روحانیت" کے بڑھانے کا واحد ذریعہ انھوں نے بنا رکھا تھا

ظاہر ہے کہ "روحانیت" یا رہبانیت و جوگیت کا یہ عجیب و غریب مسلک اور طریقہ کار جس کے اندر انسان کی انسانیت ہی ملعون ٹھہرا دی گئی ہو۔ سب سے بڑی کامیابی اسی لعنت سے نجات پانی کو سمجھا جاتا ہو۔ اس مسلک کی گنجائش اسلامی نظام والی عملی زندگی میں بھی بھلا کیا نکل سکتی ہے۔ جس میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے آدم کو خدا کا خلیفہ اور اس کی خدائی کا نمائندہ مان کر کیا جاتا ہے۔ وہی خلیفہ جس کے آگے ملائکہ کو بھی سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

ہاں! فرشتہ نہیں بلکہ اپنے آپ کو عبد و بندہ بنا کر دکھانے اور اس حقیقت کے اعتراف کے لئے انسانی خلیفہ کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کا اپنا خانہ زاد کوئی ذاتی سرمایہ نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور خلیفہ بنانے کے لئے یہ سب کچھ دیا ہے دل کا یہ اقرار و اعتراف صادق ہے یا کاذب اس کی جانچ کے لئے ظاہر ہے کہ اسلامی نظام کے عملی مطالبات ہی کافی ہیں

نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى — روکا نفس کو "الھوی" سے

تو کھلا ہوا قرآنی ضابطہ ہے خواہشوں کا وہ زور جو اسلام کے عملی نظام نامہ کے نشان زدہ حدود کے توڑ دینے، اور

پھاندجانے پرآدمی کو اکساتا اور ابھارتا ہو الھوی خواہشوں کے اسی زور کا تو نام ہے، باقی ایسی باتیں جن میں آزادی بخشی گئی ہے یعنی جائز اور مباح امور جن کے کرنے والوں پر اسلامی حدود کے توڑنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا ان سے اپنے آپ کو جو روکتا ہے ظاہر ہے کہ خدا کے حکم کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی خواہش کی یہ تعمیل ہے اسی لئے خدا کے پاس مباح اور جائز چیزوں سے پرہیز پر کسی اجر کی امید بھی نہ رکھنی چاہیئے۔ ہمارے یہاں کا کھلا ہوا فتویٰ یہ ہے کہ لذیذ غذائیں جن کے کھانے کی اسلام میں ممانعت پائی جاتی ہے

لا فضیلة فی الامتناع عن اکلہا — کسی قسم کی دینی برتری ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی جو ان غذاؤں سے پرہیز کرتے ہیں۔

(احکام القرآن جصاص صـ ۵۵ ج ۲)

خود قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے۔

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (التحریم) — جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے اُسے کیوں حرام کرتے ہو۔

اُن کو ڈانٹا گیا ہے جو زیب و زینت آرائش و آسائش کی چیزوں سے پرہیز کو دین کی معیاری زندگی کے لوازم میں شمار کرتے تھے، ارشاد ہوا ہے

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف) — کہدو! کون ہے جو حرام ٹھہرا رہا ہے زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ غذاؤں کو

البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ نفسانی امراض کے بعض روگیوں کے لئے بطور وقتی پرہیز کے یا اخلاقی اقتدار و اختیار کو قابو میں رکھنے کے لئے بطور مشق کے کبھی اس راہ کے حاذق اطبا یا ماہر اساتذہ و شیوخ کچھ ایسی تدبیروں کی ہدایت کرتے ہیں جن کو دیکھ کر مغالطہ ہو سکتا ہے کہ جائز اور مباح چیزوں کے استعمال سے بھی لوگ روک دیئے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ مرض کی وجہ سے پرہیز یا عادی بنانے اور مشق و ملکہ حاصل کرنے کے لئے کرنے والے جو کچھ کرتے ہیں انکی حیثیت دوامی ضوابط و قوانین کی نہیں ہوتی۔ اس باب میں انفرادی شخصیتوں کے لئے ماہرین کو الگ الگ تدبیریں جو تجویز کرنی پڑتی ہیں اس کا راز یہی ہے کہ ان باتوں کی نوعیت قانون و ضابطہ کی نہیں بلکہ ایک وقتی مشورے کی ہوتی ہے افراد کے مرض کا جب ازالہ ہو جاتا ہے یا جس مشق و ملکہ کا پیدا کرنا مقصود تھا جب وہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو ان پابندیوں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ آپ مسلمانوں کے اساطین صوفیہ کے حالات کا مطالعہ کیجئے، بھلا

ان بزرگوں کو رہبانیت کے دنیا گریز رجحانوں سے کیا تعلق جن کے زیرِ اثر دنیا کی اکثر نعمتوں سے دلوں میں گونہ چڑ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے [۱]۔

اس میں شک نہیں کہ فطرت کے احساسات اور جبلت کے تقاضوں سے گونگے بہرے بن جانے کی مشق و مزاولت کی وجہ سے ان لوگوں کو جو اپنی انسانیت کے شکم سے فرشتہ یا ملک کو پیدا کرنے کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں، کامل یکسوئی کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ہر چیز سے جو اپنے آپ کو الگ کر چکا ہو۔ یکسوئی کا مسئلہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے دشوار کیوں ہو، اسی یکسوئی کی مشق کی وجہ سے بعض غیر معمولی کارنامہ کی پوشیدہ قوتوں کو ابھار لینے میں بسا اوقات فرشتہ بننے والی روحانیت والوں کو حاصل ہو جاتی ہے، عوام کے قلوب میں جس کی وجہ سے ان کا کافی وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ تجربہ نے ہمیشہ اس کو ثابت کیا ہے کہ خلیفہ بن کر بندے بن جانے یعنی سب کچھ رکھتے ہوئے اسی سب کچھ کو خدا کی مرضی کا تابع بنا لینے کی وجہ سے جب خدا اور اس کی قوتیں بندے کی ہم نوا بن جاتی ہیں، جو آثار و ثمرات و برکات اس راہ سے حاصل ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں فرشتہ بنانے والی ریاضتوں اور مجاہدوں کے کارناموں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کی دعوت دینے والے بزرگوں میں جن کو اس راہ کا سب سے پہلا داعی اور ہادی سمجھا جاتا ہے، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی طرف بھی قرآن میں یہ فقرہ منسوب کیا گیا ہے

لَا اَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُولُ اِنِّي مَلَكٌ (ھود)

میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب (کی باتوں کو) جانتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ یعنی ملک ہوں۔

اور اسی راہ کی آخری ہستی نبوتوں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ

---

[۱] کسی خاص علاقہ یا طبقہ ہی کی حد تک نہیں بلکہ عام اسلامی ممالک میں تصوف اور صوفیت کی ریاست جس ذاتِ گرامی پر ختم ہوتی ہے۔ میری مراد حضرت شیخ عبد القادر الجیلانی قدس سرہ کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ ان کے عام حسنِ قبول ہی کی یہ دلیل ہے کہ پیرانِ پیر غوثِ اعظم محبوبِ سبحانی اور اسی قسم کے بیسیوں القاب عوام و خواص دونوں میں مشہور ہیں۔ مسلمان صوفیوں کی معیاری زندگی کا سب سے اعلیٰ اور بہتر نمونہ آپ کی مبارک زندگی ہے آپ کے دسترخوان پر اعلیٰ سے اعلیٰ لذیذ غذاؤں کو لوگوں نے پایا ہے لباسِ مبارک کا بھی آپکے یہی حال تھا، قیام گاہ آپکی بغداد کا جو مدرسہ تھا ایک باضابطہ قصر و ایوان تھا ایک کم ۵۰ اولاد آپکی ہوئی جن میں ۲۷ بیٹے اور باقی صاحبزادیاں تھیں۔ - پرسلمانوں کے صوفیوں کی مثالی زندگی ۱۲-

قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ و لا اعلم الغیب، ولا اقول لکم انی ملک (الانعام)

کہدو! کہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب (کی باتوں) کو جانتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ یعنی ملک ہوں۔

بظاہر اس اعلان سے مقصود یہی ہے کہ اسلامی روحانیت اور غیر اسلامی روحانیت میں جو جوہری فرق ہے لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں، واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت کے مسلک پر چلنے والوں سے اسی قسم کے توقعات لوگ وابستہ کئے چلے آئے ہیں مثلاً یہی کہ رزق کی کشائش میں ان سے مدد ملتی ہے، روزگار آدمی کا ان کی توجہ سے چلنے لگتا ہے، نوکریاں مل جاتی ہیں، یا جن امتحانوں پر نوکریاں موقوف ہیں ان امتحانوں میں وہ لوگوں کو کامیاب بنا دیتے ہیں، گویا خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ کے خزانے ان کے قبضہ میں ہیں، انکو اختیار دیا گیا ہے جسے جتنا چاہیں اپنے ان مقبوضہ خزانوں سے لوگوں کو بانٹیں اور تقسیم کریں، اسی طرح ان ہی سے پیشگوئیوں کی امیدیں بھی باندھی جاتی ہیں سمجھا جاتا ہے کہ غیب سے جو کچھ شہادت میں آنے والا ہے، سب سے وہ آگاہ ہوتے ہیں۔ عموماً ان ہی آثار سے "روحانیت" اور "رہبانیت" کی راہوں کے اہل کمال کو لوگ پہچاننے کی کوشش کرتے چلے آئے ہیں، کچھ نہیں تو کم از کم روحانیت والوں سے اسی بات کی توقع کی جاتی ہے کہ جیسے کھانے پینے، وغیرہ جیسی انسانی ضرورتوں سے فرشتے بے نیاز ہیں ملکوتی بے نیازی کا یہی رنگ چاہیے کہ ان میں بھی پایا جائے، جس حد تک فطرت انسانی کے عام مطالبات سے لا پرواہی ان میں پائی جاتی ہے اسی قدر اس راہ کی برائیوں کے سمجھا جاتا ہے کہ وہ مستحق ہیں۔ نبوات و رسالات جن کی طرف سے بنی آدم کے گھرانوں میں "اسلامی نظام" ہی پیش ہوتا رہا ہے ان کی تاریخ کی ابتدا اور انتہا دونوں ہی کی طرف سے مذکورہ بالا باتوں کے اعلان کا مطالبہ تو جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی لئے شاید کیا گیا ہے کہ اسلامی روحانیت کے صحیح خط و خال لوگوں کے سامنے آجائیں، یہی بتانا مقصود ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں جو "روحانیت" شریک ہے اس کے لئے مذکورہ بالا خصوصیتوں میں سے کسی خصوصیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی بات کے اعلان کا حکم جہاں دیا گیا ہے وہیں آخر میں یہ بھی ہے کہ

ان اتبع الا ما یوحی الی

(یعنی کہدیجئے کہ) میں نہیں پیروی کرتا مگر صرف ان ہی باتوں کی جن کی مجھ پر وحی کی گئی ہے۔

مطلب جس کا یہی ہے کہ اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کی بخشی ہوئی ان آگاہیوں کے نیچے ڈال دینا چاہیے جس میں اپنے مرضیات سے خدا نے بندوں کو مطلع کیا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی "روحانیت" یہی اور صرف یہی ہے، سب کچھ رکھتے ہوئے سب کچھ کو اسی کی مرضی کا تابع بنا کر جینے کا فیصلہ جس کی طرف سے سب کچھ ملا ہے، اسلامی نظام زندگی میں جو روحانیت شریک ہے اس کا مطلب یہی ہے اس فیصلہ کے خلاف آدمی کا قدم غلطی سے اٹھ بھی جائے تو چاہیے کہ اس غلطی کی معافی چاہے، اس پر نادم ہو، اسی کا نام استغفار ہے اور پھر اپنے اسی فیصلہ پر عزم و ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ واپس ہو جائے اسی کا نام توبہ ہے، بندے کو چاہیے کہ اسی فیصلہ کے مطابق اپنے آپ کو خدا کے لئے بنانے کی جدّ و جہد میں زندگی بھر مشغول و منہمک رہے، خدا کا برتاؤ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ خدا کا کام ہے جس کا سوچنا بندوں کے فرائض میں نہیں، اور نہ بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ کب، زندگی کی کس منزل میں خدا کی طرف سے اسے کیا کیا دیا جائے گا ہمارے ہاں کے صوفیوں کے کلام میں حور و قصور و جنات و انہار والی جنّت کے متعلق کہیں کہیں ایسی باتیں جو ملتی ہیں کہ ان چیزوں کی طلب خدا طلبی نہیں ہے اس کا مطلب یہی ہے جو میں نے عرض کیا، بقول عارف شیراز

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن ؏ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

لیکن ہمارے گستاخ، رند مشرب، ناسمجھ شعراء ان بزرگوں کے کلام سے بدترین گمراہیوں کے شکار ہوئے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں انھوں نے فرشتہ بن جانا اسی کو انسانیت کا کمال ٹھہرا لیا اور یوں بے سوچے سمجھے جو جی میں ان کے آیا اسی کو شاعرانہ لباس پہناتے چلے گئے، "سڑے ہوئے انگوروں کی شراب" اور بازاروں میں کرایہ پر چلنے والی بیسواؤں کو دیکھ کر جو لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں کیا تماشا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے قدرتی مطلوبات کے ان مظاہر کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو کر خیر محض کے قالب میں آدمی کے سامنے آئیں گے۔ قرآنی زبان میں جس کا نام "الجنۃ" "الفردوس" وغیرہ ہے[1]۔

---

[1] اس موقعہ پر بیساختہ طبقۂ صوفیہ کے سرخیل محی الدین عربی شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آ رہا ہے۔ انھوں نے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ قرآنی جنت اگر حیوانی جنت ہے تو چاہیے کہ

الحیوان یلتذ بالوجہ الجمیل من المہیۃ المستحسنۃ العلام لحسن الوجہ والالوان ص۲۲۴ فتوحات مکیہ ج۲

حیوان بھی خوبصورت عورتوں اور نوخیز حسین و جمیل نوجوانوں اور مختلف رنگوں کی بوقلمونیوں سے لذت اندوز ہوتے

شیخ نے لکھا ہے کہ آخر بہتے ہوئے پانی، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، سر سبز باغ، میووں پھلوں سے لدے ہوئے جب ہوں ان کو دیکھ کر انسانی فطرت بے چین ہوتی ہے۔ وجد و سرمستی کی کیفیت اس میں پیدا ہوئی ہے یا بھینسوں، بیلوں کو بھی کسی نے ان نظاروں سے متاثر ہوتے دیکھا ہے۔

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

از
مولانا ابو سلمہ شفیع احمد البہاری
استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ

(سلسلے کے لئے برہان بابتہ ستمبر ۵۳ء دیکھئے)

ساتویں قسم اصول حدیث پر کتابیں
(۱) میزان الاخبار - مفتی سید عمیم الاحسان
(۲) الافادات الرضویہ - مولانا ظفر الدین صاحب بہاری پروفیسر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ -

(۳) استجلاء البصر من شرح نخبۃ الفکر - مولانا ابو محمد عبد العزیز العثمانی

اس میں مندرجہ ذیل امور کا التزام کیا گیا ہے جو شارح کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں -
اول یہ کہ شرح نخبۃ الفکر کو چند صحیح نسخوں سے مقابل کر کے صحیح کیا گیا، دوم متن کتاب یعنی نخبۃ الفکر کو جلی قلم ہلالی خط کے اندر لکھا تاکہ شرح سے متمیز ہو سکے . سوم شرح و متن دونوں کو ایک انداز متناسبہ پر لکھ کر ترجمہ و شرح با محاورہ لکھی تاکہ سہولت سے سمجھ میں آجاوے - چہارم عربی عبارت نیز اعراب لگا دئے، تاکہ عربی کی ادنیٰ مہارت رکھنے والا بھی جلدی سمجھ جاوے - پنجم شروع انواع و مقاصد کو جلی قلم کی سرخی سے منسوب کیا کہ مضامین کی تلاش میں دقت نہ ہو ششم ترجمہ و شرح دونوں کو میں نے اصل کتاب کی طرح رلا ملا کر لکھا تاکہ ماقبل و مابعد کا ارتباط اچھی طرح ذہن نشین ہو جاوے اور شرح کے امتیاز کے واسطے شروع خاتمہ پر ہلالی خط لکھا گر یہ التزام سب کتاب میں نہیں ہو سکا. بعض بعض جگہ میں متروک بھی ہو گیا ہے ہفتم ترکیب نحویہ سے سوائے چند مواضع کے احتراز کیا گیا ہے اس واسطے کہ غرض ترکیب سے

معنی کی تفہیم ہوتی ہے اور وہ شرح سے حاصل ہوگئی ہے اس واسطے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہشتم اکثر ماخذ اس کتاب کا بہجۃ النظر علی شرح نخبۃ الفکر مولفہ[1] محدث ابو الحسن محمد صادق السندی المدنی کا ہے جو اس کتاب کے سب شروح سے بہتر ہے، نہم سوائے بہجۃ النظر کے جو اور کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے تو نام ان کا اخیر میں لکھ دیا ہے اور جس موقع پر کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا وہ بہجۃ النظر کا مضمون ہے کثرت تکرار سے گاہے گاہے اس کا نام لکھنا رہ گیا ہے۔ دہم چونکہ علمائے کرام وائمہ عظام کے حالات سے واقف ہوئے بغیر ان کے اقوال کی وقعت دل میں نہیں بیٹھ سکتی اس واسطے ان بزرگان دین میں سے جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے ان میں سے اکثر کے حالات بھی اس کتاب میں لکھے گئے ہیں فقط ۲۶ شعبان المعظم ۱۳۳۲ھ مقام چھاؤنی کوہ سپاٹو ضلع شملہ۔

مندرجہ ذیل کتابیں بھی اس عنوان کے ماتحت لکھی جاسکتی ہیں۔

(۴) مقدمہ فتح الملہم۔ مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی رح

(۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ مولنا عبد الرحمن صاحب مبارک پوری۔

(۶) مقدمہ اوجز المسالک۔ مولنا زکریا صاحب۔

(۷) مقدمہ حاشیہ نسائی۔ مولنا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی

آٹھویں قسم اسناد حدیث پر ۸ کتابیں | (۱) السبعۃ السیارۃ فی اسناد الحدیث۔ حکیم الامت مولنا تھانوی رح

(۲) منۃ الباری باسانید صحیح البخاری مفتی سید عمیم الاحسان صاحب۔

(۳) عمدۃ العناقید من حدائق بعض الاسانید۔ شوق نیموی مرحوم

(۴) نزول السکینۃ باسانید الاجازات المبینۃ۔ مولنا ظفر الدین صاحب بہاری پروفیسر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ۔

(۵) الیانع الجنی فی اسناد الشاہ عبد الغنی رح۔ مولنا محسن صاحب۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سندی رح کا بھی ایک رسالہ اصول حدیث میں ہے واللہ اعلم بالصواب

(۶) الدر المنضود فی اسانید شیخ الہند محمودؒ (بزبان عربی)

(۷) المسک الاذفر فی اسانید الشیخ انورؒ۔

(۸) الزبرجد فی اسانید الشیخ حسین احمد

نویں قسم رجال پر ۳ کتابیں | (۱) کشف المغطا برجال الموطا۔ مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی

(۲) رجال البخاری۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ

(۳) رجال النسائی۔ مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی

دسویں قسم تخریجات حدیث پر ۸ کتابیں | (۱) النعمۃ السابقۃ فی تخریج حجۃ اللہ البالغۃ

(۲) تخریج الاحادیث المرویۃ من عترۃ النبویۃ

(۳) تخریج بلاغیات موطا

(۱–۳) قاضی شیخ محمد مچھلی شہری م ۲۴ ھ غیر مطبوعہ

(۴) النجوم الثواقب فی تخریج احادیث الکواکب۔ مولانا احمد رضا خاں

(۵) الروض البہیج فی آداب التخریج۔ مولانا احمد رضا خاں

مؤخر الذکر کو ادنیٰ ملابست کے باعث اس فن میں شمار کرلیا ہے۔ مولانا رحمان علی صاحب کا خیال ہے کہ

اگر پیش ازیں کتابے دریں فن یافتہ نشود پس مصنف را موجد تصنیف ہذا می تواں گفت (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۴)

(۶) تخریج حجۃ اللہ البالغۃ

(۷) تخریج شفاء قاضی عیاضؒ

(۸) تخریج دلائل الخیرات (عربی) مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی م ۱۳۳۱ھ

گیارہویں قسم تدوین تاریخ حدیث پر ۳ کتابیں | (۱) السیر الحثیث فی تاریخ تدوین الحدیث۔ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی، ایم اے پی، ایچ، ڈی، کیمبرج

یہ مقالہ ہے جو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ دائرۃ المعارف کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا اس میں مندرجہ ذیل نقاط سے بحث کی گئی ہے۔

(۱) کتابۃ الحدیث وتدوینہ وتعلیمہ

(۲) وضع الحدیث واختراعہ

(۳) نقد الحدیث وتحقیقہ

(۴) درس الحدیث النساء

(۵) الاسناد فی علم الحدیث وتکمیلہ

(۲) علوم الحدیث ۔ شاہ عزالدین پھلواری

اس میں علم حدیث کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور علم حدیث کی مختلف کتابوں کے حالات اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

(۳) تدوین حدیث ۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

موجودہ دور کے خود ساختہ مجتہدین ۔ کچھ تاریخ حدیث سے ناواقفیت ۔ کچھ یورپ کی صدائے بازگشت کے اثر اور زیادہ تر مذہب میں سہولت پسندی اور عقل پرستی کی بنا پر حدیث کی صحت اور اس کے حجت شرعی ہونے کے منکر ہیں ۔ مولانا گیلانی نے احادیث نبوی کی صحت اور اس کے لائق اعتماد ہونے پر محققانہ بحث کی ہے اور حدیث کی حقیقت واہمیت اس کے رواۃ کی خصوصیات، اس سے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا عشق اور اس کی تعلیم حفاظت واشاعت دین کا اہتمام تدوین حدیث کے قدرتی اسباب ووسائل، حدیثوں کا تواتر اس کی تدوین کی تاریخ غرضیکہ سارے مسائل کا ذکر اس میں محققانہ طور پر کیا گیا ہے۔

بارہویں قسم مسند امام احمد بن حنبل پر ۲ کتابیں	(۱) تبویب مسند علی نہج الجامع الصحیح للبخاری ۔ مولانا حافظ عبدالحکیم صاحب نصیر آبادی۔

مولانا نے بعد از تبویب آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کو دے دی کانفرنس نے مولانا ابوسعید شرف الدین صاحب کا تقرر کیا اور انھوں نے پھر اس کی

(۲) شرح وتنقید واصلاح وتبویب محدثانہ طریق پر بڑی محنت وجانفشانی سے کی ۔ تقریباً

۴ اجزا چھپے بھی مگر ناتمام رہی۔

تیرہویں قسم بلوغ المرام پر ایک کتاب | حاشیہ بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام۔ ڈپٹی سید احمد حسن م ۱۹۲۰ء

چودھویں قسم موطا امام مالک پر ۳ شرحیں | (۱) شرح موطائے امام مالک ناتمام (عربی) مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی م ۱۳۵۷ھ دو چار صفحہ کی شرح ۱۲۵ صفحات کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ افسوس کہ پوری نہ ہوئی ورنہ عجائب روزگار سے ہوتی۔

(۲) اوجز المسالک شرح موطا امام مالک شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی

(۳) حاشیہ موطا امام مالک

پندرہویں قسم شرح مشکوٰۃ المصابیح پر ۵ کتابیں | (۱) التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح (عربی) مولانا محمد ادریس کاندھلوی مطبوعہ دمشق۔

(۲) تنقیح الرواۃ فی تخریج[1] احادیث المشکوٰۃ۔ اس کا ابتدائی حصہ ڈپٹی سید احمد حسن مرحوم نے لکھا اور پھر کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک مولانا ابو سعید شرف الدین نے پورا کیا۔

(۳) حاشیہ مشکوٰۃ (عربی) ڈپٹی سید احمد حسن صاحب م ۱۹۲۰ء

(۴) ترجمہ مشکوٰۃ ج ۱۔ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری م ۱۲۹۰ء

(۵) حاشیہ مشکوٰۃ[2]

سولھویں قسم سنن دارقطنی پر ایک کتاب | التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی۔ مولانا شمس الحق ڈیانویؒ جس میں تنقید بعض احادیث، بیان علل، کشف مطالب علی سبیل الایجاز کیا گیا ہے

سترہویں قسم مسند امام اعظم پر ۲ کتابیں | (۱) تنسیق النظام علی مسند الامام۔ مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی م ۱۳۰۵ھ

(۲) تحصیل المرام بتوضیب مسند الامام۔ مولوی محمد ادریس بگرامی

اٹھارہویں قسم شرح معانی الآثار پر ۵ کتابیں | (۱) حاشیہ الطحاوی۔ مولانا وصی احمد صاحب، اس کام میں ان کے رفیق کار مولانا محمد حسن سنبھلی بھی تھے۔

---

[1] اس کو "تخریج" میں آنا چاہئے مگر دلکل وجہہ ہو مولیھا، [2] آج کل مشکوٰۃ شریف پر متعدد حواشی شائع ہوئے ہیں لیکن میں نے سب کو ترک کر دیا ہے۔

(۲) تلخیص الطحاوی ۲ جزء - مولانا حسین علی پنجابی، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں تھے۔

(۳) حاشیہ تلخیص الطحاوی - مولانا محمد مسلم

(۴) تصحیح الاغلاط الکتابیۃ الواقعۃ فی النسخ الطحاویۃ - مولانا حکیم سید محمد ایوب صاحب مظاہری سہارنپوری

شرح معانی الآثار کے نسخوں میں جو غلطیاں تھیں۔ ان کی شروح و قلمی نسخہ کی مدد سے تنقیح و تحقیق کی۔ جزء اول میں ساڑھے آٹھ سو غلطیوں کی تصحیح ہے۔ کتابت کی شکل یہ ہے کہ ہر صفحے میں پانچ خانے ہیں پہلے خانے میں طحاوی کا باب ہے دوسرے خانہ میں صفحہ و سطر کا حوالہ تیسرے میں غلطی کی تعیین کی گئی ہے چوتھے میں تصحیح کی گئی ہے۔ پانچویں خانہ میں وجوہ و دلائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) شرح طحاوی - اس پر محنت و جانفشانی سے مولانا محمد یوسف صاحب (تبلیغی جماعت والے) کام کر رہے ہیں معلوم نہیں کہاں تک پہنچے۔

انیسویں قسم متفرقات (۲۱ کتابیں) آثار السنن ۲ جلد - مولانا ظہیر احسن شوق نیموی[1]

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا خیال ہے کہ

"وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے درس نظامی والی حدیث (یعنی مشکوٰۃ شریف) سے زیادہ کوئی چیز اس فن میں استادوں سے نہیں پڑھی (نظام تعلیم و تربیت ص ۲۴۲)

حالانکہ شوق نیموی مولانا عبدالحئی کے ممتاز و ارشد تلامذہ میں سے تھے جہاں مولانا عبدالحلیم صاحب

---

[1] ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ دیوانِ شوق، مثنوی سوز و گداز، ازاحۃ الجید فی بیان التقلید۔ اسی میں امام اعظمؒ کی محققانہ سوانح عمری بھی ہے، حبل المتین فی اخفاء آمین، جلاء العینین فی رفع الیدین، تجلی جلاء کی تائید میں، جامع الآثار عدم جواز صلوٰۃ الجمعۃ فی القری کی بحث، لامع الانوار جامع الآثار کی تائید اور مذہب المختار کا جواب باصواب، مقاد کا حضرت گنج مرادآبادی کے ملفوظات کی تائید، تذئیل قدمبوسی بزرگان دین کے استحباب کو فقہ و حدیث سے ثابت کیا ہے، ازاحۃ الاغلاط صحب الغاظ کے متعلق۔ اصلاح یہ بھی زبان ہی کے متعلق ہے، ایضاح اصلاح کی شرح، سرمہ تحقیق مع قصیدہ عظمیٰ، یادگار وطن اوسلیۃ العقبیٰ، رد المسکین حبل المتین کی تائید میں۔

فرنگی محلی کے زمانہ سے تو قطعاً صحاح ستہ کا یا اکثر کتب صحاح کا درس جاری تھا۔

(معارف ج ۴۵ نمبر ۶)

ہجرت کے موقع پر غار ثور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس سوراخ کو پاؤں کے انگوٹھے سے بند کیا تھا اس میں سانپ تھا، اس نے کاٹ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن لگا دیا، تکلیف جاتی رہی اور اب تک صدیقی خاندانوں میں اس کا نشان پایا جاتا ہے۔ محدث جلیل شوق نیموی رح نے اپنے پاؤں میں اس نشان کا دعویٰ کیا ہے (النبی الخاتم ص ۱۱۲)

اس جیسی محدثانہ کتاب ہندوستان میں گویا نہیں لکھی گئی ہے خود نیموی رح کا خیال ہے کہ

وھو کتاب نادر غریب فی ھذا الفن وعلقت علیہ تعلیقا وسمیتہ بالتعلیق الحسن علی آثار السنن واسال اللہ الصدق والصواب (ص ۳)

شاہ انور صاحب رح کے دو قصیدے ہیں جو آخر کتاب میں لکھے گئے ہیں۔

(۲) احیاء السنن	خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون - ضلع مظفر نگر یو پی
(۳) جامع الآثار	
(۴) تابع الآثار	
(۵) الاستدراک الحسن	
(۶) اعلاء السنن	

احیاء السنن ان احادیث کا جو حنفی مسائل کی تائید میں ہیں مجموعہ ہے، فقہی ابواب پر مرتب ہے لیکن اس کا مسودہ ضائع ہو گیا کچھ دنوں کے بعد پھر خیال آیا اور جامع الآثار نئے طرز و بیان

لہ صوبہ بہار ہر دور میں ہندوستان کو نایاب تحفہ پیش کرتا رہا ہے۔ عصر حاضر میں اس کے تحائف و عطایا میں آثار السنن اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت صوبہ بہار کی ذات گرامی ہے۔ مولانا اسلامی فکر اور عمل کا مجسمہ تھے یوں تو ہر شخص اپنے اور اپنی جماعت کے لئے یہ شعر پڑھا کرتا ہے مگر اس کے صحیح مصداق مولانا ہی تھے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اس جیسی جامع و سیاسی ہستی آپ جمعیۃ علمائے ہند کی پوری تاریخ میں کم دیکھیں گے مولانا کے بعد ہندوستان میں اسلام و مسلمان دونوں یتیم ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون ۱۲ - ابو سلمہ

سے مرتب فرمایا لیکن ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہیں بڑھا لیکن جو مرتب ہوگیا تھا وہ چھپ کر شائع ہوگیا اور پھر اسی کا ضمیمہ تابع الآثار کو بنایا گیا۔ پھر احیاء السنن کا دوبارہ احیا ہوا اور کتاب الحج تک کام ہوا اور اس کے دو حصے شائع بھی ہوئے کہ بعض اسباب کی بنا پر اس کتاب کے بعض مضامین سے حضرت حکیم الامت رح کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو منتخب فرمایا اور آپ نے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو الاستدراک الحسن کے نام سے شائع کیا اور احیاء السنن کے نام کو بدل کر اعلاء السنن کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا تقریباً بارہ جلدیں اس کی شائع ہو چکی ہیں جن میں مذہب حنفی کی مؤید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات اس کے شرح و حواشی میں یک جا کئے گئے ہیں یہ کتاب بیس (۲۰) جلدوں میں تمام ہوئی ہے حضرت حکیم الامت کو اس کتاب کی تکمیل سے بہت زیادہ مسرت ہوئی فرماتے تھے اگر خانقاہ امدادیہ میں اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوئی تو یہی کارنامہ اس کا اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی علامہ محمد زاہد کوثری مصری رح نے بھی اپنے بہتر تاثرات کا اظہار فرمایا ہے

(۷) فقہ السنن والآثار۔ مفتی سید عمیم الاحسان مجددی برکتی۔ اس کا تعارف برہان میں ہو چکا ہے

(۸) جامع الرضوی المعروف بہ صحیح البہاری۔ تقریباً ۶ جلدوں میں ہے۔

ج اول عقائد
ج ۲ طہارۃ وصلوٰۃ
ج ۳ زکوٰۃ وصوم وحج
ج ۴ کتاب النکاح تا وقف
ج ۵ کتاب البیوع تا غصب
ج ۶ کتاب الشفعہ تا فرائض

مؤلفہ مولانا ظفر الدین صاحب بہاری پروفیسر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ بانکی پور پٹنہ

(۹) تلخیص الاخبار۔ مولانا سید عبد الحئی ناظم ندوۃ العلماء م ۱۹۲۳ء

(۱۰) منتہی الافکار فی شرح تلخیص الاخبار۔ یہ تلخیص الاخبار کی عربی زبان میں شرح ہے۔

(۱۱) ترجمان السنۃ۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی۔ عنوانات بالکل جدید ہیں جس سے احادیث کے فوائد و نکات مستورہ منکشف ہو گئے ہیں

(۱۲) حدیث مظہری۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی شرح احادیث کا مجموعہ ہے یہ مجموعہ مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی (جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رح کے خلیفہ تھے) کے کتب خانہ میں ہے اور غالباً مولانا ہی کے دست مبارک کا یہ نسخہ ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی کسی زمانہ میں اس کی طباعت کی فکر میں تھا مگر معلوم نہیں کہ پھر کیا ہوا (حضرت قاضی صاحب کا زمانہ ۱۸۵۷ء سے قبل کا ہے لیکن ہم نے صرف تبرکاً شامل کر لیا ہے)

(۱۳) اشرف البیان لما فی علوم الحدیث و القرآن۔ مولانا حکیم الامۃ کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

بیسویں قسم مختلف کتابوں پر ۱۰ کتابیں

(۱) تحقیق اشارہ ما تقول فی ہذا الرجل
(۲) شرح اذا اقیمت الصلوۃ
(۳) تحقیق حدیث جابر بن سمرہ در باب رفع الیدین
(۴) توثیق عبادۃ بن الصامت در قراۃ فاتحہ خلف الامام

} شیخ الحدیث مولانا سید نذیر حسین صاحب عرف میاں صاحب رح دہلوی م ۱۹۲۰ء

(۵) ابکار المنن فی تنقید آثار السنن۔ مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوریؒ

(۶) معارف الاسماء شرح اسماء اللہ الحسنی۔ قاضی سلیمان صاحب منصورپوری

(۷) حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ۔ مولانا حکیم الامت تھانویؒ

اہل سلوک نے جن روایات و احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں اسی لئے اہل فن نے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا ہے۔ گو بعض محدثین نے ادھر توجہ

فرمائی اور کچھ کام بھی انجام دیا مگر حضرت حکیم الامتہ نے مستقل طور سے یہ خدمت انجام دی اور دو کتابیں تالیف فرمائیں۔ ایک یہی حقیقۃ الطریقہ من السنۃ الانیقہ جس میں ۳۲۰ احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا۔ دوسری کتاب

(۸) التعرف بمعرفۃ احادیث التصوف . . ہے اس میں ان احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آتی ہیں اور پھر اصول حدیث کی رو سے جس درجہ کی وہ حدیث ہے اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔

(۹) الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ۔ مولانا تھانویؒ اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا ہے

(۱۰) خطبات الاحکام۔ مولانا تھانویؒ جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا مجموعہ ہے جس میں احادیث و آثار روایات سے ترغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین ہیں۔

اکیسویں قسم اربعینات ۷ کتابیں

(۱) چہل حدیث۔ مولانا تھانویؒ اس میں صرف مسلم شریف کی حدیث معمر عن ہمام بن منبہ عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کیا گیا ہے۔ تمام احادیث کی سند ایک ہی ہے

(۲) اربعین۔ فرید الدین خاں کاکوروی م ۱۹۱۶ء

(۳) ترجمہ منظوم چہل حدیث۔ مولوی امان علی احمد آبادی م ۱۲۷۷ھ

(۴) اربعین من مرویات نعمان سید المجتہدین۔ مولانا محمد ادریس نگرامی م ۱۳۲۱ھ

(۵) چہل حدیث۔ خواجہ عبد الحیٔ صاحب فاروقی استاذ جامعہ ملیہ

(۶) جوامع الکلم چہل حدیث۔ مفتی مولانا محمد شفیع صاحب الدیوبندی

(۷) اربعین اعظم۔ قاضی عبد الصمد صارم

بائیسویں قسم اذکار ماثورہ پہ ایک کتاب	(۱) قربات عند اللہ و صلوات الرسول معروف (بہ مناجات مقبول) - مولانا حکیم الامت تھانوی
ذکر مافات من الکتب	(۱) نبراس الساری علی اطراف البخاری - مولانا عبد العزیز صاحب خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ

(۲) حاشیہ ترمذی شریف (ناتمام) - مولانا معین الدین اجمیریؒ م ۱۳۵۷ھ

یہ نامکمل فہرست اور منتشر خیالات ہیں۔ کام کرنے والے بہتر طور پر کام انجام دے سکتے ہیں ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے فقط والسلام

(**نوٹ**) اوپر کہیں حضرت حکیم الہند شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی عربی عبارت جو بخاری ج ۲ کے خاتمہ پر ہے۔ کا ترجمہ گذرا ہے اب اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

وکتبہ بیدہ الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم الودود، ولی اللہ احمد بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود عفی اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم والحقہ وایاھم باسلافہم الصالحین العمری نسبا الدھلوی وطنا الاشعری عقیدۃ الصوفی طریقۃ الحنفی عملا والحنفی الشافعی تدریسا خادم التفسیر والحدیث والفقہ والعربیۃ والکلام، ولہ فی کل ذلک تصانیف والحمد للہ اولا وآخرا ظاھرا وباطنا ذی الجلال والاکرام

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے، کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں، یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا۔ جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔

علم و فضیلت علم و علماء پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی، صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ - قیمت چار روپے آٹھ آنے - مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

منیجر ندوۃ المصنفین - اردو بازار - جامع مسجد - دہلی ۶

کلیات طالب آملی

از

جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی

ناظم کتاب خانۂ عالیہ رامپور

کتاب خانۂ رام پور میں طالب آملی متوفی سنہ ۱۰۳۵ھ کے دیوان کے د مخطوطے محفوظ ہیں۔ ان میں پہلا نسخہ کلیات کا ہے۔ اس میں ۱۶۴ ورق ہیں ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں۔ کتاب کا ناپ ۱۰¾×۷ اور کتابت کا ناپ ۷½×۳¾ ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق، کاغذ ولائتی، روشنائی سیاہ اور جدولیں شنگرفی ولاجوردی ہیں۔ کتاب کے حاشیے کرم خوردگی کے باعث بدل دیئے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں کرم خوردگی کے نشان ہیں، اور جگہ جگہ پیوند کاری بھی کی گئی ہے۔ جلد ابھی چند سال قبل تیار ہوئی ہے، اس لئے کتاب اچھی حالت میں ہے۔ کتاب میں طالب کا کل کلام موجود ہے۔ چنانچہ ورق اب سے ۱۰۵ الف تک قصائد ہیں۔ دوسرے تمام کلیات و دواوین کے برخلاف قصائد حروف تہجی پر مرتب ہیں، اور پہلے قصیدے کا مطلع ہے۔

عید بیضۂ وخت چہرہ باغ جہاں را آب زجوی بہار داد خزاں را

قصائد کی تعداد ۷۷ ہے۔

ورق ۱۰۵ الف کی چھٹی سطر سے ترکیب بند شروع ہوتے ہیں، جن کی تعداد ۹ ہے، اور ورق ۱۲۰ الف کی آخری دو سطروں سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی ورق کی آخری سے پہلی سطر سے قطعات کا آغاز اور ورق ۱۳۳ ب کی دوسری سطر پر اختتام ہے۔ قطعات کی تعداد ۳۷ ہے۔

ورق ۱۳۳ ب کی سطر ۳ سے مثنویاں شروع ہو کر ورق ۱۴۴ ب کی تیسری سطر پر ختم

ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعداد ۲ ہے۔

اسی ورق کی چوتھی سطر سے پھر قطعات شروع ہو کر اسی ورق کی بارھویں سطر پر ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ۴ ہے۔ غالباً یہ ترتیب کلیات کے بعد کہے گئے تھے، اسی لئے قطعات کے تحت جگہ نہ پا سکے۔ یہاں مثنویوں کے آخر میں گنجائش کے سبب سے بے جگہ درج کر دئے گئے ہیں۔

ورق ۵۴ ا ب سے ۳۷۰ ب تک اور پھر ۳۷۴ الف پر غزلیات ہیں، اور حسب دستور حروف تہجی پر مرتب ہیں۔ ان کی تعداد ۱۱۱۷ ہے۔

ورق ۳۷۱ الف تا ۳۷۳ ب اور پھر ۳۷۴ ب سے ۴۱۶ ب تک رباعیاں ہیں۔ یہ ۳۷۱ الف سے ۳۷۳ ب تک رُباعیوں کے ہونے کی وجہ مجلد کی غلطی ہے ورنہ ان اوراق کو ۳۷۴ کے بعد ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ رباعیاں بھی غزلوں کی طرح حروف تہجی پر مرتب ہیں، اور ۳۷۵ الف پر حرف التا کی رُباعیاں ہیں۔ جب کہ ورق ۳۷۳ ب کے آخر میں بھی حرف الباء کی رُباعیاں ختم ہو کر حرف التاء کی دو رُباعیاں مندرج نظر آتی ہیں۔

رباعیوں کی کل تعداد ۶۳۱ ہے۔ ایک رُباعی ورق ۳۷۴ الف پر آخری غزل سے قبل درج ہو گئی ہے، اس کو جوڑ لیا جائے، تو ان کی تعداد ۶۳۲ ہو جاتی ہے۔

غزلوں کے شمار کرتے وقت میں نے ایک ایک یا دو دو شعروں کو جو جدا گانہ لکھے گئے ہیں، پوری غزل فرض کر لیا ہے۔ اسی طرح دو تین رباعیوں کے صرف ایک ایک شعر ہی مندرج ہو پائے، دوسرے شعروں کو از راہ سہو کاتب نے چھوڑ دیا ہے مگر میں نے انھیں بھی پوری رُباعی فرض کر لیا ہے۔

ورق ۱ الف پر تین مہریں ہیں، پہلی ہمارے کتب خانے کی ۱۲۶۶ھ کی مہر ہے، یہ عہد نواب محمد سعید خاں بہادر کی یادگار ہے۔ اس کے نیچے تقریباً سوا انچ مربع مہر ہے، جس میں کندہ ہے "شمس الدولہ نجم الملک احمد قلی خاں بہادر صولت جنگ ۱۲۱۳ھ" یہ احمد قلی ممکن ہے کہ احمد علی ہو۔ مہر اس مرحلے پر صاف نہیں ہے۔ اس مہر کے نیچے چھوٹی مربع مہر میں منقوش ہے: "جلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر

شجاعت جنگ ۱۲۱۳ھ"

کتاب خانہ رام پور کی مہر کے اوپر لکھا ہے "دیدہ شد" نوزدہم ربیع الاول ۱۲۲۷ھ" اور اس کے اوپر ورقوں کا حساب اس طرح درج ہے۔

اماللعہ	ورق
نوشتہ بجدول	سفید
شنگرف ونیلی	
اماعہ ورق	عہ ورق

اب صرف ۱۶ا ورق باقی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سادہ ورق نئی تجلید کے وقت نکال دیے گئے ہیں۔

اس تحریر کے اوپر ترچھی شکل میں کسی نے اپنا نام لکھا تھا۔ اس کا صرف یہ حصہ باقی ہے۔ نام بری طرح چھیل ڈالا گیا۔

"من متملکات الراجی معفرت

الغفارنوازسہ

ممکن ہے کہ یہ نام نوازش خاں" ہو

کتاب کے آخری صفحے پر لکھا ہے جزوعہ۔ اور نیچے ان فارسی محاوروں کی تشریح درج ہے

(۱) طماغہ = کلاہ باشہ وباز

(۲) طاس چل کلید وطاس دعا نیز می نامند۔ طاسی درولایت درست با چل کلید می کنند وبجلیئے، کلید اسم اعظم کندہ می گذارند وقت مشکل آب برآں ریزند، آسان می شود۔

(۳) مُق، حصہ دہم کہ برائے می گذارند

(۴) طادس دار ورزشی است کہ سر را بزمین گذاشتہ پا بدیوار می نہند۔

(۵) طادس خیز، ورزشی است کہ پہلوانان ہر دو پائی پس وپیش جہانندہ جست وخیز می کنند

(۶) کلاغہ فنی است درکشتی کہ دست وپای حریف را گرد آوردہ بند کنند

(۷) گردنگاہ مقاطی است در صفاہان کہ آں مامن حرامیان است۔

(۸) گوش خوابانذن مرکب بمعنی جلد شدن۔

(۹) گوش خوابانیدن، سخن نشنیدن و نیز متوجہ نشدن بکاری۔

(۱۰) گنبد کردن، بمعنی تازہ کون دادن۔

(۱۱) گردش دکان، گرمی و رونق بازار

(۱۲) گوسفند انداز، فنی است کہ حریف را بر زمین می غلطانیند۔

(۱۳) گاذر دار، فنی است کنایہ از برداشتن حریف بدو دست و گرد سر گردانیدہ بر زمین کوفتن

(۱۴) موش دندان، پارچہ کہ خط سیاہ سفید دارد از اقسام الحہ؟

(۱۵) مدار بمعنی معاتبات؟

(۱۶) ماہی دست پیچ قسمی است از ماہی

(۱۷) محراب شکر پورہ دستہ قند سیت

(۱۸) مریخ زحل خور کنایہ از آتش و انکشت دان بود

(۱۹) میم کاتب، کور چشم

(۲۰) مو بر بستن، مستعد شدن

(۲۱) نان برشتہ طلبیدن، بخل و خست ورزیدن

(۲۲) نواخوانی کردن، نوارا خواندن۔ از طنز و تمسخر

اگرچہ یہاں غیر موزوں سا ہے، پھر بھی جی چاہتا ہے کہ ان محاورات کو کم از کم بہار عجم میں دیکھتے چلیں۔

(۱) اس کے متعلق حرف النار میں لکھا ہے "لضم و غین کلاہ شاہین و باز و امثال آں"

(۲) اس کے بارے میں لکھا ہے۔ "طاس چہل کلید و چل کلید، طاسی بود کہ بریک دستہ کلید ہای آہنی ادعیہ نقش کنند و برآں طاس نیز ادعیہ نقش کنند و برای حصول مرادات ادعیہ را

خوانده آب در طاس انداختہ بر سر خود دریزند- وبعضی دیگر گویند، نوعی است خاص از طاس کہ برشکلی ووضعی معین سازند"

(۳) اس لفظ کو میں درست نہیں پڑھ سکا ہوں، اس لئے بہار میں تلاش کرنے کے باوجود ناکام رہا-

(۴) اس کے متعلق لکھا ہے، طاؤس وار رفتن، نوعی از ورزش کشتی گیران کہ دوتہ گونہ شدہ خود را مثل طاؤس رقصاں نمایند وآں را در عرف ہند مورچال خوانند-

(۵) (۹) (۱۱) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۲۱) بہار میں نہ مل سکے- دوسرے لغات میں دیکھے جائیں-

(۶) اس کے بارے میں حرف الکاف میں لکھا ہے "کلات بالفتح ——— نام فنی از کشتی وتحقیق آں در بحث پابکلات کردن گذشت" حرف الباء الفارسی میں (جلد ا صنہ ۲۷) لکھا ہے "فنی است از کشتی کہ حریف را از کمر گرفتہ چناں بردارند کہ پایش بلند شود"

(۷) اس کی تشریح یوں کی ہے "بعضی گویند نام جائی از ایران در راہِ کعبۂ معظمہ- وبعضی گویند، راہی کہ بہ بلندی کوہ واقع شود وآں را گردنہ ہم خوانند- وایں اقوی است"

(۸) یہ محاورہ بہار میں موجود ہے- اور مرزا صائب کا یہ شعر بھی تمثیل میں پیش کیا ہے-

بخاموشی زمکرِ دشمنِ بدرگ مشو ایمن ۔۔۔ چو توسن گوش خوابانَد لگد با در قفا دارد

مگر اس محاورے کے معنی نہیں بتائے ہیں-

ہمارے کتاب خانے میں بہار عجم کا وہ نسخہ (ناقص الاول والآخر) موجود ہے، جس پر خان آرزو متوفی ۱۱۶۹ھ نے بہار کے لئے ہدایات لکھی تھیں- یہ نسخہ بڑا نادر اور قیمتی ہے- اس میں گلوش خوابانَدن اور اس کی مثال کے درمیان میں بیاض ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس جگہ سوچ بچار کے بعد کچھ لکھنے والا تھا مگر قبل تکمیل مرگیا-

(۱۰) اس کے بارے میں لکھا ہے "در مرد گران امرد" میں اس تشریح کے الفاظ کی تہ تک

نہ پہنچ سکا۔ غالباً ان کا مطلب بھی وہی ہوگا جو اوپر نمبر (۱۰) کا لکھا جا چکا ہے۔

(۱۲) اس کی تشریح اس طرح لکھی ہے "فنی از کشتی کہ چوں حریف را بجنگ بزمین نموا زند یک دست پس گردنش و دست دیگر میان ہر دو شاخش بند کردہ از جا بردارند و باز بزمینش می زنند"

(۱۳) گاذرواد کے متعلق لکھا ہے کہ "نام فنی از کشتی"

(۱۴) اس کے بارے میں لکھا ہے۔ "سنجاف یا قیطونی کہ فاصلہ میان خطہائش پیدا باشد وآں را در عرف ہند لہریا گویند"

(۱۹) اس کے بارے میں لکھا ہے "کنایہ از نابینا و کور

(۲۰) اس کے متعلق تحریر ہے کہ "کنایہ از آمادہ و تہیا شدن برائے رفتن"

(۲۲) اس کے متعلق لکھا ہے کہ "چوں کسے از راہ تحقیر در حرف زدن تقلید کسی می کند، می گویند: نوامی اوامی آرد و با و نوامی خواند، یعنی طعن و طنز و استہزا می کند"

بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس نسخے کے ورق ۱۰ اب ۱۳ اب، ۱۵ الف، ۷۰ الف، ۹۱ الف و ب، ۹۲ ب، ۹۳ الف و ب، ۹۴ الف و ب کے حاشیوں پر مصحح نے ان اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ جو کاتب نے از راہ سہو چھوڑ دئے تھے۔ ان میں ایک پورا قصیدہ حرف الواو کا شامل ہے، جو مصحح نے اپنے قلم سے حاشیہ پر لکھا ہے۔

مصحح پختہ خط کا مالک ہے۔ اس نے متن میں مکرر الفاظ و اشعار پر خطِ نسخ بھی کھینچا ہے، اور حسب ذیل اشعار میں الفاظ کا رد و بدل بھی کیا ہے۔

(۱) ورق ۲۲ ب

از باد گرم حملۂ او در سپاہ خصم   جوہر ز تیغ، نہ گوہر از افسر فرو چکد

مصحح نے از باد گرم کو قلم زد کر کے اس کے اوپر لکھا ہے: "سیماب ساں ز حملۂ او"

غالباً کاتب نے اوپر کے شعر کے الفاظ "از باد گرم" کو قدرے تغیر کے ساتھ دہرا دیا تھا۔

(۲) ورق ۲۵ ب:

صبح دولت اعتماد الدولہ کز روی خرد	روی بتواں دید در پیشانیش آئینہ وار

اس شعر کے پہلے مصرع میں "روی خرد" کو نورِ خرد" میں تبدیل کیا ہے، جو غالباً اگلے مصرع کے "روی" سے پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) ورق ۲۶ ب

آری آری، دولتی داری چناں ثابت قدم

اس مصرع کے لفظ "داری" کو کاٹ کر "باشد" بنادیا ہے۔

(۴) ورق ۲۸ ب

در کفش اگر بپائے گل پائے بنفشری	آں برگ یاسمیں کشد البتہ زخم خار

دوسرے مصرع کے "البتہ کی جگہ "آسیب" بنایا ہے۔

(۵) ورق ۳۵ الف

صبح دولت اعتماد الدولہ کز تاب عقل	میزند سرپنجہ با آئینۂ بدر منیر

پہلے مصرع کے "عقل" کو "طبع" بنایا ہے۔

(۶) ۳۸ ب

ہمت دریاکشان جرعہ نیارد بچشم	ہاں، قدح لطف یار دایم سرشار باش

دوسرے مصرع کے "لطف" کو کاٹ کر "یار" کے بعد "را" بڑھا دیا ہے۔

(۷) ۴۳ ب

خورشید نگار خانۂ اوست	با طرۂ صبح بوی شبرنگ

اس کے پہلے مصرع کو بنایا ہے:"خوابست نگار خانۂ او"

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کاتب کی غلطیوں کی اصلاح مصحح نے بڑی توجہ سے کی ہے پھر بھی کچھ نہ کچھ چھوٹی موٹی خطی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔

آخر میں یہ عرض کردوں کہ بحیثیت مجموعی نسخہ اچھا اور غالباً بارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے

(۲)

دوسرا نسخہ بھی کلیات کا ہے۔ مگر بہت ناقص ہے۔ اس میں ۱۴۰ ورق ہیں، اور ہر صفحے میں ۱۴ سطریں ہیں۔ کاغذ ولایتی، روشنائی سیاہ، اور خط قدرے اچھا نستعلیق ہے۔ جدولیں لاجوردی، شنگرفی، سیاہ اور زرد ہیں۔ پورا نسخہ کرم خوردہ اور پیوند کار ہے۔ کتاب کا ناپ ۷، ۲ء۵ اور کتابت کا ناپ ۶×۳ ۱/۴ ہے پوری کتاب کا پشتہ نئی تجلید کے وقت بدل دیا گیا ہے۔

سر ورق پر نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور کے قلم کی ۲۰ محرم ۱۲۷۳ھ کی تحریر ملکیت ثبت ہے۔ ورق اب سے غزلیں شروع ہوتی ہیں، لیکن پہلے ہی ورق کے بعد ایک یا ۲ ورق کم ہیں ورق ۸ کے بعد غزلیں اچانک ختم ہو جاتی ہیں، حالانکہ ابھی ردیف التا رچل رہی ہے، اور اگلے صفحے پر ایک قصیدہ درمیان سے جاری نظر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کے بہت سے ورق ضائع ہو گئے ہیں۔

ورق ۱۹ الف سے قصائد شروع ہو کر ورق ۱۰۲ الف کی چھٹی سطر پر ختم ہو جاتے ہیں اس نسخے میں قصائد کی ترتیب حروف تہجی پر نہیں ہے۔ ورق ۲۰ ب اور ۹۰ ب کے بعد کچھ اوراق کم ہیں، جس کے باعث کچھ قصیدے ناقص الآخرہ گئے ہیں۔

ورق ۱۰۲ الف کی ساتویں سطر سے قطعات شروع ہوئے ہیں، اور ورق ۱۱۹ ب پر ختم ہو گئے ہیں ورق ۱۱۹ ب کی گیارہویں سطر سے ترکیب بند شروع ہو کر ورق ۱۳۴ الف پر ختم ہوتے ہیں ورق ۱۳۴ ب سے مثنوی شروع ہو کر آخر تک چلی گئی ہے۔ اس نسخے میں بھی کتابت کی غلطیاں نظر آتی ہیں

(۳)

تیسرے نسخے میں صرف قصائد ہیں۔ اس میں ۵۷ ورق ہیں، ہر صفحے میں ۱۹ سطریں ہیں کاغذ معمولی دیسی، روشنائی سیاہ اور پوری کتاب بے جدول کی ہے۔ کرم خوردگی اور پیوند کاری بھی موجود ہے، پشتہ نیا ہے۔

ورق ۱ الف پر دو پرانی مہریں اور ایک تحریر ہے۔ مگر یہ سب پڑھنے میں نہیں آتیں ایک مہر

کا سنہ ۱۰۰۵ھ پڑھا جاتا ہے اور نواب کلب علی خاں بہادر والیٔ رام پور کی تحریر مورخہ ۱۲۷۰ھ بھی پڑھنے میں آتی ہے۔

اس نسخے میں ۴۶ قصیدے ہیں جن میں کتابت کی غلطیاں بہت نظر آتی ہیں چنانچہ قصیدے ۷، اور ۸ کے درمیان کے کچھ اشعار رہ گئے ہیں، اور کاتب نے دونوں قصیدوں کو اس طرح ملا کر لکھ دیا ہے جیسے کہ یہ دونوں ایک ہوں۔ ورق ۵۶ ب کے بعد کچھ ورق ضائع بھی ہو چکے ہیں۔

(۴)

یہ نسخہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۷۹ ورق ہیں، ہر صفحے میں ۱۷ سطریں ہیں۔ کتابت سیاہ اور بے جدول ہے تخلص اور لفظ "ولی" شنگرف سے لکھا ہے۔ خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے کاغذ دیسی ہے پشتہ نیا ڈالا گیا ہے۔

کتاب کا ناپ تقریباً ۸×۵ ۱/۴، اور کتابت کا ناپ ۵ ۱/۲ × ۳ ہے۔ کتاب میں کرم خوردگی، پیوندکاری اور آب رسیدگی نظر آتی ہے جلد نئی ہے۔

(۵)

اس نسخے میں علاوہ قصائد کے اور اصنافِ کلام موجود ہیں۔ اس کے اوراق کی تعداد ۴۷ ہے سطریں فی صفحہ ۱۴، روشنائی سیاہ، خط نستعلیق معمولی اور کاغذ دیسی ہے، کچھ غزلوں کے آغاز میں منہ نور قبرہ یا منہ نور قلبہ یا منہ شرح صدرہ شنگرفی سے لکھا گیا ہے۔ مگر جلد ہی اس رسم خیر کو چھوڑ دیا ہے، کتاب کے آخری اوراق زیادہ کرم خوردہ اور پیوند کار ہیں۔

نسخے کا آغاز مثنوی سے ہوتا ہے، جو ا ب سے ۷ ب تک پائی جاتی ہے مجلد نے اس کا آخری ورق نسخے کے آخر میں چسپاں کر دیا ہے۔ جس سے بظاہر مثنوی نامکمل معلوم ہوتی ہے۔

ورق ۸ الف سے غزلیں شروع ہوتی ہیں، اور ۴۴ الف پر ختم ہو جاتی ہیں چونکہ ۸ الف پر ردیف التار کی غزل درمیان سے شروع ہو گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلیات کی ردیف الف و ب کی پوری غزلیں اور ردیف التاء کی کچھ غزلیں اوراق کے ساتھ ضائع ہو گئی ہیں۔

ورق ۴۸ ب سے ترکیب بند شروع اور ورق ۵۰ الف پر ختم ہوتے ہیں۔

ورق ۵۰ ب سے رباعیاں شروع ہوتی ہیں، اور ۷۳ ب پر اچانک ختم ہو جاتی ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کچھ اوراق آخر کے بھی کم ہیں۔

کتابت کی غلطیاں اس نسخے میں بھی ہیں۔

ادبیات

غزل

(جناب الم مظفرنگری)

ابھی لے آؤں رقصِ بے خودی میں بزمِ امکاں کو
مغنی تو کہے تو چھیڑ دوں سازِ رگِ جاں کو

نہیں کچھ ڈر حوادث کا دلِ جرأت بداماں کو
یہ ساحل جذب کر لیتا ہے ہر اک موجِ طوفاں کو

محبت یوں کبھی اعجاز دکھلاتی ہے انساں کو
بنا دیتی ہے طوفاں موج کو ذرہ بیاباں کو

وہ ہو تعمیر یا تخریب ان دونوں کے پردے میں
مرتب کر رہا ہے کوئی ذراتِ پریشاں کو

اسی سے تو ہوا حاصل تجھے عرفانِ آزادی
تو کیا سمجھے ہوئے تھا بے خبر تکلیفِ زنداں کو

قفس کی نیند میں سیرِ چمن کا لطف حاصل ہے
خموشی دے رہی ہے وسعتیں خوابِ گلستاں کو

وہی دیوانہ ہے مطلب شناسِ معنی وحشت
جو دامن سے ملا دے وقت پر چاکِ گریباں کو

اثر جوشِ نمو کا جب ہوا کرتا ہے بے پردہ
ہوائیں خود بدل دیتی ہیں تقدیرِ گلستاں کو

یہ خاکستر یہ ٹوٹے بال و پر ہیں رونقِ محفل
یوں ہی رہنے دو پروانوں کے اجزائے پریشاں کو

مسلسل جن سے کیف آگیں رہی راتیں جوانی کی
کہاں سے ڈھونڈ کر اب لاؤں اس خوابِ پریشاں کو

غنیمت ہے دم اس وحشی کا جس نے خوں کے چھینٹوں سے
بنا رکھا ہے تاریخِ جنوں دیوارِ زنداں کو

بہاروں کی خوشی خوفِ خزاں کب تک چمن والو!
بدل ڈالو نظامِ انقلاباتِ گلستاں کو

لرزتا ہوں کسی کی جرأتِ انکارِ سجدہ پر
میں ہوں معذور اگر سجدہ کروں تصویرِ جاناں کو

انھیں تکلیفِ جلوہ دی مرے ذوقِ تماشا نے
وہ خود تسلیم کرتے ہیں مرے کارِ نمایاں کو

وہ جلوہ کیوں گریزاں ہے مرے دل سے جو ہستی میں
کہیں گل کو نوازے اور کہیں نجمِ درخشاں کو

میں جب نالہ کروں زنجیرِ پا خاموش ہو جائے
اسے ملحوظ رکھنا چاہیے آدابِ زنداں کو

الم جوشِ خودی میں اپنی ہستی کو کرے سجدہ
اگر انسان دیکھے غور سے ترکیبِ انساں کو

غزل

از

(جناب برج لال جگی رعنا)

خاص آتے ہیں عام آتے ہیں — اس گلی میں تمام آتے ہیں

یوں چٹکتی ہیں باغ میں کلیاں — جیسے ان کے پیام آتے ہیں

دل میں ہے صرف ایک تیرا نام — لب پہ گو لاکھ نام آتے ہیں

یہ گھٹائیں نہیں فرشتوں کے — مے کشوں کو سلام آتے ہیں

دوستوں سے نہ دشمنی کیجے — وقت پر دوست کام آتے ہیں

حُسن کو کیا خبر محبت میں — کتنے نازک مقام آتے ہیں

فصلِ گل ہے کہ فصلِ مے نوشی — پھُول کھلتے ہیں جام آتے ہیں

ذرّے اس بزمِ رشکِ خاور سے — بن کے ماہِ تمام آتے ہیں

نقش فانی بھی عشق کے ہاتھوں — بن کے نقشِ دوام آتے ہیں

عشق کی بارگاہ میں آقا — بن کے ادنیٰ غلام آتے ہیں

ہیں جو پیرِ مغاں کے خاص مرید — ان کے حصے میں جام آتے ہیں

بے زبانی زبان بنتی ہے — عشق میں وہ مقام آتے ہیں

ڈھل کے سانچے میں شعر کے رعنا
مئے کوثر کے جام آتے ہیں

شئون علمیہ

جراثیم کے لئے دودھ اور شراب

طبی تحقیق کے لئے جراثیم اور حشرات کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ۱۹۵۲ء میں ایسی ۵۴۷ درخواستیں وصول ہوئیں ۔ اس لئے لندن کی نیشنل فزیکل لیبوریٹری نے اس جدید طلب کی رسد کا بندوبست کیا ہے ۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جراثیم کو اگر پہلے منجمد کردیا جائے پھر ان کو نابیدہ کردیا جائے یعنی ان کا پانی نکال دیا جائے تو ۲ برس تک ان کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے ۔ پھر ان کو اگر زندہ کرنا ہو تو ان کو ایک خاص قسم کی غذا دے کر زندہ کیا جاسکتا ہے ۔

ٹڈنگٹن میں جہاں یہ تجربہ خانہ قایم ہے کوئی ۶۰۰ قسم کے جراثیم "زیر پرورش" رہتے ہیں ان کو ۱۴ قسم کی مختلف غذائیں دی جاتی ہیں ۔ ان میں دودھ، گلوکوس، ٹماٹر، گاجر، سویابین اور بیئر شراب شامل ہیں ۔

توانائی کے مخزن

پروفیسر فریڈرک ژولیو کیوری مشہور فرانسیسی سائنس داں ہیں جن کو حال ہی میں عالمی وفاق کارکنان سائنس (ورلڈ فیڈریشن آف سائنٹفک ورکرس) نے بحیثیت صدر منتخب کیا ہے ۔ توانائی کا مسئلہ پروفیسر موصوف کے لئے خاص موضوع ہے ۔

توانائی کے خزانے کوئلہ، تیل، آبشار اور ہوا سے حاصل ہوتے رہے ہیں ۔ ایک نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ جوہری مرکزے کی غیر مستعملہ توانائی پر انسان کی دسترس ہوگئی چنانچہ حساب لگایا گیا ہے کہ ۳۰۰۰ ٹن کوئلہ سے جتنی توانائی حاصل ہوتی ہے وہ یورینیم کے ا کلوگرام دھتو سیسہ اسیر اسے حاصل ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر فرانس جیسے ملک کو لیا جائے اور وہاں ۲۰ طاقت گاہیں قایم کردی جائیں جن میں یورینیم استعمال کیا جائے اور جن میں سے ہر ایک میں ۲۰۰۰۰۰ کلوواٹ کی گنجائش ہو تو ملک بھر کی ساری برقی ضروریات سال بھر تک پوری ہوسکتی ہیں ۔ لطف یہ ہے کہ بند

۲۰ طاقت گاہوں میں جتنا یورینیم استعمال کیا جائے گا وہ مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بار کیا جاسکتا ہے۔

اب اس کا بھی امکان ہے کہ سورج سے جو توانائی ہم کو پہنچتی ہے اس کو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ہم کام میں لائیں۔ پودوں کے سبز مادے میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سورج کی ان شعاعوں میں کتنی توانائی پوشیدہ ہے۔

ہم توانائی حاصل کرنے کے لئے لکڑی جلاتے ہیں ہم اور دوسرے جاندار سبزی کھاتے ہیں جس کی پرورش سورج کرتا ہے۔ اس غذا کو جاندار عضلاتی توانائی میں تبدیل کر لیتے ہیں لیکن ہم اس کو ضیا تالیفی (فوٹوسنتھیٹک) طریقہ پر بھی کام میں لا سکتے ہیں۔

لیکن پروفیسر کیوری کو یہ دھن ہے کہ زمین کی کاشت میں اس توانائی سے کام لیا جائے اگر ہم کسی اراضی کی پیداوار کو بڑھا سکیں تو اس سے ہم کو نئی اراضی درختوں کی کاشت کے لئے حاصل ہو سکے گی۔ یہ درخت غذائی طور پر نہ استعمال کئے جائیں تو صنعتی طور پر کام میں لائے جاسکتے ہیں جس کے لئے خاص خاص کیمیاوی عملوں کی ضرورت ہوگی۔ سورج کی شعاعوں اور ہوا کے کاربوہائیڈریٹ کی مدد سے یہ درخت اتنی توانائی مہیا کردیں گے جو ہم کسی دوسری طرح نہیں حاصل کر سکتے۔

پس سائنس دانوں کو ان ہی خطوط پر کام کرنا چاہئے تاکہ دنیا کی مرفہ حالی میں اضافہ ہو۔

تبصرے

تذکرۃ الاعزاز

از مولوی سید محمد انظر شاہ تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر۔ ضخامت ایک سو بارہ صفحات قیمت مجلد عہ/ پتہ:۔ شاہ منزل دیوبند ضلع سہارنپور

حضرت الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی دار العلوم دیوبند کے ان اکابر اساتذہ میں سے ہیں جن کے وجود کو دار العلوم کی موجودہ علمی وتعلیمی شہرت میں بہت بڑا دخل ہے۔ علم وفضل اسلامی اور عربی علوم وفنون میں وسعت نظر اور مہارت کے ساتھ بلند پایہ اخلاق وفضائل۔ اوقات اور معمولات درس کی حیرت انگیز پابندی۔ طلباء کے ساتھ غیر معمولی شفقت اور خلوص۔ درس وتدریس اور مطالعہ میں حد درجہ مصروفیت اور انہماک۔ ضابطہ پسندی نظم وآئین کی پابندی۔ سادگی اور بے نفسی۔ یہ وہ اوصاف وکمالات ہیں۔ جن کے اجتماع نے مولانا کو ایک مثالی اور لائق تقلید استاد بنا دیا ہے۔ دار العلوم دیوبند سے موصوف کا تعلق دیرینہ ہے اور اب تک ہزاروں علماء آپ کے چشمۂ فیض وتوجہ سے سیراب ہو کر شاد کام وبامراد ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ مولانا کا تذکرہ لکھا جائے۔ تاکہ اسی راہ کے دوسرے مسافروں کے لئے ایک مینارۂ روشنی کا کام کرے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کی طرف مولانا کے ہی ایک نوجوان شاگرد نے جو مولانا کے اور ہم سب کے استاد زادہ بھی ہیں توجہ کی اور حضرت موصوف کا یہ تذکرہ لکھ کر پیش کیا۔ یہ کتاب نوجوان مصنف کا پہلا قلمی نقش ہے۔ تاہم معلومات کی حسن ترتیب اور زبان وبیان کی برجستگی کہہ رہی ہے کہ اگر ان کا علمی ذوق وانہماک یکسوئی کے ساتھ دار العلوم دیوبند کے ماحول میں اسی طرح پروان چڑھتا رہا تو وہ ایک دن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جسمانی فرزندی کی نسبت وشرف رکھنے کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی الولد سرٌ لابیہ کا مصداق ثابت ہوں گے خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ حضرت الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب سے شرف تلمذ رکھنے والوں کے علاوہ دوسرے حضرات کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔

جواہرِ رسالت — از جناب ابو تمکین افتخار احمد صاحب۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۲۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- المطبوعات ۱۸/۱۴ بہار کالونی۔ کلٹین روڈ کراچی پاکستان ۵

قرآن مجید اگر متن ہے تو احادیث اس کی شرح وہ اگر اصول کا بیان ہے تو اقوال و اعمالِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس کی جزئیاتی تفصیل و توضیح اس بنا پر آج کل انکارِ حدیث کا جو عام فتنہ بپا ہے اس کے انسداد کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ قرآن مجید کی آیات کے ساتھ ساتھ ان احادیثِ صحیحہ کو بھی بیان کیا جائے جن سے احادیث کی مذکورۂ بالا حیثیت صاف طور پر روشن ہو جائے لائق مرتب نے اسی ضرورت کے پیش نظر مختلف اخلاقی اور روحانی عنوانات کے ماتحت پہلے ان سے متعلق قرآن مجید کی آیات اور پھر انھیں کے مناسب احادیث صحیحہ مع ان کے ماخذ کے حوالہ کے نقل کی ہیں۔ اور ان احادیث کا اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد ان پر تشریحی نوٹ بھی لکھے ہیں، نواب احسن یار جنگ نے اپنے والد ماجد نواب وقار نواز جنگ بہادر کی کتاب تبویب القرآن کے تتبع میں کسی ایک مضمون سے متعلق قرآن مجید کی آیات کو یکجا کرنے کے ساتھ اسی مضمون سے متعلق صحیح بخاری کی احادیث کو بھی جمع کرنے کا اہتمام کیا تھا مگر اس سلسلہ کی اب تک صرف ایک جلد "التبویب للقرآن والجامع المسند الصحیح" کے نام سے شائع ہوئی ہے، ضرورت ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات سے متعلق اسی طرح کی احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے۔ یہ کام نہایت وسیع اور فرصت طلب ہے زیرِ تبصرہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اسی نہج پر مرتب کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور جو اس کا مقصد ترتیب ہے اس میں کامیاب ہوگی

دلی کالج اردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء — مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی شریکِ ترتیب گوپی چند نارنگ متعلم ایم۔ اے۔ کتابت، طباعت متوسط، صفحات ۲۰۰ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ قیمت درج نہیں،

خواجہ احمد صاحب فاروقی کا شمار اس وقت ملک کے بلند پایہ سبک گام ادیبوں میں ہوتا ہے، ادیب محقق کم ہوتے ہیں، خواجہ صاحب ادیب بھی ہیں اور محقق بھی، جہاں تک دہلی کا تعلق ہے بزمِ اردو ان دنوں ان کی نواسنجیوں سے معمور ہے جس کا تازہ ثبوت ان کی جدید مہتم بالشان تالیف "میر تقی میر" ہے جس کو

انجمن ترقی اردو نے بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے۔

دلی کالج اردو میگزین کا یہ خاص نمبر آپ ہی کی خوئے کاوش و تحقیق سے وجود میں آیا ہے "اینگلو عربک کالج دہلی" اس تاریخی شہر کا ایک تاریخی ادارہ ہے جس نے کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک اردو اور فارسی کی سرپرستی کی ہے زیر نظر نمبر اسی کالج کی معلومات افزا اور دلچسپ سرگذشت ہے جس کو بڑی قابلیت اور محنت سے ترتیب دیا گیا ہے، پورا نمبر پڑھ کر اس "عبرت آموز" ادارہ کی تاریخ کا ایک ایک گوشہ سامنے آجاتا ہے پیغامات اور شذرات کے علاوہ کم و بیش ۳۲ مضمون ہیں ہر مضمون کالج کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

امام بخش صہبائی، مولوی ضیاء الدین خاں، خواجہ حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چند، لالہ پیارے لال آشوب، ڈاکٹر اسپرنگر وغیرہ کے متعلق بہت سی جدید معلومات اس تقریب سے بہم پہنچ گئی ہیں، وقت کی قلت کی وجہ سے ترتیب میں جو کوتاہی اور خامی رہ گئی ہے اس کا اعتراف فاضل مرتب نے بڑی خندہ پیشانی سے خود ہی کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی انسانی کوشش کو بہر رنگ مکمل کہا ہی نہیں جا سکتا۔

مجموعی حیثیت سے یہ نمبر نہایت مفید اور نادر تاریخی معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے، جسے ارباب ذوق کو ایک گراں قدر تحفہ سمجھکر حاصل کرنا چاہیئے۔ (ع)

پھول کا سالنامہ

مدیر جناب ضیاء دہلوی پتہ:- ماہنامہ پھول، پھول منزل دہلی ۶
قیمت سالانہ تین رپے، صرف سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ۔

حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص مفتی ضیاء الحق صاحب ضیاء دہلوی نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں چھوٹے بچوں اور بچیوں کی تربیت و اصلاح کے ارادے سے یہ پرچہ جاری کیا تھا، مسلمان گھرانوں کی عام فضا اور ماحول کو دیکھ کر "پھول" جیسے سیدھے سادھے، بے تصویر رسالے کی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی لیکن جناب ضیاء صاحب اور ان کے قلمی معاون صبر و ہمت سے اپنے ارادے پر جمے رہے اور اس طرح وہ نہ صرف "پھول" کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے

بلکہ انھوں نے سال کے ختم پر اس کا ایک صاف، ستھرا، دل پسند اور ضخیم سالنامہ بھی شائع کر دیا۔ "پھول" کی عام اشاعتوں کے صفحات ۴۸ ہوتے ہیں، سالنامے کے صفحات ۱۴۴ ہیں، شروع کے ۱۷ صفحوں میں دہلی اور بیرون دہلی کے بہت سے فوٹو دئے گئے ہیں جن میں خانہ کعبہ، روضۂ اطہر اور آنحضرتؐ کے نامۂ مبارک سے لے کر، پیر مٹکے شاہ کی قبر، برلا مندر اور گاندھی جی کی سمادھی تک کے فوٹو شامل ہیں۔

پورا نمبر سلیقے اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور بچوں اور بچیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔ "اصلاحی باتیں" "گردشِ ایام" "لوہے کی چپل" "۴۲۰" "ہوشیار چور" "مزدور شہزادہ" خاص طور پر دلچسپ اور سبق آموز ہیں، مذہبی مضمونوں میں "میرا ایمان" بھی بچوں کے دل و دماغ پر اثر کرنے والا مضمون ہے۔ نثر کے ساتھ جا بجا نظم کی چاشنی بھی موجود ہے، بچوں کے مشہور و مقبول شاعر تیرؔ "پھول" کے خاص شاعر معلوم ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اور ان کے گھرانے کی نظموں سے "پھول" کی رونق اور تازگی بڑھ گئی ہے۔

بہت سی اچھائیوں کے ساتھ بعض کوتاہیوں اور خامیوں پر بھی نظر پڑی جو رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی۔ مجموعی حیثیت سے "پھول" حوصلہ افزائی کا مستحق ہے اور ہم اس کی اعانت اور سرپرستی کی سفارش کرتے ہیں۔

(ع)

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء۔ نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا